رمضان مبارک

کراچی

# سچی کہانیاں

July 2015







ریحام خان

اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

☆ ایم اے راحت اور کاشی چوہان کے تہلکہ خیز ناول

# ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا





مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان/دانیال شمسی

| | |
|---|---|
| MEMBER | |
| APNS | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی |
| CPNE | رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز |

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زمان

انکم ٹیکس ایڈوائزرز
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

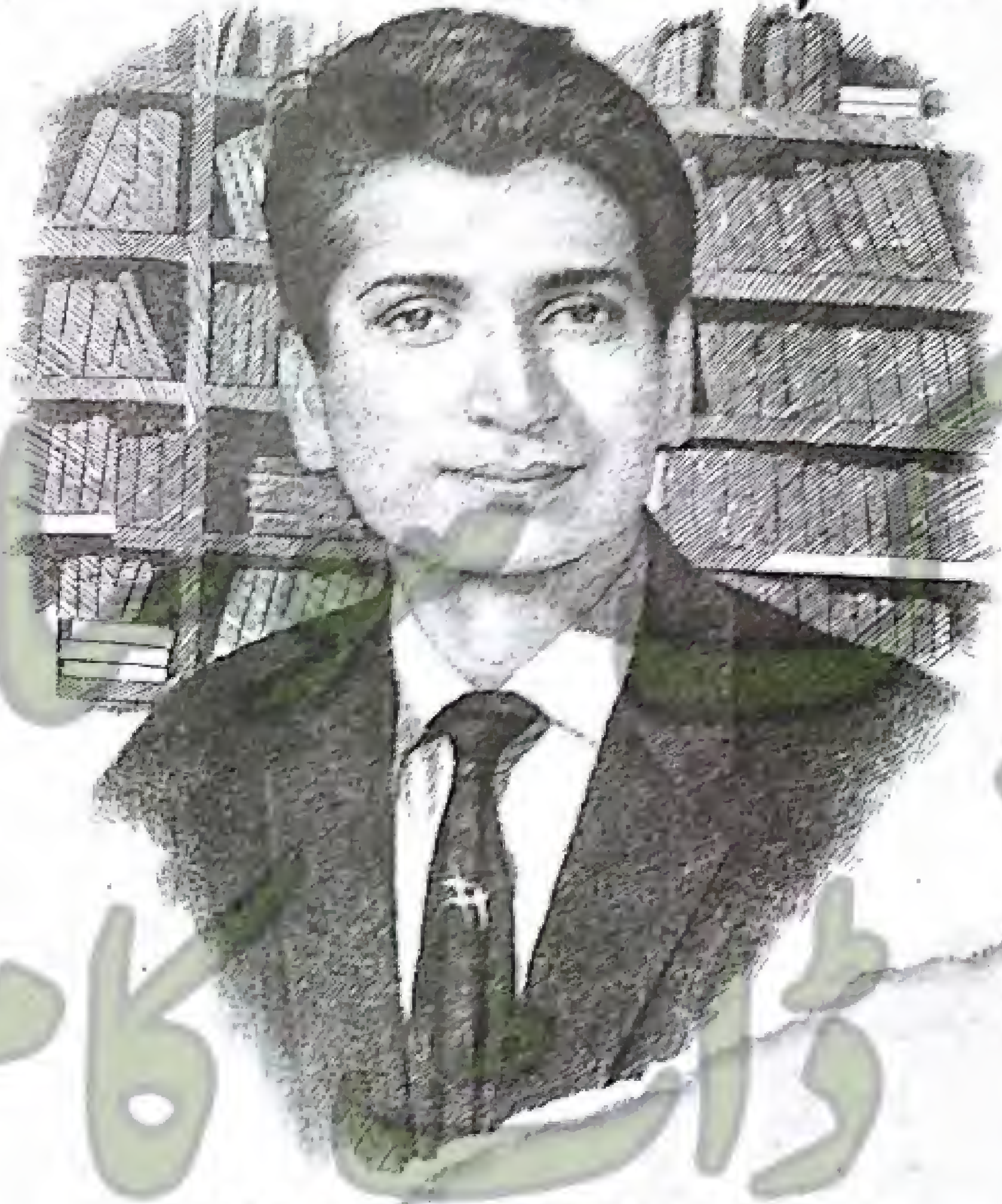
قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✲ جلد: 32 - شمارہ: 07 ✲ جولائی: 2015ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون:021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7 تالپور روڈ، کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

# ہم نہیں بھولے......



1932ء......2002ء

یہ رنگ رنگ کہانی ، یہ حرف حرف فسوں
تمہارے عزم کو ہم سب سلام کرتے ہیں



## ''جنت''

ایک بار پھر ہمیں برکتوں والا مہینہ نصیب ہو رہا ہے۔ ربّ العزت ہمیں موقعہ دے رہا ہے کہ ہم اپنی غلطیوں اور خامیوں پر دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوں اور انہیں نہ دہرانے کا عزم کریں اور ہم اللہ کے حضور گڑگڑا کر معافی کے طلب گار ہو جائیں۔ بے شک وہ تمام جہانوں کا مالک اور بخشنے والا ہے۔ ہمیں اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہونا چاہیے کہ بے شمار کوتاہیوں کے باوجود وہ ہمیں ماہِ صیام جیسے بابرکت ماہ سے نواز رہا ہے۔ ہمیں موقعے پر موقعہ دے رہا ہے کہ ہم اپنے گناہوں سے سچے دل سے توبہ کر لیں ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ روزِ حشر بہت قریب ہے اور اپنے ہر عمل کا ہمیں جواب دینا ہوگا...... جواب طلبی اس جہان کا رب کرے گا پھر کوئی مکاری اور چالاکی کام نہ آئے گی لہٰذا مکاری اور چالاکی جیسی قبیح عادات سے زندگی میں ہی جان چھڑا لینی چاہیے کیونکہ بعد از موت یہ کسی کام کی نہیں......

صبر اور برداشت وہ عادات ہیں جن کی بدولت دنیا میں بھی جنت اور جنت تو جنت ہے ہی...... اللہ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق دے اور ہمارے روزے قبول فرمائے۔ آمین۔

منزہ سہام

# دنیا میں کس جگہ

# سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

**پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ**

**ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II** فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: **021-35893121-35893122**
ای میل : **pearlpublications@hotmail.com**

# احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!
لیجیے ماہِ صیام آ گیا۔ عید بھی دبے پاؤں آ جائے گی۔ کبھی غور کریں، خدا نے تو ہمیں تمام نعمتیں، تمام خوشیاں اُسی طرح عطا کی ہیں جس طرح ہم سے پہلی قوموں کو عطا کی تھیں مگر ہم کیوں اُس کی صرف ایک بات نہیں مانتے۔

''وہ کہتا ہے کہ ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرو۔''

کیا پتا یہی 'میانہ روی' اسمِ اعظم ہو۔ اگر ہم اسے اختیار کرلیں تو ہم بھی دیو دار جتنے قد کی طرح ہو جائیں۔ شیشم کے پتوں کی سریلی سیٹیاں ہمیں بھی بہت آگے کے پوشیدہ دفینے بتانے لگیں۔ ہمارے جسم پر گھدے نام یکلخت ابھر آئیں اور جنت کا راستہ بن جائیں۔ ساتھیو!

میانہ روی...... صرف اس لفظ کو اپنالیں۔ اپنی زندگی سہل بنالیں۔ وعدہ کریں، اس لفظ کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں گے نا۔

آیئے دیکھتے ہیں احوال میں ہمارے ساتھ سب سے پہلے کون ہے۔ بہاول نگر سے یہ پہلی پہلی آمد ہے محمد ابو ہریرہ بلوچ کی لکھتے ہیں۔ آپ کے اس خوبصورت پرچے سچی کہانیاں سے متعارف کروانے والے ہمارے محمد ندیم عباس میوانی ہیں۔ آپ کا پرچہ ہر طرح سے زبردست پایا۔ اور اب پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں اُمید کرتا ہوں ویلکم کیا جائے گا۔ پرچے کے لیے اچھی کہانیوں کو سلیکٹ کرنا' نامناسب کہانیوں کو ریجیکٹ کرنا، خطوط کے جوابات دینا اور وقت پر پرچہ قارئین تک پہنچانا یہ سب اتنے آسان کام نہیں ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ یہ کام بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ کسی بھی رسالے کی عمدگی کا پتا اس پر کیے گئے تبصروں سے ہوتا ہے اور آپ کے اس پرچے میں تو ماشاءاللہ تبصروں کے انبار لگے ہوئے ہیں ہر تبصرہ اس قدر جامع اور دلچسپ ہوتا ہے کہ پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ آپ نے جو بیسٹ کہانی اور بیسٹ شعر پر انعامات کا

سلسلہ شروع کیا ہے کمال ہے کیونکہ اس سے ہر نئے لکھنے والے کے اندر مزید لکھنے کا شوق بڑھتا ہے کہ اس کی جیت اس بار نہیں تو اگلی بار ضرور ہوگی اور اس طرح آخر وہ چچ مچ ونر بن جاتا ہے۔ اب ذرا بات ہو جائے مئی 2015ء کے پرچے کی جناب سب سے پہلے احوال میں حاضری ہوئی۔ سب خطوط لاجواب تھے۔ خاص کر شاہد رفیق سہو صاحب کا۔ وہ تو شاید مجھے جانتے ہوں گے۔ کہانیوں میں اس بار سب سے بیسٹ اسٹوری کاشی چوہان صاحب کی زہر عشق قسط 3 رہی۔ بھائی زبردست لکھا خدا آپ کی عمر دراز فرمائے اور مزید لکھتے رہنے کا حوصلہ بھی۔ اس کے بعد دستگیر شہزاد صاحب کی گرد صحرا ہوں بس دوسرے نمبر پر اور ارم ناز صاحبہ کی کاوش کچرا سارا میرا ہے تیسرے نمبر پر رہی۔ جاوید راہی کی کس جرم کی، میں بھلا کون ہوں سائرہ فاطمہ، معجزے اب بھی، عروج فاطمہ بھی منفرد کہانیاں تھیں۔ باقی ابھی پڑھی نہیں اس لیے تبصرہ ادھار، اشعار بھی عمدہ تھے۔ کاشی بھائی اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو جلد کوئی کہانی لے کر حاضر ہوں گا۔ اگلے ماہ تک کے لیے دیجیے اجازت رسالے کی ترقی کے لیے دعا گو۔

☆ ابو ہریرہ! خوش آمدید تبصرے کے لیے ممنون ہوں اور ندیم کا بھی، پرچہ آپ کو پسند آیا ہماری محنت وصول ہوئی، خوش رہو۔

✉ پاکستان کی نامور لکھاری ماہا ملک پہلی بار احوال کو منور کر رہی ہیں، لکھتی ہیں السلام علیکم! جناب کاشی چوہان صاحب، آپ کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں۔ میرا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے تیس پینتیس بکس کی رائٹر ہوں اور تقریباً تمام ہی ڈائجسٹوں سے وابستہ ہوں۔ آج آپ کی بزم میں اپنے فلمی بیٹوں ندیم عباس ڈھکو، ایم وکیل عامر جٹ، افضل آزاد، آصف جاوید زاہد، منظور اکبر تبسم کے اصرار پر لکھ رہی ہوں۔ اس امید پر کہ ویلکم کیا جائے گا۔ انشاء اللہ حاضری دیتی رہوں گی۔ اور سب سے میری گزارش ہے کہ بلا مقصد لکھیں اور نئے رائٹرز کو بھی ساتھ لے کر چلیں دعاؤں میں یاد رکھنا۔

☆ پیاری آپا! آپ کی آمد نے احوال میں چار نہیں ہزار چاند لگا دیے۔ ماہا جی! خدا سے آپ کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا ہے۔ امید ہے جلد ہی آپ کی تحریر بھی ہمارے مان میں اضافہ کرے گی۔

✉ گلابوں کی نگری، پتوکی سے یہ آمد ہے ندیم عباس میواتی کی لکھتے ہیں قارئین کو میواتی جی کی طرف سے محبت بھرا اسلام۔ براہ کرم قبول فرمائیں گرمی کافی حد تک بڑھ چکی ہے۔ یہ لوڈ شیڈنگ توبہ توبہ ارے یاد آیا ساتھ ایگزام بھی...... وہ بھی مئی میں...... اسماعیل میرٹھی نے خوب کیا۔ آ گیا مئی کا مہینہ، بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ، ننھی سی جان پر ظلم ہی ظلم ہو رہا ہے۔ یہ سچی کہانیاں سے محبت ہی ہے کہ کل میرا پیپر ہے مگر پھر بھی خط لکھ رہا ہوں۔ خیر چھوڑ دو جی آتے ہیں مئی کے شمارے کی طرف۔ بھائی کاشی چوہان جی مزاج گرامی کیسے ہیں۔ مجھ پر آپ تو ظلم نہ کرو۔ آپ کی قینچی میرے خط پر ہی کیوں چلتی ہے۔ زہر عشق ٹاپ پر جا رہی ہے۔ وری گڈ۔ ننھے لکھاری شاہد رفیق مٹی کی ایک حسینہ کس کی یاد دلا رہی ہے۔ یہ بھی امتحان لے رہی ہے۔ ڈیئر سسٹر سدرہ انور علی ویلکم کرنے پر وری وری تھینکس، ڈیئر برادر فیصل ندیم بھٹی مور شاہد حسین مجید احمد جائی تھینک یو۔ میں آپ سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مسز نوید ہاشمی سدرہ انور علی ثمینہ فرخ جاوید راہی منشی محمد عزیز، ایم یعقوب، مناہل زہرہ مور شاہد حسین سب کے تبصرے بہت جامع اور دلچسپ تھے۔ نیز احوال کی محفل کی چمک دمک بہت ہی پیاری لگتی ہے خاص طور پر جب بگ رائٹرز نیو لکھاریوں کو حوصلہ دیتے نظر آتے ہیں۔ بھائی یاسر وکی دیپالپور جی جنگل میں شیر اکیلا ہی ہوتا ہے۔ کہانی صرف ایک ہی پڑھ پایا۔ گرد صحرا ہوں بس دستگیر جی اصل قصور وار شوہر تھا کیونکہ وہ ایک تو اپنی ذمہ داری سے غافل رہا۔ پھر اجنبی کو گھر میں جگہ دی

# خواتین کی محبوب قلم کار

## 'رفعت سراج' کا تازہ ترین شاہکار 'دامِ دل'

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔
معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

**''ایمن'' ایک ایسی بہو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لمحہ ساس، سسر کے طنز اور تشنوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔**

## تازہ ترین قسط سے کچھ لائنیں

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیے ہم پر۔'' فردوس کی بڑبڑاہٹ زہر کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

''ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔'' حامد حسین نے لقمہ دیا۔

''پ......پ...... پندرہ لاکھ......'' فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہوا اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

''ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟'' وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

''آس رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔'' حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمن کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمن کو پاؤں اٹھانا دوبھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں کے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔''

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

**'دامِ دل' ہر ماہ دوشیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔**

شاید کوئی ایک انسان ہی کہانی سے عبرت حاصل کر لے تو مقصد پورا ہو جائے گا۔ میری طرف سے تمام قارئین کو سلام رب راکھا۔

☆ پیارے ندیم! دیکھو ہم نے قینچی تھوڑی سی دور کر دی۔ اب تو خوش ہو نا۔

✉ ڈیرہ غازی خان سے ایم یعقوب رقم طراز ہیں چھوٹے سے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوا ہوں سوری کاشی جی پچھلی غلطی چھوٹا تبصرہ یاد آیا جس سے آپ کو مزا نہیں آیا۔ اب آئے گا۔ سب سے پہلے منزہ سہام اور کاشی بھائی سلام قبول ہو۔ مجھے مئی کا ڈائجسٹ ملا تو سب سے پہلے اپنی پیاس کا احساس ہوا میں بھی کراچی میں شفٹ ہوں واقعی۔ احوال میں سب دوست تھے۔ بھائی راشد لطیف صبرے والا، شاہد رفیق، واہ ممتاز بھائی کیا تبصرہ کیا ہے۔ مجھے بھی سکھاؤ، کاشی جی ناراض ہیں گڈ۔ سدرہ انور علی یہ کیا بات ہوئی شکریہ نہیں کہتے آج پھر سے میدان مار لیا بہت اچھا تبصرہ کیا۔ حافظ ندیم' مور شاہد' منعم اصغر' نوید ہاشمی' ندیم عباس ڈھکو' عظمیٰ شکور آپ سب کا میری کہانی پر تبصرہ کرنے کے لیے شکریہ۔ اسماء اعوان' ریحانہ منعم' گڈی آپا جی' قیصر شاہد گڈ' صبا اقبال' میری دلہن تم ہو عظیم الدین انصاری بار بار نایاب دوسرا ووٹ' افتخار بھٹی بڑے ابا' عمر دراز عظمیٰ شکور' ندیا مسعود' ثانیہ بھٹی' میڈل آف لو ممتاز احمد، شمع حفیظ' حمیرا خان' اُم عادل اور میرے دل کو موہ لینے والے حضرت جاوید راہی کاشی چوہان ایم اے راحت' منشی محمد عزیز' مئے محمود شام جی جتنی بھی تعریف کر دی کم ہے کیونکہ قلم میں تازگی خوش مزاج شخصیت کا جلوہ میٹھی باتیں دل کو لفظوں کی خوش نما تازگی بخشتی ہے اور گل احمد چورنگی پر تیسری منزل کی چھت پر سمندر کی لہروں کا جنون بخشتا سہانا موسم، پوری دنیا کی سیر کروا دیتا ہے۔ جی کاشی جی اب کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

☆ اچھے یعقوب! خوش رہو۔ تم نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی مگر کیا کریں یہ لال قلم اپنے جادو جگانے سے باز نہیں آتا۔ اُمید ہے برا نہیں مناؤ گے۔

✉ چشتیاں سے ہمارے ننھے ساتھی علی حسنین تابش عرض گزار ہیں۔ اُمید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ لکھتے ہوئے الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ آنکھیں پُرنم ہیں اور دل بہت غمگین ہے۔ ایسی کنڈیشن ہی ہوگی ناں جب وہ پیارے اس دنیا سے رخصت ہو جائیں جن کے بغیر اک پل بھی گزارنا ناممکن ہو۔ جن کی دعاؤں کے بغیر انسان کچھ نہ کر سکے۔ جن کے سایہ شفقت سے ہی انسان کامیاب ہوا اور اچانک ہی جب وہ عظیم ہستیاں بچھڑ جائیں تو شاید ہی کوئی اس صدمے کو برداشت کر پائے۔ اس دنیا میں خداوند کریم نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ جس کا ہم جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ لیکن میرے خیال سے والدین اللہ جل شانہ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور جب سر سے سائبان ہی اُٹھ جائے تو پیچھے کیا باقی بچے گا؟ لکھتے وقت میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اِک ایسا صدمہ جسے میں عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔ ہر اک کو اپنے والدین سے محبت ہوتی ہے لیکن میں کہوں گا کہ میرے والد ہی بہت اچھے تھے۔ مجھے ہی ان سے بہت محبت تھی۔ لیکن کاشی بھائی ٹھیک ہی کہا تھا آپ نے یہ دنیا ہے اور اس کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ زندگی جو غم، جو دکھ دیتی ہے اس کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑتا ہے اور شاید خداوند کریم کی رضا میں راضی رہنا پڑتا ہے۔ پیارے قارئین اور میرے سب دوستو اور کاشی بھائی جان میرے لیے دعا کرنا کہ خداوند کریم مجھے اس صدمے کو برداشت کرنے اور صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین اور میرے والد صاحب کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ کاشی بھائی میں آپ سے معذرت کرتا ہوں کہ پریشانی اور مصروفیت کی وجہ سے احوال میں شریک نہ ہو سکا۔ آپ کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ اللہ پاک آپ کو اور کامیابی عطا فرمائے آمین۔ پرچے میں دن بدن خوبصورتی اور نکھار آ رہا ہے کاشی بھائی میری طرف سے

## سانحہ ارتحال

ہماری مستقل قاری یاسمین جو بحرین میں مقیم تھیں۔ قضائے الٰہی سے گزشتہ ماہ انتقال فرما گئیں۔ اس موقع پر ہم مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتے ہیں اور قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

مبارک باد قبول ہو۔ اب کے لیے اتنا ہی زندگی رہی تو پھر سے شامل احوال ہوں گا جاتے جاتے اک شعر لکھوں گا۔

فراق یاراں ہوا نصیب تابش
شبستاں سی ہوگئی زندگی اپنی

☆اچھے حسنین! اللہ پاک تمہیں اور تمہاری فیملی کو اس صدمے کو سہنے کی طاقت عطا کرے۔ اپنا خیال رکھو۔ تم اب بڑے ہو اور گھر بھر کا سہارا بھی۔ سہارا جتنا صبر والا ہوگا اتنا ہی مضبوط ہوگا۔ ہم تمہارے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔ ہماری پوری سچی کہانیاں فیملی تمہارے ساتھ ہے۔

✉ سدرہ انور علی' جھنگ صدر سے احوال کی رونق میں اضافہ کر رہی ہیں لکھتی ہیں۔ 27 تاریخ کو جون کا پرچہ آیا۔ ہاتھوں میں آیا دل میں سمایا' آنکھوں سے لگایا۔ مگر بہت سے ساتھیوں کو احوال میں نہ پایا۔ کنول عمران' نصرت سرفراز' شائستہ جمال' ملکہ احوال تحسین جونیجو' ثمینہ ناز آنٹی' فیصل ندیم اشفاق شاہین' اشفاق بٹ غائب ہونے میں آپ سب نے بجلی کو بھی مات دے دی۔ ادھر ایک ہم ہیں لوڈشیڈنگ کی طرح ہر بار آدھمکتے ہیں۔ زرینہ جونیجو ڈیئر آپا جان 8 جولائی کو Happy Birth Day To U So Much۔ خدا کرے آپ کی زندگی میں یہ دن ہزاروں بار آئے آمین۔ احوال میں سب نے اچھا لکھا۔ منزہ سہام کا اداریہ' چلو بھر پانی' منزہ آنٹی کے اداریے میرا خون جلاتے ہیں۔ منشی محمد عزیز بھیا آپ بڑے ہیں معافی مانگ کر ہمیں ہماری نظروں میں نہ گرائیں۔ اتنی وضاحت کی کیا ضرورت تھی؟ سعید گلاب احمد بھیا محمد اسماعیل بروہی السلام وعلیکم کیسے ہو آپ؟ محمد کاشف جی ہم ٹھیک ہیں آپ کیسے ہیں؟ شاہد رفیق جی ویری تھینکس تحریریں پسند کرنے کا۔ مجید احمد بھیا کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔ منعم اصغر' مور شاہد حسین کیسے ہو بھیا؟ جواد احمد' سنبل ناہید' نگین افضل' راشد لطیف' اے آر راحیلہ' چوہدری پرویز' فلک زاہد' افتخار بھٹی' سلیمان شبیر' ندیم عباس' ایم ایچ کاشف' عارف تبسم' عابد انجم' عقیل عادل زادہ' یاسر ولی' ثروت شاہین' ہاہ تھک گئی ہوں ماشاء اللہ کافی نئے احوالی محفل میں آئے ہیں۔ خوش آمدید سب کو آیئے آیئے جناب ذرا پرانے احوالیوں سے آنکھیں ملاؤ اور زندہ و جاوید ہو جاؤ۔ اسماء اعوان' لائف بوائے' ڈیلڈین' ریحانہ نسیم کی' قائد میں شرمندہ ہوں۔ باندھ لیں' تقدیر نے لوٹا ہے مجھے' زبردست تھی۔ قیصر شاہد کی ساتھی' ساتھ نبھانا رے' بہترین کہانی تھی۔ صبا اقبال کی عشق نے پامال کیا' اچھی لگی۔ نجمہ جبیں کی تم میری ہو' تصور میں خود کو پہاڑوں سے گرا کر دیکھا تو کانپ کر رہ گئے۔ عظیم الدین کی' میرے برادر کی دلہن' چمن اعوان کی گلاب لمحے بکھر گئے ہیں۔ بابر نایاب کی کنارا مل گیا مجھ کو' دوسرا دوٹ' ساجن کی کہانی بہت شاندار کہانیاں لگیں۔ توشہ خاص میں محمد عزیز بھیا کی یہ آگ کب بجھے گی' فرح انیس کی ہم کب سوچیں گے' محمد اسماعیل کی بڑے ابا' مسز سلیم کی عمر دراز چپ کا کفن' عشق بے پروا' میرا کالا ہے دلدار' اپنے عنوان کے لحاظ سے بہترین کہانیاں تھیں۔ مغرب سے موصولہ سجاد بابر کی میڈل آف لو زبردست تھی۔ شعلہ ساماں تحریریں اقبال بانو کی مقدمہ خون کا' تاریخ خود کو ضرور دہراتی ہے۔ صدف آصف کی بے بی روم' قطرہ قطرہ پگھلا ہوں' نسیم سحر کی' ایک تھی رابعہ' جاوید راہی کی لمحوں

کی بھول ماہ جون کی فرسٹ کلاس کہانیاں تھیں۔ تین مرد تین کہانیاں بہترین تھیں۔ کاشی بھیا کی زہر عشق سارا کا سارا رگوں میں اُتر گیا، عجب اُلجھ گیا۔ عشق کے پھندے میں سلمان ابراہیم اِدھر صنوبر کی چاہت اُدھر دشمن سلمان کریم، ویلڈن کاشی بھیا۔ اللہ آپ کو اور اچھا لکھنے کی توفیق دے آمین۔ ہائیڈ پارک میں مرزا مبشر بیگ اور ملکہ احوال تحسین جونیجو کے انتخاب پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ تیر نم کش میں تمام شاعری پسند آئی۔ تمام پڑھنے والوں کو رمضان مبارک کاشی بھیا میری شاعری شائع کرنے کا شکریہ۔

☆ چھوٹی سی گڑیا! آفت کی پڑیا۔ کیا کمال تبصرہ کیا تم نے۔ جُگ جُگ جیو۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔

✉ احوال میں بہاولپور سے عثمان بلوچ کی پہلی پہلی آمد ہے لکھتے ہیں۔ مدح سرائی کی ایک قسم 'بتکلف مدح سرائی' ہوتی ہے جس کے اندر محض مبالغہ آرائی اور زبانی کلامی تعریف ہوتی ہے۔ جبکہ صدقِ دل سے مدح جو باعث ثواب ہے وہ حقیقت حال پر مطلع ہو کر زبان و دل کو یکجا کر کے تعریف کرتا ہے۔ میں جو آپ کے رسالے کی تعریف میں چند کلمات کو سپردِ قرطاس کرنے لگا ہوں وہ محض مبالغہ آرائی نہیں بلکہ اس تعریف کرنے میں زبان و دل یکجا ہیں۔ آپ کا رسالہ 'سچی کہانیاں' بلند معیار کا حامل اور اردو ادب کا بہترین شاہکار ہے۔ لفظ و حروف کے مزاج شناس رائٹر اس مہکتے گلشن کی رونق ہیں۔ آپ جیسے صاحب نظر افراد کی سرپرستی نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ میرا تعلق بہاولپور شہر سے ہے۔ بھائی ندیم عباس میواتی کی وساطت سے اس رسالے میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ محترم کاشی چوہان صاحب آپ کی خدمت میں کچھ ٹوٹے پھوٹے' بے ربط الفاظ کو مالا میں پرو کر کہانی کی شکل میں بھیج رہا ہوں۔ جناب سے اُمید ہے خوب حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور اس روشن سفر میں میرے دست و بازو بنیں گے۔

☆ پیارے عثمان! خوش آمدید، تمہاری اردو دانی نے متاثر کیا۔ اب آ گئے ہو تو اِس گلستاں کے مہکتے پھول بن کر ہر ماہ تازگی بخشنا' کہانی پڑھ کر جلد رائے دیں گے خوش رہو۔

✉ یہ آمد ہے ڈی جی خان سے ہماری بہت پیاری لکھاری اور قاری ساتھی ارم خان کی۔ ارم اس وقت بڑے کڑے تیوروں سے ہم سے مخاطب ہیں لکھتی ہیں کاشی بھیا اور محفل احوال کیسے ہیں آپ لوگ' ایک بار پھر کئی ماہ کے وقفے کے بعد اس محفل میں آئی ہوں لیکن ہاں آپ سب کے خط ہر ماہ پڑھتی رہی ہوں۔ ویسے میری غیر موجودگی میں مجال ہے جو چند لوگوں کے سوا مجھ ناچیز کو یاد کیا ہو کسی نے۔ خیر مئی کے شمارے میں بھائی ایم یعقوب' ڈیرہ غازی خان والے نے مجھے یاد رکھا۔ منعم اصغر' ڈیرہ غازی خان والے نے بھی سوال کیا کہ میں ہر ماہ کیوں نہیں آتی۔ تو بھیا جی آپ کے سوال کا جواب یہ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ہمارے شہر میں شمارہ کتنا لیٹ ملتا ہے (آپ سالانہ خریدار بن جائیں۔ یہ شکایت دور ہو جائے گی!) پھر بندہ ہر ماہ کیسے آئے احوال میں۔ اور پھر ایک وجہ بھی ہے کہ سچی کہانیاں نے مجھے کافی مایوس کیا ہے۔ کاشی بھیا آپ انصاف کریں۔ مجھے کہانیاں بھیجے ہوئے کتنا وقت گزر چکا ہے میں نے جب بھی کوئی سوال کیا۔ آپ میرا جواب ٹال گئے۔ کبھی مجھے کہا جلد میری کہانیوں کو جگہ ملے گی۔ کبھی کہا اگلے ماہ فائنل جواب ملے گا۔ مگر افسوس کہ آپ کی کہی بات ایک بھی پوری نہیں ہوئی اور پھر جب میں نے کہا کہ میری کہانیاں شاید ردی کی ٹوکری کھا گئی ہے تو آپ نے کہا نہیں وہ آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ تو بھیا جی بتائیں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک بندے کو مسلسل انتظار میں لٹکا یا جائے۔ اب میں اپنی کہانیاں ایک نئے انداز میں لکھ کر پھر ایک بار آپ کو بھیجوں گی اور وہ بھی لاسٹ بار' اگر پھر بھی یہی حال رہا تو پھر کبھی کوئی کہانی بھیجنے کی جسارت نہیں کروں گی۔

☆ ارے ارے...... ارم! ذرا سا حوصلہ اور...... یقین کرو تمہاری کہانیوں پر اتنی محنت ہو رہی ہے کہ میں

تین پرچے نکال لوں۔ صرف وجہ ہے محبت' مجھے اپنی پیاری سی بہن سے سچ میں بہت محبت ہے۔ اپنا خیال رکھو گڑیا! بہت جلد صبر کا پھل ملنے والا ہے۔

✉ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے پاکپتن شریف سے شہزاد کی لکھتے ہیں میں پہلی بار حاضری دینے چلا آیا۔ ایم یعقوب ڈیرہ غازی خان کی محبت پیار کی دعوت قبول فرمائی اور اُسی وقت اپریل کا شمارہ لیا۔ پڑھا، جو پڑھتے ہی دل کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ پچھلے ماہ حاضری نہیں دے پایا مصروفیت زیادہ تھی۔ سوری کاشی صاحب اب ہر ماہ حاضری دوں گا۔ جب جون کا شمارہ لیا تو مجھے نئی دنیا ملی جس سے میں بے خبر اور انجان تھا۔ کسی چیز کا وہم و خیال نہ تھا۔ سب دوست اچھے اچھے تبصروں کے ساتھ قطار در قطار تھے۔ میں بھی اس بھیڑ میں اپنے ذہن کو تازہ کرنے چلا آیا۔ اب یہ کاشی بھائی اب آپ کی مرضی جو چاہیں کریں۔ میرے لیے آپ سچی کہانیاں اور آپ کا پیار ہی کافی ہے جو مجھے ہر قدم پر یاد رہے گا۔ آپ کے تعاون سے آگے چلنے کی امید باندھی ہے۔ احوالیوں کو سب کو سلام۔ اور سب رائٹرز نے خوب لکھا۔ زہر عشق، ہم شکل ایم اے راحت' جاوید راہی' عظمیٰ شکور' صبا اقبال' سجاد بابر' اسماء اعوان' شمع حفیظ اور سب لوگوں نے بہت ہی اچھا لکھا۔ اللہ پاک آپ سب کو یونہی لفظوں کی تازگی سے نوازتا رہے اور آپ سب یوں ہی دلوں پر راج کرتے رہیں۔ مجھے اب اجازت دیں۔

☆ شہزاد! خوش آمدید، مگر تبصرہ کیا ہوا بھائی؟

✉ ٹمن آباد' لاہور سے یہ احوال کی زینت بن رہا ہے ہماری بہت اچھی قاری ساتھی ناز یہ جہانگیر کا تبصرہ، لکھتی ہیں۔ سچی کہانیاں زبردست جا رہا ہے۔ اپریل اور مئی کا شمارہ میں نے ایک ہفتے میں تھوڑا بہت پڑھ لیا اسی لیے احوال میں حاضر ہوں۔ معافی چاہتی ہوں کہ میں 3 ماہ سے غیر حاضر رہی، وجہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان کو نظر لگ گئی ہے۔ اسی لیے ہر سال فوتگی ہو رہی ہے۔ اللہ آگے خیر لائے اور جو فوت ہو گئے ہیں انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ مئی کا ڈائجسٹ زبردست ہے۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی ہے مگر کہانیاں اور نئے سلسلے بہت اچھے ہیں تین مردار اور نئے سلسلے زہر عشق' ہائیڈ پارک' اور سچے واقعات بہت اچھے سلسلے ہیں۔ ناگن اچھا ہے اپنے انجام کو پہنچا۔ ہم شکل اچھا جا رہا ہے مگر تھوڑی کنفیوژن ہو رہی ہے۔ کہانیوں میں، میں بھلا کون ہوں سائرہ فاطمہ، پھر اسارا میرا ہے ارم ناز کی، تھری جی محمد یوسف لغاری کی بہت اچھی تحریریں تھیں۔ میں نے کہانیاں بھیجیں مگر ایک نہیں چھپی، شاید ہم میں کچھ کمی ہے، لکھاری رسالے میں میرے فیورٹ ہیں مگر کچھ واقعی تعریف کے قابل ہیں جن میں محمد سلیم اختر' ارم ناز' عادل حسین' جاوید راہی' رضوانہ کوثر' اسماء اعوان اور سدرہ شامل ہیں۔ ٹائٹل اپریل کا زبردست ہے اور کہانیاں بھی، چونکہ دونوں پرچے ایک ساتھ ملے ہیں اس لیے دونوں پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ 16 دسمبر سانحہ پشاور کے بارے میں بہت اچھا لگا۔ ایک زبردست احوال تھا۔ واقعی دلوں کو رُلاتی یادیں ہی ہیں۔ منزہ سہام مرزا کا بڑا دہشت گرد کون پڑھ کر واقعی احساس ہو گیا تھا بلکہ شرمندگی ہو رہی تھی آگے دونوں کے احوال یعنی اپریل اور مئی کے پڑھ کر مزا آیا۔ اب رمضان کی آمد ہے۔ اللہ کرے یہ رمضان اور عید پاکستان کے لیے خوشیاں ہی خوشیاں لائے اور بچھڑوں کو اُن کے اپنوں کو صبر عطا کرے رمضان المبارک کے لیے اچھا سا تحفہ لے کر آئیں رسالے میں کیونکہ اس مہینے میں توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں کافی عرصے بعد انٹری کی ہے اس لیے لمبا خط ہو گیا ہے۔ کوئی غلطی کوتاہی کے لیے معافی اور آپ سب کے لیے دعا کہ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ پیاری بہن! سلامت رہیے۔ کہانی نہ لگنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ جتنا آپ کا تبصرہ ہے اتنی ہی کہانی ہوتی ہے۔ جو کہ شروع ہونے سے پہلے ہی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ اُمید ہے ہماری بات کو سمجھ کر آپ اپنی

آئندہ کہانی لکھیں گی۔

✉ چیچہ وطنی سے عبدالغفار عابد رقم طراز ہیں۔ حسب معمول سب سے پہلے ذکر باجی منزہ کے اداریے 'چلو بھر پانی' کا ہی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت وطن عزیز کے لوگوں کے لیے سب سے اہم مسئلہ صاف پانی کا ہی ہے خاص کر کراچی کے لوگوں کے لیے' اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عوام کے بنیادی مسائل کا حل ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ محترم ممتاز احمد کی تحریر لحون کی بھول ان لوگوں کے لیے سبق آموز تحریر تھی جو اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی زندگی کو انجوائے کرتے ہیں۔ ریحانہ نسیم کی تحریر قائد میں شرمندہ ہوں بہت جاندار تحریر تھی۔ میرے خیال میں ہم سب کو شرمندہ ہونا چاہیے۔ گڈی آپا اپنی تحریر میں تقدیر سے شکوہ کرتی نظر آئی۔ منشی عزیز مے کی تحریر یہ آگ کب بجھے گی بہت غور طلب تحریر تھیں۔ دہشت گردی کی آگ نے ہماری خوشیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے۔ عظمیٰ شکور کی تحریر 'چپ کا کفن' بہت مختصر تحریر تھی مگر اس کا مرکزی خیال بہت واضح تھا۔ کنارا مل گیا مجھ کو یہ تحریر تھی بابر نایاب کی جن لوگوں کی سوچ کا پہلو مثبت ہوتا ہے وہ اپنی منزل پالیتے ہیں۔ کاشی بھیا کی سلسلے وار کہانی زہر عشق پورے رسالے کی جان ہے۔ باقی تمام تحریر بھی تبصرے کے قابل تھیں مگر اب تھوڑا ذکر احوال کا بھی ہو جائے احوال میں تقریباً کل 37 لوگ حاضر تھے ان میں 10 پہلی بار اس محفل میں شامل ہوئے یہ کاشی بھائی کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کاشی بھیا آپ کی سچی کہانیاں کو ابھی بہت ضرورت ہے۔ محترم عبدالعزیز جی آ! اسلام آباد میں آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میں سچی کہانیاں کی محفل میں واپس آؤں گا۔ وعدہ وفا کرنے والے بہت عظیم ہوتے ہیں۔ سسٹر سدرہ، آپ کا خط تو احوال کی جان ہوتا ہے اللہ آپ کو سلامت رکھے آمین۔ بھائی مور شاہد مان بڑھانے کا شکریہ۔ باجی نوید ہاشمی حوصلہ افزائی پر آپ کا ممنون ہوں۔ سنبل ناہید' اے آر راحیلہ' فلک زاہد' سلیمان شبیر' ندیم عباس ڈھکو' عارف تبسم' عابد علی انجم' تگین افضل' عقیل عادل اور چوہدری پرویز آپ بھی کو اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ باجی ام جلال' مانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیات بہت ہیں۔ باجی اپنوں کے لیے کچھ وقت نکالنا پڑتا ہے اور اس محفل میں آپ کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ ایم یعقوب' ممتاز احمد' منشی عزیز مے' مجید جائی' صائمہ بشیر' عظمیٰ شکور اور دوسرے تمام احوالی دوستوں کا بہت مشکور ہوں کہ آپ ہر ماہ ملاقات کے لیے اس محفل میں آتے رہتے ہیں۔ عزیز ساتھیو! دلوں میں وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو خیر بانٹتے ہیں۔ آسانیاں پیدا کرتے ہیں اور محبتیں تقسیم کرتے ہیں رب کائنات سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو خیر بانٹنے آسانیاں پیدا کرنے اور محبتیں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے آمین۔

☆ غفار عابد! ہمیشہ محبتیں بانٹنے والے محبتوں کا خراج بھی ادا کرتے ہیں۔ آپ کا تبصرہ پسند آیا اگلے ماہ کے تبصرے کا انتظار ہم نے ابھی سے شروع کر دیا ہے۔

✉ ملک راشد، رحیم یار خان سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ مئی کے شمارے پر کچھ تبصرہ حاضر ہے۔ منزہ سہام بالکل جی ایسا ہی ہے۔ ہم نے ووٹ دے کر اپنی قسمت پر بہت ظلم کیا ہے۔ ہماری دعائیں آخر رنگ لے آئیں۔ رخسانہ سہام مرزا کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ سب کی کہانیاں زبردست تھیں۔ اقبال بانو' صدف آصف' محمود شام' ممتاز احمد' ام عادل' حمیرا خان' احمد سجاد بابر' عظمیٰ شکور' ندیا مسعود، ثانیہ بھٹی' اسماء اعوان' ریحانہ نسیم' گڈی آپا جی' قیصر شاہد' عظیم الدین' چمن اعوان' افتخار بھٹی' عمر دراز فرح انیس' محمد اسماعیل بروہی' شمع حفیظ' آپ کی اسٹوریز بہت اچھی اور پیاری تھیں اور جنہوں نے میرے دل میں گھر بنالیا وہ زہر عشق' جاوید راہی' ایم اے راحت' منشی محمد عزیز مے جی' نسیم سحر' صبا اقبال خوب بہت ہی

اچھا جن کی تعریف مجھ سے لفظوں میں بیان نہیں ہوتی۔ میری دعا ہے سب کو اللہ خوش رکھے اور بہت ہی خوشیاں دے اور ہائیڈ پارک 'تیر نیم کش' مسئلہ یہ ہے، بہت ہی اچھے کالم ہیں۔

☆ پیارے راشد! خوش رہو، ہم آپ کی دعاؤں میں ہیں، اس سے بڑھ کر ہمارے لیے اور کیا اعزاز ہوگا۔ دوست 'دوست ہوتا ہے دلوں کے رابطے شخصی ملاقات سے ماورا ہوتے ہیں۔ تبصرے کا شکریہ۔

✉ صادق آباد سے ہمارے محمد خالد شاہان کی سواری احوال میں اُتر رہی ہے۔ لکھتے ہیں میں نے وعدے کے مطابق دوسری اسٹوری بھیج دی ہے (کون سا والا وعدہ؟) آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ پہلے کی طرح میری اس اسٹوری کی نوک پلک سنوار کر پُراسرار نمبر پر ضرور شائع کریں گے (آہم ......) اور میری حوصلہ افزائی بھی کریں گے۔ (کیوں امتحان لیتے ہو) چوہان صاحب میں آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری سوچ سے بھی بڑھ کر حوصلہ افزائی کی ہے۔ (ارے......) اور اُمید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی کرتے رہو گے۔ اور دوسری بات یہ کہ میں نے آپ کے کہنے کے مطابق ایسی اسٹوری بھی شروع کر دی ہے۔ جس میں عورت سخت ہو (اللہ خیر کرے اب تو......) وہ بھی انشاء اللہ جلد بھیج دوں گا۔ اور آپ کا ڈرامہ دیکھا واقعی اس میں آپ کی اداکاری کافی جاندار تھی۔ (اچھا جی!) اور امید کرتا ہوں اور دعا بھی کہ اللہ پاک آپ کو کسی نہ کسی ڈرامے میں مین رول ملے گا۔ (ارے وہ رول مین ہی تھا بھائی) انشاء اللہ اور آپ کی اسٹوری بھی چوہان صاحب کیا بات ہے۔ بہت ہی اچھی اور بہترین ہے۔

☆ بھائی شاہان لوہار! سلامت رہو اسٹوری میں ہیروئن کتنی سخت ہے؟ کیا اسٹیل باڈی بنانے لگے ہو۔ تبصرے میں جب تبصرہ نہیں ہوتا تو میرا دل چاہتا ہے...... پتا نہیں کیا کر جاؤں۔ اگلے ماہ تبصرہ ضرور لکھنا۔ ورنہ میں بہت سخت ہو جاؤں گا۔

✉ شکیل نیازی میانوالی سے رقم طراز ہیں ایک طویل عرصے سے سچی کہانیاں کا قاری ہوں اور اسی کا مطالعہ میرا پہلا اور آخری شوق ہے۔ بڑی امید کے ساتھ اپنے انکل کے ساتھ پیش آنے والا سچا واقعہ ارسال کر رہا ہوں اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گا۔

☆ اچھے شکیل! اتنے پرانے قاری ہو اور پرچے پر دو سطریں بھی نہ لکھ پائے۔ کیوں؟ اگلے ماہ اگر تفصیلی تبصرہ نا آیا تو ایک اور واقعہ ہو جائے گا۔

✉ لودھراں سے عرصے بعد یہ آمد ہے ثناء کنول اللہ دتہ کی لکھتی ہیں میں کچھ مہینے غائب کیا ہوئی، آپ سب تو مجھے بھول ہی گئے کہ ایک معصوم سی، بھولی بھالی سی لڑکی ثناء کنول اللہ دتہ بھی ہوتی تھی۔ جس کی 24 جنوری کو منگنی ہوئی ہے۔ جی ہاں 2015ء میں۔ کیا کہوں آئی ڈونٹ نو بٹ اتنا کہوں گی۔ یہ نئے رشتے انسان کو کبھی کبھی بڑا ہی ذلیل کرتے ہیں لیکن خیر...... میری تحریروں کے بارے میں اگر ہو سکے تو مجھے بتا دیں اور ہاں آپ نے تو کہا تھا کہ مئی میں حنا آپی کی کہانی ہے مگر تھی تو نہیں۔

☆ ارے بھئی! تم تو منگنی کرا کے بڑی لڑاکا ہو گئیں۔ آپ کی حنا آپی کی کہانی تیار ہے۔ کسی بھی ماہ شائع ہو جائے گی اور اتنی ساری کہانیاں...... اف! بیٹا جب تک کہانی شائع نہ ہو جائے دوسری کہانی مت بھیجا کرو۔

✉ ہماری عزیز ترین لکھاری ساتھی نیئر شفقت ساہیوال سے شامل احوال ہیں ڈیئر کاشی بھیا اسلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ پُراسرار کہانی نمبر کے لیے کہانی حاضر ہے چھوٹی سی ہے اس لیے جگہ بنا لینا ساتھ میں عائشہ اپنی شاعری بھی بھیج رہی ہے اگر پسند آئے تو تصحیح کر کے دوشیزہ کے ماتھے پر سجا دینا۔ دونوں رسالے اب باقاعدگی سے مل رہے ہیں اس لیے آپ کی اور منزہ جی کی بہت شکر گزار ہوں۔ کہانیاں

مل جائیں تو ایک SMS کر دینا ورنہ میں کال کرلوں گی۔

☆ نیئر جی! اتنی سی آمد! تبصرہ کیا ہوا؟ ابھی تو آنکھیں بھی سیر نہ ہوئی تھیں کہ قصدِ سفر باندھ لیا۔ تفصیلی تبصرہ اگلے ماہ آپ پر اُدھار رہا۔

✉ ملک سفیر انجم دکن سٹی سے پہلی بار شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں تھینکس ایم یعقوب صاحب آپ نے نئی دنیا کی سیر کروادی۔ دل کی تمام حسرتیں پوری ہوگئی ہیں سچی کہانیاں کو پڑھ کر دل کو راحت سی ملی اور اس میں لکھنے والے تمام رائٹرز کو الفت بھرا اسلام قبول ہو۔ اپریل کا شمارہ لیٹ ملا تو تبصرہ ادھورا رہا جس کی معافی۔ ایم یعقوب جی آپ کی اسٹوری بہت ہی اچھی تھی۔ دوست کی اصلیت تو سامنے آ گئی اور باقی تمام نے بڑھ چڑھ کے اپنا جادو جگایا۔ جن میں ایم اے راحت' کاشی چوہان، اسماء اعوان جاوید راہی' مجید احمد جائی' معاویہ عنبر ڈوٹو' شاہد رفیق سہو' عبدالغفار عابد' مبارک باد اور جب مئی کا ڈائجسٹ ملا تو دکن سٹی کی تو رونق ہی بڑھ گئی کیونکہ سب احوالی ایک دوسرے سے محو گفتگو میں مصروف تھے اور منزہ سہام مرزا صاحبہ آپ نے کمال اداریہ لکھا۔ اور سب کی اسٹوریز ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ سب کو ترقی دے اور سچی کہانیاں کو آسمان کی بلندیوں تک عزت دے۔ اب اجازت دیں۔ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گا۔

☆ ملک سفیر انجم! خوش آمدید۔ تبصرے میں ہم تبصرہ ڈھونڈتے رہے۔ یار اگلے ماہ تبصرہ کہانیوں پر کرنا' امید ہے میری بات سمجھ گئے ہوگے۔

✉ ایک عرصے بعد آخر وقاص حسین رحیم یار خان سے احوال کا حصہ بن ہی گئے۔ لکھتے ہیں۔ جناب کاشی چوہان صاحب امید ہے اللہ پاک کی رحمت سے خیر و عافیت سے ہوں گے۔ میں تقریباً ڈیڑھ سال بعد لکھ رہا ہوں۔ وجہ نہ ختم ہونے والی مصروفیات تھیں۔ پچھلے سال ایک کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا لیکن ٹائم ہی نہ مل سکا۔ ہر ماہ یہی سوچ کر رہ گیا کہ اب نہیں تو چلو اگلے ماہ لکھوں گا لیکن پھر وہ اگلا ماہ نہ آیا۔ پچھلے پانچ چھ ماہ سے مسلسل اسی کوشش میں تھا کہ احوال میں خط اور کہانی لکھوں لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی کار آڑے آ گیا۔ اس بار رسالہ جلدی ملا تو میں نے سوچا کہ اس بار ضرور وقت پر احوال میں شامل ہوں گا۔ لیکن اللہ پاک کی ذات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دادی امی کی ڈیتھ ہوگئی اور پھر اپنا ہوش نہیں رہا۔ تو خط اور کہانی کا کہاں رہتا تھا۔ اب جا کر کچھ ہوش آیا ہے تو ایک پرانی کہانی مکمل کر کے بھیج رہا ہوں۔ اگر یہ کسی قابل ہو تو سچی کہانیاں میں جگہ دے دیجیے گا۔ نہیں تو ڈسٹ بن میں کیونکہ جو چیز جہاں کی ہو وہیں اچھی لگتی۔ اس پر مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا اور نہ ہی میں لکھنا چھوڑوں گا۔ میں پھر لکھوں گا اب نہیں تو پھر سہی...... اب اجازت، اگلے ماہ اگر وقت پر رسالہ مل گیا تو احوال میں حاضر ہوں گا۔ اللہ نگہبان۔

☆ ارے بھائی! دادی امی کی وفات کا سُن کر ازحد افسوس ہوا۔ تمہاری آمد نے سچ میں ہمیں خوش کر دیا۔ اب آئے ہو تو آتے رہنا۔ کہانی کے لیے کوشش کریں گے۔ وعدہ نہیں کہانی مختصر لکھا کرو۔ یہ ہماری Advise ہے۔

✉ کراچی سے ہمارے پیارے لکھاری اور شاعر عادل حسین کی احوال میں آمد ہے، عرض کرتے ہیں جون کا سچی کہانیاں اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ موسم کی مناسبت سے ٹائٹل انتہائی خوبصورت 25 سے زائد کہانیاں ایک شمارے میں پیش کرنا قابلِ تحسین اقدام ہے۔ آپ اکثر تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں جو کہ سچی کہانیاں کو مزید خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ جیسا کہ اس بار آپ نے حکایتوں کا عنوان دیا ہے۔ ویلڈن کاشی بھائی۔ منزہ آپی نے ٹھیک لکھا ہے، ہم ہی تو مجرم ہیں ایسے لوگوں کو اقتدار میں لانے کے۔ احوال میں شامل ہوئے تو آپ کی محبتوں بھری باتوں نے دل مسرور کر دیا۔ محفل ہمیشہ کی طرح

## سانحہ ارتحال

ہماری لکھاری دوست سیما مناف کی بھانجی حرا روحی گزشتہ ماہ واشنگٹن میں انتقال کر گئیں۔ اس موقع پر ہم مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتے ہیں اور قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

انتہائی شاندار تھی۔ تابندہ سہام جی کو شادی کی ڈھیروں مبارک باد اور دعائیں۔ فرح انیس صاحبہ، صائمہ شبیر جی، بہن سدرہ انور علی، محترم مجید احمد جائی، مور شاہد، فریدہ فری صاحبہ، منعم اصغر، سلیمان بشیر، پیاری آپا مسز نوید ہاشمی، عارف تبسم، منشی محمد عزیز مے، شاہانہ احمد خان اور عبدالغفار عابد میں آپ سب کا بہت مشکور ہوں اپنی تحریر کی پسندیدگی کے لیے۔ آپ کی نظم اِس بار بھی خوبصورت تھی کاشی بھائی۔ میرا اسپنا سچ ہوا بھی اچھا تھا۔ قائد میں شرمندہ ہوں، ریحانہ نسیم صاحبہ کی تقدیر نے لوٹا ہے مجھے، بھی گڈی آپا کی، ما نجھی ساتھ نبھا نا رے قیصر محمود کی اچھی تحریر، عشق نے پامال کیا صبا اقبال کی خوبصورت تحریر، لوگ محبت کے نام پر کس کس طرح لٹتے ہیں یہ پڑھ کر اندازہ ہوا۔ تم میری ہو قبائلی رسم و رواج کا نوحہ، جسے خوبصورتی سے پیش کیا۔ نجمہ جبیں علیزئی نے میرے برادر کی دلہن اچھی کوشش تنظیم الدین انصاری کی۔ گلاب لمحے بکھر گئے ہیں بھی چمن اعوان کی اچھی تحریر، کنارا مل گیا مجھ کو انسانیت کا درد دیتی ایک خوبصورت تحریر بابر نایاب کی ڈاکٹر ردحیلہ خان کی دوسرا ووٹ بھی اچھی لگی۔ ساجن کی کہانی، افتخار بھٹی صاحب کی، منشی محمد عزیز مے صاحب کی یہ آگ کب بجھے گی، ہم کب سوچیں گے فرح انیس کا ایک چبھتا ہوا سوال۔ بڑے ابا بھی محمد اسماعیل بروہی نے اچھے انداز میں پیش کی۔ عمر دراز پڑھ کر لوگوں کو احتیاط کرنی چاہیے۔ نائس مسز ثمینہ سلیم، عظمیٰ شکور صاحبہ کا چپ کا کفن خوبصورت لگی۔ انداز بیاں بھی خوب۔ عشق بے پروا بھی اچھا میسج تھا۔ ندیا مسعود جی کا، میرا کالا ہے دلدار بھی ثانیہ بھٹی جی کی اچھی کوشش۔ محترم احمد سجاد بابر اس بار میڈل آف لو کی صورت جلوہ گر ہوئے۔ خوبصورت انداز خوبصورت کہانی۔ مقدمہ خون کا، اقبال بانو صاحبہ کی خوبصورت تحریر، بے بی ردم بھی صدف آصف کی اچھی لگی۔ قطرہ قطرہ پگھلا ہوں۔ ایک تھی رابعہ جاوید راہی کی قلم سے اک معصوم بچی کا نوحہ، لمحوں کی بھول، ممتاز احمد صاحب کی، چار مُہرے کا کھیل شمع حفیظ کی، حمیرا خان کی تُو کاری نہیں، کوا اور سویرا، اُم عادل کی تحریریں پسند آئیں۔ ایم اے راحت صاحب کا ناول بھی اچھا چل رہا ہے اور محمود شام کا سفر نامہ بھی اور زہر عشق تو کمال دکھا رہا ہے۔ یہ ناول آپ کی توقیر میں مزید اضافے کا سبب بنے گا۔ کاشی بھائی ویلڈن باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح شاندار رہے۔ نا چاہتے ہوئے بھی خط طول پکڑ گیا ہے۔ کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی کا طلب گار ہوں۔ تمام لکھنے پڑھنے والوں کو سلام اور دعا کے ساتھ رمضان کی ڈھیروں مبارکباد۔

☆ لو عادل! ہمارا دل ہی تو نہ چاہا کہ اس تبصرے کو کہیں سے حوالہ قینچی کرتے مگر...... تبصرے کے لیے شکریہ۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے شاہد رفیق سہو کی کبیر والا سے، لکھتے ہیں کاشی چوہان کی محنتوں سے بہت جلدی ماہ جون کا شمارہ مل گیا کاشی چوہان کی ایڈیٹنگ کی خوبصورتی اور محنتوں سے آنے والے پرچے نے ماضی کے پرچوں کی یاد بھلا دی۔ ان کی یہ محنت اور محبت ہے وہ ہر ماہ پرچے میں تبدیلی لا رہے ہیں اور اس کو خوبصورت سے خوبصورت بنا کر ہمیں پیش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ لائف بوائے اسماء اعوان جو کہ کامیابی کی سیڑھیوں پر ہے۔ قائد میں شرمندہ ہوں ریحانہ نسیم اس کہانی کے کردار

پروفیسر مہتاب علی تھے۔ تقدیر نے لوٹا مجھے گڈی اپا جو ممتا ماری کی روح کو جھنجوڑتی داستان تھی۔ شروع سے کہانی اچھی تھی آگے بوریت کا شکار تھی۔ مانجھی ساتھ نبھانا رے قیصر شاہد قسمت اور محبت کرنے والوں کے لیے اسباب پیدا کرتی ہے۔ اس کے بعد صبا اقبال نجمہ جبیں، چمن اعوان، ڈاکٹر راحیلہ خان، فرح انیس نسیم سحر، منشی عزیز مے، حمیرا خان کی کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں، سبق آموز ہیں اور میں ان احباب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے تبصروں میں یاد رکھا۔ یہ اچھے لوگوں کی پہچان ہے۔

☆ پیارے شاہد! تبصرہ بس چند کہانیوں پر کیوں کیا؟ خیر تمہاری محنتیں بھی کم نہیں اپنا خیال رکھنا۔

✉ میانوالی سے ملک محمد اکرم آھیر کی یہ پہلی آمد ہے لکھتے ہیں آپ کا ڈائجسٹ سچی کہانیاں ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں، آپ کے ڈائجسٹوں کا کوئی جواب نہیں۔ اس ڈائجسٹ میں ہر اک کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار فرمائے اور آپ کے ماہنامے کو چار چاند لگائے۔ میں اس محفل پہلی بار شرکت کرر ہا ہوں۔ میں نے ایک کہانی لکھی ہے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو آپ سے پیشگی معافی چاہوں گا۔ اُمید کرتا ہوں اگر میری کہانی آپ کے معیار کے مطابق ہو تو اسے جگہ ضرور دیں۔ انشاء اللہ۔ آئندہ ہر ماہ آپ کی خدمت میں حاضر رہوں گا اب اجازت چاہوں گا۔

☆ بھائی اکرم آھیر! خوش آمدید۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھ نہ سکے۔ جلد ہی مطالع فرما دیا جائے گا۔ ہاں ایک وعدہ ضرور پورا کرنا۔ تبصرہ ہر ماہ آنا چاہیے۔

✉ کراچی سے ہی یہ آمد ہے بڑے دنوں بعد ہماری نفیسہ فضل صاحبہ کی، اپنے شفقت بھرے انداز میں یوں مخاطب ہیں سلامت رہو یا! اللہ پاک سے آپ کی زندگی وصحت کی اور تمام اسٹاف کی صحت وزندگی کی، بھابی رخسانہ بیٹی منزہ کی صحت وسلامتی کی دعا کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے آمین۔ میری طبیعت مستقل خراب تھی اس لیے کہانی جلد نہیں لکھ سکی مگر ہمت کر کے کل سے آج یہ کہانی مکمل کی ہے۔ اب کے تو ماہ مئی کے شمارے سے بھی محروم رہی، جون کا شمارہ وقت پر مل گیا جزاک اللہ۔ میری اور میرے بیٹے طاہر کی صحت کے لیے آپ تمام قارئین سے دعا کی گزارش ہے۔ میں ان بیٹے بیٹیوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے عزیزوں کی وفات پر تعزیت کی۔ آپ سب قارئین میرے کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر طارق اشرف اور ہربل ڈاکٹر بلقیس کے لیے بھی دعائے خیر کریں جن کے علاج سے میں صحت کی طرف گامزن ہوں۔ اُمید ہے کہ یہ کہانی آپ کے معیار پر پوری اترے گی۔ سب قارئین اور تمام اسٹاف کے لیے دعا گو۔

☆ پیاری آنٹی! خدا سے آپ کی صحت کی درازئ عمر کی دعائیں ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ہمیں اگلے ماہ بھی اسی طرح اپنی محبتوں اور دعاؤں سے سرفراز کریں گی۔

✉ چوہدری پرویز کی خانیوال سے مختصر حاضری ہے۔ لکھتے ہیں جب بھائی شاہد رفیق سہو نے بتایا کہ ماہِ جون کا شمارہ مارکیٹ میں آچکا ہے۔ اور آپ کا خط بھی لگا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور میں فوری طور پر ڈائجسٹ لینے چلا گیا۔ کاشی صاحب ڈائجسٹ سے پتا چلتا ہے کہ آپ کی محبت اور محنت اس ڈائجسٹ سے جڑی ہوئی ہے کیونکہ ہر ماہ یہ خوبصورت بنتا جا رہا ہے اور اس کی سب کہانیاں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ اور میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی بزم میں جگہ دی۔ آپ کی اسٹوری زہر عشق واقعی زبردست ہے۔ اس بار مجھے کہانیاں جو پسند آئیں اُن میں قائد میں شرمندہ ہوں۔ مانجھی ساتھ نبھانا رے، نجمہ جبیں، چمن اعوان، منشی عزیز وغیرہ کی سبق آموز تھیں۔ تمام پڑھنے والوں کو میری طرف سے سلام۔

☆ چوہدری پرویز! آپ خوش ہوئے ہمیں اچھا لگا۔ تبصرہ توجہ طلب ہے۔ اُمید ہے اگلے ماہ تھوڑا سا تبصرہ اور......

✉ ہماری بہت پیاری بہن شازیہ گل ضلع مانسہرہ گاؤں بھیر کنڈ سے احوال میں شامل ہیں۔ لکھتی ہیں دو ماہ سے خط نہیں لکھ پائی مگر پھر بھی احوال میں شامل بہن بھائیوں نے مجھے اپنے خطوط میں یاد رکھا۔ اس شمارے کی سب سے بڑی یہی خوبی ہے کہ اس شمارے سے جڑے لوگ فیملی ممبرز جیسے بن جاتے۔ سچی کہانیاں سب کو پیار اور خلوص کے بندھن میں باندھ دیتا ہے اور اس کا کریڈٹ کاشی بھیا کو جاتا ہے۔ مجھے پچھلے دو ماہ سے ڈائجسٹ لیٹ ملا اور کچھ بھائی کی شادی کی مصروفیت تھی جس کی وجہ سے اپنے پسندیدہ سلسلے احوال میں شامل نہ ہو پائی۔ اس بار شمارہ 27 کو ملا بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے منزہ جی کا چلو بھر پانی پڑھا زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا۔ اس کے بعد احوال میں شامل خطوط پڑھے۔ انکل عقیل عادل زادہ آپ کا خط سب سے منفرد اور نمایاں لگا، خاص کر لفظوں کا چناؤ' لگتا ہے ادب سے آپ کا گہرا رشتہ ہے۔ فلک زاہد سچی کہانیاں میں خوش آمدید شاہد رفیق بھیا خط کی۔ یدگی کے لیے شکریہ باقی سب کے خطوط بھی اچھے لگے سب سے پہلے اپنا پسندیدہ ناول زہر عشق پڑھا۔ سلمان جن کی صنوبر سے محبت اور صنوبر کا ڈر، کہانی بہت خوبصورت ہوتی جا رہی ہے' اگلی قسط کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔ ہم شکل میں شاہ زیب کو اپنے ہم شکل ڈھونڈنے کا تجربہ کچھ مہنگا پڑنے لگا ہے، چلو دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ باقی لائف بوائے اسماء اعوان قائد میں شرمندہ ہوں۔ ریحانہ نسیم' تقدیر نے لوٹا ہے گڈی آپا، ماںجھی ساتھ نبھانا قیصر شاہد' عشق نے پامال کیا، صبا اقبال، تم میری ہو نجمہ جبیں' گلاب لمحے' چمن اعوان میرے برادر کی دلہن عظیم الدین انصاری، کنارہ مل گیا مجھ کو بابر نایاب، دوسرا ووٹ' ڈاکٹر راحیلہ خان' ساجن کی کہانی افتخار بھٹی' یہ آگ کب بجھے گی منشی محمد عزیز میمن' ہم کب سوچیں گے فرح انیس' بڑے ابا محمد اسماعیل بروہی' عمر دراز، مسز ثمینہ سلیم' چیپ

کا کفن عظمیٰ شکور' عشق بے پروا ندیا مسعود' میرا کالا ہے دلدار ثانیہ بھٹی' میڈل آف لو احمد سجاد بابر' مقدمہ خون کا، بے بی روم صدف آصف، قطرہ قطرہ پگھلا ہوں نسیم سحر' برطانیہ میں خزاں محمود شام، ایک تھی رابعہ جاوید راہی' لمحوں کی بھول ممتاز احمد' چار مہرے کا کھیل شمع حفیظ' تو کاری نہیں حمیرا خان' کو اور سویرا اُم عادل ہائیڈ پارک بھی اچھا تھا۔ تیر نیم کش میں سدرہ انور علی' سلیمان شبیر' منشی محمد عزیز مئے اور نور العین کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ اب اجازت جہاں رہیں خوش رہیں۔

☆ شازیہ! بھائی کی شادی کی مبارک باد قبول کرو۔ اب غیر حاضری نہیں چلے گی۔ یہ ایک بھائی کا حکم ہے۔ خوش رہو۔

✉ بہن شازیہ کے ساتھ ہی ہمارے بھائی ارشاد گل پشاوری بھی آخر ہماری محبت کے حصار میں مقید ہو ہی گئے ارشاد گل پشاوری ضلع مانسہرہ گاؤں بھیر کنڈ سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں لکھتے ہیں یوں تو سچی کہانیاں ہمارے گھر میں کافی ٹائم سے آ رہا ہے مگر میں نے کبھی توجہ نہیں دی تھی کہ میری وائف کے ہاتھ میں، ہر وقت سچی کہانیاں ڈائجسٹ ہوتا ہے۔ مجھے بھی تجسس ہوا کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے؟ جب پڑھا تو خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ سچی کہانیاں واقعی ایک بہترین ڈائجسٹ ہے۔ اس میں شامل کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مجھے عظمیٰ شکور جی کی کہانی چپ کا کفن بہت اچھی لگی، اس کے علاوہ زہر عشق، قائد میں شرمندہ ہوں اور بے بی روم بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ باقی ابھی پڑھی نہیں اس لیے اُن پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ اچھا اب اجازت انشاء اللہ اگلی بار مکمل تبصرے کے ساتھ دوبارہ حاضری دوں گا۔

☆ بھائی ارشاد! خوش آمدید! دیکھ لیجیے بہن شازیہ کا میکہ آخر آپ کو بھی اس احوال کا حصہ بنا ہی گیا۔ آپ کی آمد نے سچی قلبی خوشی سے سرفراز کیا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ چک جسو کانویں سے ہمیں یہ تبصرہ موصول ہوا ہے چوہدری فہد سہو کا لکھتے ہیں ماہ جون کا شمارہ شاہد رفیق سہو کے ڈیرے سے پڑھنے کو ملا۔ پہلے میں دوسرا ڈائجسٹ پڑھتا تھا۔ لیکن سچی کہانیوں کے مطالعے کے بعد دل نے فیصلہ کیا ہے کہ سچی کہانیاں ہر ماہ باقاعدہ پڑھوں۔ احوال والا سلسلہ بہت خوبصورت ہے۔ میرے دل نے بھی کہا اس احوال کا حصہ بنوں۔ میں احوال میں شریک ہوں۔ کاشی چوہان کی کہانی زہر عشق میری روح میں اُتر چکی ہے، جو شاید میرے ساتھ رہتی ہے۔ باقی کہانیاں جو میں پڑھ چکا ہوں اُن کی تعریف بھی ہو جائے منشی عزیز مئے' ریحانہ نسیم' چمن اعوان' صبا اقبال' حمیرا خان' فرح انیس' ان کی کہانیاں اچھی تھیں۔ سبق دینے والی تھیں۔ میری طرف سے ان کو سلام اب اجازت دیں۔

☆ چوہدری فہد! خوش آمدید' چلیے رسالہ آپ کی نظروں میں تو آیا۔ بس اب ہمارا اور آپ کا ساتھ برقرار رہے۔ وعدہ کریں۔

✉ قمبر شہداد کوٹ سے ہمارے بہت معصوم اور محبت کرنے والے دوست مور شاہد حسین رقم طراز ہیں ماہ جون کا شمارہ پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ شمارہ ملتے ہی احوال کی جانب لمبی چھلانگ لگائی۔ نئے آنے والے مہمانوں جواد احمد' ایم اے شکیل' سنبل ناہید' نگین افضل' اے آر راحیلہ' فلک زاہد' افتخار بھٹی' سلیمان شبیر' ندیم عباس، ایم ایچ کاشف' عارف تبسم' عقیل عادل' ثروت شان' بھلی کرے آیا۔ (خوش آمدید) محمد اسماعیل بروہی بھیا آپ ہمیشہ دعاؤں میں یاد رہتے ہو۔ شاہد رفیق' ممتاز احمد بھیا' مجید احمد بھیا' عادل حسین' امجد علی' منشی محمد عزیز مئے' عبدالغفار عابد' آپ سب کیسے ہیں۔ سلام و دعائیں۔ گڑیا رانی سدرہ انور سدا خوش و سلامت رہو۔ مسز نوید ہاشمی آپی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ فریدہ فری آپی خدا آپ کو مکمل صحت

دے۔ غلام رسول گل' امجد علی بھیا' عبدالعزیز جی آ انکل' ملکہ احوال ادی تحسین جونیجو' آپی زرینہ جونیجو پلیز لوٹ آئیں آپ سب کہاں ہیں۔ اسماء اعوان لائف بوائے زبردست رہی۔ قائد میں شرمندہ ہوں تقدیر نے لوٹا ہے' ماہی ساتھ نبھانا' عشق نے پامال کیا' تم میری ہو' پسند آئیں۔ میرے برادر کی دلہن گلاب لمحے بکھر گئے ہیں، کنارا مل گیا مجھ کو' دوسرا ووٹ' ساجن کی کہانی' اچھی کاوشیں تھیں۔ یہ آگ کب بجھے گی۔ ہم کب سوچیں گے' بڑے ابا' عمر دراز' چپ کا کفن' عشق بے پروا' میرا کالا ہے دلدار' میڈل آف لو' مقدمہ خون کا' بے بی روم' قطرہ قطرہ پگھلا ہوں زبردست رہیں۔ محمود شام برطانیہ میں خزاں معلومات میں اضافہ ہوا۔ ایک تھی رابعہ ہمیشہ کی طرح انوکھی' لمحوں کی بھول بھی اچھی تھی۔ چار مہرے کا کھیل' تو کاری نہیں' کوا اور سویرا پسند آئی۔ کاشی چوہان زہر عشق ایم اے راحت ہم شکل عمدگی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ہائیڈ پارک اور تیر نیم کش پسندیدہ سلسلے ہیں۔ تمام چاہنے والوں کو لیے ڈھیروں دعائیں۔

☆ اچھے مور! سدا شاد رہو' آباد رہو' تمہارے ساتھی کہاں غائب ہوگئے بھائی تمہیں اکیلا چھوڑ کر۔ ظفر علی' امجد علی کہاں غائب ہو۔ تبصرہ پسند آیا۔

✉ یہ محبتوں سے گندھا تبصرہ ہمیں ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست ممتاز احمد نے سرگودھا سے روانہ کیا ہے لکھتے ہیں پیار بھرا اور خلوص چاہت کے جذبوں سے لبریز سلام قبول ہو۔ اداریے میں منزہ بہنا نے سچ کہا اور خوب کہا دونوں طبقوں کے لیے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کے مقام ہے۔ باجی صائمہ کہانی پسند کرنے کا شکریہ آپ کی غزل بہت زبردست تھی۔ بس اب ہر مہینے آپ کی ایک غزل سچی کہانیاں کے صفحات کی زینت بنی چاہیے برادرم مجید احمد جائی صاحب آپ ایک پیار کرنے والے سچے' کھرے اور پرخلوص انسان ہیں۔ آپ ہرگز دل چھوٹا نہ کریں۔ کہانی پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ مسز نوید ہاشمی آپ کو کاشی نے آپا کا درجہ دیا ہے تو اس لفظ اور رشتے میں بہت ہی اپنائیت' خلوص' عزت اور احترام ہے۔ آپ ہماری بہن ہیں اور آج سے سب احوالیوں کی آپا ہیں۔ آپ نے سچ کہا رشتوں کے تقدس میں پیار اور احترام ہی تو ہوتا ہے۔ یہ رشتے سچے اور خالص ہوتے ہیں بناوٹ اور غرض سے پاک' بھائی عادل حسین چپکے چپکے شادی کروالی...... نہ کوئی دعوت نہ مٹھائی (الزام نہ لگاؤ بھائی جی! ہمیں تین ماہ پہلے سے بتادیا تھا' بلکہ سارے معاملات سامنے ہی طے ہوئے) بہت بہت مبارک ہو' دعا ہے آپ کی ازدواجی زندگی محبت اور پیار کی خوشبو سے ہمیشہ مہکتی رہے۔ آمین۔ ساہیوال کے بھائی عارف تبسم صاحب آپ کو احوال میں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ ویلکم، آپ کے خلوص اور کہانی کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ۔ شاہانہ احمد خان صاحبہ آپ نے میری کہانی کو نہ صرف پسند کیا بلکہ اچھوتی کہانی قرار دیا آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ پیارے بھائی عبدالغفار عابد' منشی عبدالعزیز مئے۔ پشاور کے ننھے اور ہونہار جواد احمد، ڈیرہ غازی خان کے محترم ایم یعقوب دعا ہے کہ اللہ کریم آپ کے سب گھر والوں کو صحت تندرستی شفاء کاملہ نصیب فرمائے۔ آمین کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ برادرم مور شاہد جناب کدھر ہیں آج کل؟ احوال میں آپ کی آمد میں بے قاعدگی کیوں ہے؟ آپا فریدہ فری صاحبہ آپ کی شاعری بہت عمدہ ہوتی ہے۔ محترم پیر نوید شاہ' کنول عمران خان' ثمینہ' ام عادل آپ سب بہت عرصے سے احوال سے مسلسل غائب ہیں...... کیوں جی؟ مانا کہ بہت مصروفیت کا دور ہے ہر بندہ بے انتہا مصروف ہے مگر پلیز تھوڑا ٹائم نکالیں اگر سچی کہانیاں سے پیار ہے تو فی الفور احوال میں آجائیں۔ شکریہ قائد میں شرمندہ ہوں بہت لاجواب اور عمدہ کہانی تھی۔ ام عادل کی کوا اور سویرا شوہر کی بے حسی پر مبنی بہت اچھی کہانی تھی۔ منشی عبدالعزیز مئے کی یہ آگ کب بجھے گی پڑھ کر بے اختیار

رونا آیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرا کالا ہے دلدار شاندار کہانی تھی۔ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے تو جن رائٹرز کی کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھ سکا اُن سے معذرت انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔

☆ پیارے ممتاز! اسدا سلامت رہو احوال میں آپ کی آمد ہمیشہ کی طرح اچھی لگی۔

✉ لک موڑ سرگودھا سے عرصہ دراز بعد یہ آمد ہے ہمارے بہت موہنے' سوہنے سے نبیل جاوید کی لکھتے ہیں تقریباً 8 سال بعد احوال میں شامل ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ ویلکم ضرور کریں گے۔ (جی آیاں نوں!) 8 سال پہلے میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ اور تقریباً باقاعدگی سے سچی کہانیاں پڑھتا تھا۔ احوال میں بھی شامل ہوتا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد امی جان ہمیں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئیں پھر زندگی میں کئی مسئلے مسائل پیدا ہوئے اور سچی کہانیاں سے رابطہ مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ پھر روزی روٹی کی تلاش میں لگ گیا۔ اس وقت کے سچی کہانیاں اور آج کے سچی کہانیاں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کاشی بھائی ماشاء اللہ آپ کی محنت سے سچی کہانیاں دن بدن خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔ بھائی شمارہ لیٹ ملا ہے جس کی وجہ سے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ آئندہ ماہ انشاء اللہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔

☆ پیارے نبیل! ماں کی خدمت تو تم نے کی۔ اپنے دل کو تسلی دو کہ بس ان کا تمہارا ساتھ اتنا ہی تھا۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ اب احوال میں غیر حاضری ہم بالکل برداشت نہ کریں گے۔

✉ یہ احوال میں پہلی آمد ہے حمیرا جبیں عبدالحکیم کی کبیر والا سے لکھتی ہیں پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہوں امید ہے آپ ویلکم کریں گے۔ ماہ جون کا شمارہ میرے پیارے کزن شاہد رفیق سے ملا۔ بہت اچھا ڈائجسٹ ہے پہلے میں آنچل پڑھتی تھی۔ لیکن اس ڈائجسٹ کی اپنی بات ہے بہت خوبصورت مجموعہ ہے۔ اس کی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ زہر عشق اسٹوری غالباً آپ کی ہے۔ بہت اچھی اسٹوری ہے۔ اس کی رگ رگ میں عشق ہے۔ قائد میں شرمندہ ہوں اچھی اسٹوری تھی۔ تقدیر نے لوٹا مجھے۔ لائف بوائے بھی اچھی اسٹوری ہے۔ باقی سب سلسلے بہت اچھے ہیں۔ سچی کہانیوں کا کارواں کاشی بھائی کی محنت سے چلتا رہے آمین۔

☆ اچھی حمیرا! خوش آمدید، یہ کارواں آپ سب ہی کے دم سے ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا اور اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ احوال میں راشد لطیف صبرے والا سے ہمارے ساتھ ہیں' لکھتے ہیں ماہ جون کا شمارہ اس بار بہت جلدی مل گیا۔ یہ بھی آپ کی محنت کا ثبوت ہے۔ بھائی شاہد رفیق سہو نے بتایا آپ کا خط لگا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور شہر سے پرچہ خرید کر لایا۔ کاشی صاحب آپ بہت ہی اچھے انسان ہیں۔ آپ سے فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ اس دفعہ ٹائٹل بہت خوبصورت ہے۔ کہانیوں میں لائف بوائے اسماء اعوان' ریحانہ نسیم' قیصر شاہد' منشی عزیز' نسیم سحر' حمیرا خان کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ مجھے بہت پسند آئیں۔ بہت جلد ایک اسٹوری بھیجوں گا یقیناً اس پر آپ نظر ثانی کریں گے اور زہر عشق میری فیورٹ اسٹوری بن چکی ہے۔ آخر میں لکھنے پڑھنے والوں کو خلوص دل سے سلام۔ سچی کہانیاں کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ اچھے راشد! تم خود اچھے ہو اس لیے تمہیں سب اچھے لگتے ہیں۔ ہمارا پیار ہمارے ہر لکھاری اور قاری کے لیے یکساں ہے۔ بہت خوش رہو۔

✉ اسامہ سعید کراچی سے پہلی بار مختصراً احوال کے ساتھ شامل ہیں لکھتے ہیں میں آپ کو ایک سچی کہانی بھیج رہا ہوں جو میری اپنی فیملی کی ہے۔ مقام اور نام تبدیل کر دیے گئے ہیں اور تھوڑا بہت حالات کے مطابق اس میں تبدیلی کی گئی ہے، ایک سچی کہانی ہے جس کے تمام کردار آج بھی موجود ہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ

کو میری یہ کہانی پسند آئے گی اور آپ اسے اپنے کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر میری حوصلہ افزائی کریں گے کیونکہ یہ میری پہلی کاوش ہے۔

☆ پیارے اُسامہ! خوش آمدید، کہانی پڑھ کر ان ہی صفحات پر مطلع کر دیں گے۔ اگلے ماہ اگر پرچے پر تبصرہ نہ کیا تو ہماری تم سے دوستی ختم۔

✉ یہ آمد ہے ایبٹ آباد سے ہماری بہت پیاری بہن اُمِ مناہل کی لکھتی ہیں مصروفیت کے باعث کافی عرصے بعد احوال میں شریک ہو رہی ہوں مگر آپ سے ملاقات پہلی بار ہو رہی ہے آپ سب کو رمضان کی بہت بہت مبارکباد اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ قائد میں شرمندہ ہوں قیام پاکستان کے حوالے سے لکھی گئی ایسی تحریر جس کے مرکزی کردار کی رگ رگ میں قائداعظم اور پاکستان کی محبت بسی ہوئی تھی۔ ایسے لوگ تو اب آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے ہیں۔ جن میں ایک ہم بھی شامل ہیں۔ تقدیر نے لوٹا مجھے ماں کی محبت پر تو صفحے ختم ہو جائیں مگر محبت کی انتہا نہیں ہوتی۔ تم میری ہو بہت ہی دکھی کہانی تھی۔ گلاب لمحے بکھر گئے ماں باپ بد دعا کبھی نہیں دیتے اور اگر کبھی انجانے میں اولاد کے لیے منہ سے برا نکل بھی جائے تو اس سے زیادہ ان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ مگر چپ رہ کر صبر ضرور کرتے ہیں۔ عشق نے پامال کیا سچے عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ کنارہ مل گیا مجھ کو اس دوغلی دنیا میں اگر ایسے کنارے مل جائیں تو انسان کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کاش ایسی شبنم ہر گھر میں گرنے لگے۔ لمحوں کی بھول ابھی اوپر بات ہو رہی تھی عشق کی تو جناب بڑھاپے میں عشق ایسے ہی رسوا کرتا ہے جیسے سیٹھ صاحب ہوئے۔

☆ پیاری بہن! سلامت رہیے۔ ملاقات میں تاخیر ہوئی تو یقیناً کچھ باعثِ تاخیر بھی ہوگا۔ آپ کا تبصرہ مزیدار تھا۔ امید ہے اب بہن بھائی کا یہ رشتہ مزید مضبوط ہوگا۔ کہانی کے بارے میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کو بتا دیا جائے گا۔ فی الحال تو مجھے اپنی بہن کا اگلے ماہ پیارا سا تبصرہ چاہیے۔

✉ ہمارے بہت ہی پیارے اور شریر بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاول پور سے مخاطب ہیں جون کے شمارے میں سفر نامہ محمود شام کا لکھا ہوا پانچواں حصہ پڑھا بہت مزا آیا۔ تصاویر نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

## ناقابلِ اشاعت تحریریں

| | |
|---|---|
| آگ اور زندگی | نبیلہ نازش راؤ |
| کمزوری | قاضی شارق محمود |
| عبادت بھری محبت | کشاف اقبال |
| اے زندگی | افشین راجپوت |
| ادھوری محبت | افشین راجپوت |
| محبت ایک کاروبار | عارف شہزاد |
| لٹیرا | افضل شاہ |
| ہم بھی یہاں ہیں | ماجد احسان |
| کاش کوئی مجھے سمجھاتا | مہرین کنول |

اب جولائی کے شمارے کا انتظار ہے۔ جس میں برطانیہ میں خزاں کا چھٹا حصہ شائع ہونا ہے۔ لگتا ہے یہ شمارہ انشاء اللہ عید سے پہلے آجائے گا۔ محمود شام اپنی تصویر سے ہر دلعزیز اور فرشتہ صفت انسان لگتے ہیں۔ اُن تک میرا سلام پہنچایئے ایسے لوگ وقت اور ماحول کی رونق ہوتے ہیں۔ خدا اُن کو طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین

☆ بشیر بھائی! یہ کیا! بس پرچے میں سفرنامہ ہی تھا کیا؟ آپ کی کہانیاں اشاعت کے مراحل سے گزرنے والی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ فوراً اپنا فون نمبر ہمیں ارسال کریں۔

✉ صادق آباد ضلع رحیم یار خان سے یہ پہلی پہلی آمد ہے عارف شہزاد کی' لکھتے ہیں میں تقریباً ڈھائی سال سے ایک ڈائجسٹ میں لکھتا رہا ہوں اور تقریباً 30 اسٹوریاں لکھی ہیں۔ پر دکھ کی بات یہ کہ صرف 2 اسٹوریاں ہی شائع ہوئی ہیں باقی اسٹوریوں کا کچھ پتا نہیں۔ ایک اسٹوری آپ کو بھیج رہا ہوں۔ برائے مہربانی مجھے آپ ناامید مت کرنا میں ہمیشہ لکھتا رہوں گا سچی کہانیاں میں۔ دن رات آپ کے لیے دعا گو رہوں گا۔

☆ پیارے عارف! خوش آمدید! مگر یہ تو بتاؤ دو ڈھائی سال میں 30 اسٹوریاں کسی کو بھیج دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اصول تو یہ ہوتا ہے کہ آپ کی اسٹوری شائع ہو جائے تو دوسری اسٹوری بھیجیں۔ امید ہے اب آپ سمجھ گئے ہوں گے تبصرہ کہاں ہے؟

✉ صالحوال دیپال پور سے یہ آمد ہے ہمارے ننھے دوست یاسر کی لکھتے ہیں ماہ جون کا رسالہ ملا پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ جب اپنی تصویر اور لیٹر دیکھا تو خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ خیر اب آتے ہیں احوال کی طرف، جن لوگوں نے پورے دل سے لیٹر لکھے میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں جن میں راشد لطیف، اے آر راحیلہ' ایم یعقوب' ندیم عباس میوانی' فلک زاہد' ممتاز احمد' تو دوستو آپ نے کمال لکھا تھا۔ آپ نے محبت کی اور ہم آپ کو داد نہ دیں یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خیر آتے ہیں کہانیوں کی طرف مجھے تو بس ابھی تک دو کہانیاں ہی اچھی لگی ہیں۔ زہر عشق اور نو کاری نہیں حمیرا خان۔ کیا کمال کی اسٹوریاں تھیں۔ آخر میں بس سب سے اتنا ہی کہنا ہے کہ روزے پورے رکھنا خدا حافظ۔

☆ ارے لڑکے! روزے تو سب پورے ہی رکھتے ہیں۔ مگر تم نے یہ تبصرہ کیوں اتنا ادھورا لکھا؟ تمہیں سزا دینی پڑے گی اب۔

✉ لاہور سے بہت عرصے بعد ہماری گڈی آپا نے ہمیں یاد کیا ہے لکھتی ہیں ایک سہانی صبح کو بیل بجی۔ ڈاکیا آیا ڈائجسٹ لایا۔ اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ بھئی واہ بروقت ڈاک کا ملنا کمال ہو گیا۔ پہلے ہی صفحے پر مسکراتی حسینہ نے ثابت کر دیا کہ 'حسن اپنا تعارف آپ ہوتا ہے' اور 25 سے زائد سچی کہانیوں نے تو چار چاند لگا دیئے منہ سے رال بہنے لگی۔ ہم نے جب سے اسے اپنایا ہے دوسری طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کیا کریں اس کی تحریروں میں کشش ہی اتنی ہے۔ انتہائی سچی اور کھری کہانیوں پر انعامات دیگر خاص شمارے سارے سال میں دل کو خوب لبھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے سچے اور کھرے لوگ اس سے اس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ اِن کا اوڑھنا بچھونا ہی ڈائجسٹ سچی کہانیاں ہو کر رہ گیا ہے۔ اور قاری کی روح تک سیراب ہو جاتی ہے۔ معاشرے کی دکھتی ہوئی نبض شناسی نے سہام مرزا کے احساس کو کمال عروج تک پہنچا دیا ہے۔ احوال میں کاشی چوہان کی حیثیت شیرینی کی سی ہے کہ لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آتے ہیں۔ اُن کی تحریروں جیسا انداز بیاں کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی شخصیات سے ملاقات علم میں اضافہ کرتا ہے۔ ناقابل اشاعت کی اطلاع دے کر بھی آپ نے بڑا ہی اچھا کیا ہے۔ انسان پریشان نہیں رہتا۔ رسالے کا بروقت ملنا بھی خوب ہے۔ سفرنامے گھر بیٹھے بٹھائے دوسرے ممالک کی سیر کرواتے ہیں

اور یوں نالج میں اضافہ ہوتا ہے جو قابلِ تحسین ہے۔ چوہان صاحب آپ کے ناول کی ہر قسط مقناطیس کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے بھی خوب ہے۔ اب اجازت۔

☆ بہت عزیز آپا! سلامت رہیے تبصرہ بہت پسند آیا۔ لگا تھوڑی دیر ممتا بھری چھایا میں آ گئے ہوں۔ آپا! کیا آپ ہمیں ہر ماہ اس محبت سے سرفراز نہیں کر سکتیں؟

✉ یہ آمد ہے قلم آزمائی کرتے ایم منظور اکبر تبسم کی جھنگ سے پہلی بار احوال میں شامل ہو رہے ہیں لکھتے ہیں امید ہے تمام احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں سچی کہانیاں کی محفل میں پہلی مرتبہ قلم آزمائی کر رہا ہوں۔ امید ہے نمایاں جگہ دے کر حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ (جی!!) میں دوسرے ڈائجسٹ میں اپنی تحریر بھیجتا ہوں۔ اُمید ہے یہاں بھی شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ ماہنامہ سچی کہانیاں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے واقعی بے مثال ادبی جریدہ ہے۔ ہمارا عہد ہے کہ ہم مل جل کر سچی کہانیاں میں لکھیں گے۔ (ہائیں...... ) ہماری تحریر بلاشبہ بامقصد اور معیاری ہوگی۔ اللہ پاک ماہنامہ سچی کہانیاں کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے آمین۔

☆ پیارے بھائی ایم منظور اکبر تبسم! خوش آمدید! قلم آزمائی کی تو احوال میں جگہ بھی مل گئی۔ تحریر معیاری ہوئی تو شائع بھی ہو جائے گی۔ اگلے ماہ تبصرہ ضرور کرنا پرچے پر۔

✉ یہ احوال میں آمد ہے ہماری نئی احوالی رفعت خان کی خان پور سے، لکھتی ہیں میں سچی کہانیاں میں پہلی بار بذریعہ خط شمولیت کر رہی ہوں۔ میں نے سچی کہانیاں دیکھا، پڑھا بے حد پسند آیا۔ مختلف جگہوں پر میری تحاریر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ میں کالم نگار بھی ہوں۔ دنیا نیوز، اوصاف، جہانِ پاکستان، خبریں، میں میرے کالم لگتے رہتے ہیں، میرے پاس ناقابلِ فراموش سچی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ میں اصلاحی سچی کہانیوں کے ذریعے زندگی کی حقیقت قلمبند کرنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ سچی کہانیاں مجھے اپنا ہم خیال محسوس ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے سچی کہانیاں پلیٹ فارم اور میری کاوش سے بہت سے لوگوں کی اصلاح ہو سکے اور انھیں زندگی کی حقیقت معلوم ہو جائے جو اس وقت گمراہی، گمنامی اور محرومی کے اندھیروں میں جی رہے ہیں۔ اُمید کرتی ہوں سچی کہانیاں کی ٹیم مجھ سے ربطہ ضرور کرے گی اور مجھے سچی کہانیاں کے لکھاریوں میں شمولیت کی دعوتِ خاص دی جائے گی۔

☆ ڈیئر رفعت! خوش آمدید۔ سچی کہانیاں 35 برس سے ادب کی دنیا میں قلم کار موتی ڈھونڈنے کے عمل میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ ہم اپنے تمام لکھاریوں (جن میں بین الاقوامی لکھاری بھی شامل ہیں) کو دعوت عام دیتے ہیں کہ سچ لکھو اور ہمیں ارسال کر دو۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری اس دعوت عام سے لکھنے والے خاص بن جاتے ہیں۔ امید ہے آپ کا قلمی تعاون بھی ہمیں حاصل رہے گا۔

✉ ہماری بہت پیاری آپا مسز نوید ہاشمی نارتھ ناظم آباد کراچی سے لکھتی ہیں امید کرتی ہوں میرے دوست میرے ساتھی خیریت سے ہوں گے اور رمضان کے استقبال کی تیاری میں لگے ہوں گے۔ آئیے اب احوال میں چلتے ہیں۔ سب سے پہلے بھائی اسماعیل بروہی سوری غلطی انسان سے ہوتی ہے عائشہ نور اور ندیم عباس کے ساتھ جس نے امتحانات دیے اللہ انہیں کامیابی عطا فرمائے۔ ایم یعقوب بھائی کے لیے دعا گو ہوں آپ کو اور سب کو شفا عطا کرے صائمہ بشیر شکریہ آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا۔ مجید احمد بھائی میرا جواب وہی ہے جو جون میں کاشی چوہان نے آپ کو دیا۔ مور شاہد میرے بھائی آپ کے لیے جون کی ڈائجسٹ میں کہا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ آپ کی دعا میں میرے لیے بہت بڑا تحفہ ہیں۔ فریدہ فری خدا آپ کو تندرستی عطا فرمائے۔ منعم اصغر آپ کا شکریہ۔ عادل حسین میرے بھائی ہمیشہ خوش رہو۔ خدا تمہیں تمام خوشیاں عطا فرمائے جس کی تم طلب کرو۔ اسماء اعوان لائف بوائے کی پھر ایک کہانی لے کر آئی ہیں۔ اچھی تھی۔ ریحانہ تبسم اور گڈی آپا

کی تحریر شاندار تھی۔ قیصر شاہد صبا اقبال اچھی سچ بیانی دی۔ بابر نایاب اور ڈاکٹر راحیلہ خان کی تحریر پسند آئی۔ افتخار بھٹی کی سادہ اچھی تحریر تھی۔ منشی محمد عزیز مئے، للڈن وہاڑی بہت خوبصورتی سے تحریر کیا جو آنکھوں میں آنسو لے آیا۔ فرح انیس نے حکایت بہت سچی پیش کی۔ محمد اسماعیل بروہی کی تحریر بھی پسند آئی۔ مسز ثمینہ سلیم چا کی پیاری تحریر تھی۔ عظمیٰ شکور کی خوبصورت تحریر تھی ندیا مسعود بھی پیاری تحریر لائیں۔ ثانیہ بھٹی نے اچھا لکھا۔ احمد سجاد بابر تحریر شاندار تھی۔ اقبال بانو خوبصورت تحریر لائیں جو واقعی ایک شعلہ تھی۔ جاوید راہی کی تحریر پسند آئی ممتاز احمد خوبصورت تحریر تھی، شمع حفیظ، حمیرا خان اُم عادل تینوں کی تحریریں شاندار تھیں۔ ہم شکل اور زہر عشق بے حد شاندار جا رہے ہیں۔ سچی کہانی کا دل بن گئے ہیں یہ دونوں سلسلے وار ناول۔ اب اجازت۔

☆ اچھی آپا! لیجیے اب کسی کو آپ سے شکایت نہ ہو گی۔ تبصرہ اچھا لگا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ اکوال، تلہ گنگ سے سلیمان شبیر احوال میں شریک ہیں جون کا سچی کہانیاں اس دفعہ 27 مئی کو مل گیا تھا اور سارا رسالہ ختم کر کے آپ کی محبتوں کا جواب دینے بیٹھ گئے ہیں۔ اس ماہ میں تو سچی کہانیاں نے ہمیں ڈبل خوشی دی۔ ایک تو میرا خط شامل احوال ہے اور دوسری 'تیر نیم کش' میں ہمارا بھیجا ہوا شعر شامل تھا۔ اور کاشی بھائی آپ نے جس محبت اور خلوص سے مجھے احوال میں ہر ماہ شامل ہونے کا حکم دیا ہے تو جناب میں آپ کی اس محبت بھرے حکم کا دل کی گہرائیوں سے بجا لاتا ہوں اور انشاء اللہ ہر ماہ کوشش ہو گی احوال میں شامل ہونے کی اور اب آتے ہیں ماہنامہ کی طرف۔ سب سے پہلے منزہ آنٹی کا 'چلو بھر پانی' پڑھا۔ اس کے بعد احوال پورا کا پورا پڑھا جس کی وجہ سے تمام احوالیوں سے ملاقات ہوئی۔ اس دفعہ جو کہانی مجھے سب سے زیادہ پسند آئی، وہ تھی قائد میں شرمندہ ہوں ریحانہ نسیم ویلڈن' دوسرے نمبر پر ٹو کاری نہیں حمیرا خان پتا نہیں کب ہم ان خود ساختہ رسموں سے باہر نکلیں گے۔ اس کے علاوہ تمام کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ آخر میں تمام سچی کہانیاں کے اسٹاف' تمام احوالیوں رائٹر اور تمام سچی کہانیاں پڑھنے والوں کو سلام' ادارے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے دعا گو اور کاشی بھائی کی محبت کا مقروض ہم شکل اور زہر عشق میرے پسندیدہ سلسلے ہیں آئندہ قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

☆ پیارے سلیمان! تمہیں پرچہ پسند آیا' ہماری محنت وصول ہو گئی۔ تبصرہ بہتر ہے۔ اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

✉ چک نمبر 58 شمالی، سرگودھا سے ہمارے دوست لکھاری فیصل ندیم بھٹی غیر حاضری کے بعد دوبارہ شاملِ احوال ہیں۔ لکھتے ہیں گزشتہ ماہ ناسازیٔ طبیعت کے باعث خط نہ لکھ سکا اس بار تو شمارہ 27 مئی کو ہی مل گیا تھا۔ سرورق پر لڑکی منفرد اسٹائل میں دیکھنے کو ملی۔ سب سے پہلے منزہ سہام مرزا صاحبہ کا اداریہ چلو بھر پانی پڑھا، حکمران اور سیاست دانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے خدارا انسانوں پر تو رحم کھالیں۔ احوال میں کافی نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی، تمام نئے احوالیوں کو خوش آمدید جن میں سنبل ناہید' نگین افضل وڑائچ' اے آر راحیلہ' عقیل عادل زادہ' چوہدری پرویز' سلیمان شبیر' ندیم عباس ڈھکو' افتخار بھٹی آپ کیسے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی قید و بند کی صعوبتیں آسان فرمائے۔ مجید احمد جائی' مور شاہد بھیا باجی فریدہ فری کو سلام۔ منعم اصغر خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ باجی مسز نوید ہاشمی صاحبہ میری کہانی کو پسند کرنے کا شکریہ۔ عادل حسین' منشی عزیز مئے ہمیشہ خوش رہیں۔ ثروت شان سچی کہانیاں کے انتخاب پر آپ کو احوال میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ممتاز بھیا کیسے مزاج ہیں، اللہ آپ کو سلامت رکھے آمین۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف، لائف بوائے میری کامیابی تو خوش قسمت ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ پہلی سچ بیانی قائد میں شرمندہ ہوں ریحانہ نسیم کی، تقدیر نے لوٹا مجھے گڈی آپا ماں بھی ساتھ نبھا نا رے، قیصر شاہد، عشق نے مال کیا صبا اقبال' تم میری ہو نجمہ جبیں علیزئی' میرے برادر کی دلہن عظیم الدین انصاری' گلاب لمحے بکھر گئے کنارا مل گیا مجھ کو بابر نایاب' دوسرا ووٹ ڈاکٹر راحیلہ خان' ساجن کی کہانی افتخار بھٹی کی بہت زبردست

جولائی 2015ء

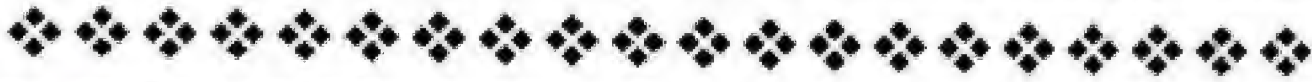
**کوپن برائے احوال**

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: ---------------------------------------------

مکمل پتا: ---------------------------------------------

---------------------------------------------



جولائی 2015ء

**کوپن برائے اشاعت کہانی**

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کریں۔

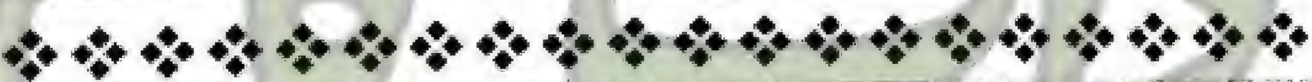
عنوان کہانی: ----------------- تعداد صفحات: -----------------

نام: ---------------------------------------------

مکمل پتا: ---------------------------------------------

---------------------------------------------

فون/سیل نمبر: ---------------------------------------------



جولائی 2015ء

**کوپن برائے پسندیدہ کہانی**

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ----------------- مصنف: -----------------

دوم، عنوان: ----------------- مصنف: -----------------

سوم، عنوان: ----------------- مصنف: -----------------

نام: ----------------- شہر: -----------------

کہانیاں تھیں۔ ہم شکل ایم اے راحت کا سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ یہ آگ کب بجھے گی، منشی عزیز مئے کی کہانی پڑھ کر دہشت گردی کا نشانہ بننے والے غریب ڈرائیور کا بہت افسوس ہوا۔ ہم کب سوچیں گے فرح انیس دکھ سے جڑی کہانی ہے۔ عظمیٰ شکور کی کہانی کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ابتداء کیسے ہوئی اور اختتام کیسا (دوبارہ پڑھ کر دیکھو...... لڑکے) لمحوں کی بھول ممتاز احمد کی کمال کی کہانی ہے۔ چند لمحوں کی بھول میں انسان کتنا سفر دشوار بنا لیتا ہے۔ کاشی بھیا کا ناول زہر عشق جن اور انسان کی محبت کی داستان زبردست ہے۔ تمام اسٹاف کو سلام۔

☆ پیارے فیصل! محبت خود ایک مقناطیس ہے۔ محبت کرنے والے ہی اس کی جانب کھنچتے چلے آتے ہیں۔ امید ہے سمجھ گئے ہو گے۔ طبیعت کیسی ہے اب تمہارے بنا احوال میں کچھ کمی سی تھی۔ امید ہے اب غیر حاضری نہ ہو گی۔ تبصرہ بہترین تھا۔

✉ یاسمین اقبال سنگھ پورہ لاہور سے ہماری احوالی ہیں لکھتی ہیں چھوٹے سے بھائی کاشی کو میرا اسلام ڈھیروں دعائیں اللہ آپ سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے آمین کچھ عرصے سے میرے خطوط ردی کی ٹوکری کی نذر ہو رہے ہیں (سچ میں یہ ہم پر الزام ہے) تصور کی جلالی نگاہوں سے ردی کی ٹوکری کو جب گھور کر دیکھا تو ایسا لگا جیسے کہہ رہی ہو آئندہ میں آپ کے خطوط نہیں کھاؤں گی۔ کیونکہ رمضان کی آمد ہے تو یقیناً کاشی بھائی میرا بھی روزہ رکھوائیں گے۔ تو جناب امید کرتے ہیں اس ماہ تو روزہ کی وجہ سے یقیناً ردی کی ٹوکری کی غذا بننے سے ہمارا خط ضرور بچ جائے گا۔ سب سے پہلے تو سبھی مسلمانوں کو رمضان مبارک ہو اور آنے والی عید کی پیشگی مبارک باد۔ جون کا شمارہ ملا، سبھی کہانیاں انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ لگیں۔ کاشی آپ کے ناول کی ہر قسط کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ بہت خوبصورت اور ہٹ کر لکھا ہے آپ نے، جیتے رہو۔ جون کے شمارے کی سبھی کہانیاں اچھی تھیں مگر اقبال بانو کا مقدمہ خون کا' اُم عادل کی کوا اور سویرا' شمع حفیظ کی چار مہرے کا کھیل بہت اچھی لگیں۔ شاعری کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ فریدہ فری کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ ہم جیسے تو بس شاعری ہی کر سکتے ہیں تو جناب کچھ ہم جیسوں کا ضرور خیال کریں۔ فریدہ فری کی صحت یابی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ اجازت چاہوں گی۔

☆ پیاری یاسمین جی! سلامت رہیے۔ آپ کی آمد ہمارا مان بڑھانے کا سبب ہوتی ہے۔ آپ کا خط آئے اور ہم اُسے شامل احوال نہ کریں آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟ ہم تو خطوط کو اگلے ماہ بھی لگا دیتے ہیں یقیناً یہ سازش پوسٹ آفس والوں کی ہے۔

✉ ساہیوال سے یہ پہلی بار آمد ہے ایم وکیل عامر جٹ کی لکھتے ہیں آج آپ کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں اس امید پر کہ دل سے ویلکم کریں گے سچی کہانیاں دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ انشاء اللہ ہم بھی اس میں لکھیں گے۔ سبھی خوب محنت سے لکھ رہے ہیں۔ شاہد رفیق سہو' ملک ندیم عباس ڈھکو' شمع حفیظ' منعم اصغر' امید ہے آپ اسی طرح لکھتے رہیں گے۔ سبھی رائٹرز سے ریکویسٹ ہے محبتیں بانٹتے رہیں۔ ملک ندیم عباس ڈھکو کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس میں دعوت دی۔ انشاء اللہ باقی باتیں اگلے ماہ، تب تک کے لیے اجازت۔

☆ پیارے ایم وکیل! عامر! جٹ! خوش آمدید اب ہمارا تمہارا ساتھ نہ چھوٹے۔

✉ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے یہ آمد ہے نازش پرنس کی لکھتی ہیں آج آپ کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں آپ بہت اعلیٰ انداز سے سچی کہانیاں کو چلا رہے ہیں اور امید ہے اسی طرح سچی کہانیاں اونچائی کی طرف بڑھتا رہے گا۔ ہم پہلی دفعہ سچی کہانیاں میں انٹری دے رہے ہیں۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ میں ملک کے تقریباً تمام ہی ڈائجسٹوں میں لکھ رہی ہوں۔ اور اپنی بک کے لیے بھی کام کر رہی ہوں۔ ملک ندیم عباس ڈھکو کے شکر گزار ہوں

جنہوں نے ہمیں دعوت دی اور ایم وکیل عامر جٹ کے اصرار پر لکھ رہی ہوں۔ سبھی رائٹرز خوبصورت انداز سے لکھ رہے ہیں۔ سبھی لکھتے رہنا۔ آپ لوگ رائٹرز کو سچی کہانیاں کی طرف گامزن کررہے ہیں۔ آپ سب کو میرا اسلام۔

☆ نازش پرنس صاحبہ! سلامت رہیے خوش آمدید آپ کی آمد اچھی لگی۔ امید ہے جلد کوئی کہانی بھی ہمارے پاس آجائے۔ تاکہ ہم بھی آپ کی تحریر سے سرفراز ہوسکیں۔

✉ کراچی سے یہ آمد ہے اعجاز احمد آرائیں کی لکھتے ہیں بہت معذرت خواہ ہوں کہ حسب وعدہ احوال میں باقاعدگی سے حاضری نہ دے سکا۔ غیر حاضری کی سب سے بڑی وجہ ماہنامہ بزم آرائیاں کے سلسلے میں کچھ مصروفیات تھیں۔ جو کہ ابھی اشاعت کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ بزم آرائیاں کی کاپی بھی آپ کو ارسال کررہا ہوں تاکہ میری غیر حاضری کی معقول وجہ سے آپ بھی آگاہ ہوسکیں اور میں بھی غیر حاضری کے جرمانے سے بچ سکوں۔ بہر حال یہ تو پیشہ وارانہ باتیں تھیں۔ اب اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ ماہِ جون کا سچی کہانیاں ملا' خوبصورت سرورق سے مزین شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ مکمل تو نہیں پڑھ سکا۔ جو پڑھا اس میں سے قائد میں شرمندہ ہوں' تم میری ہو' یہ آگ کب بجھے گی؟' ساجن کی کہانی اور عمر دراز پسند آئیں۔ زہر عشق کامیابی سے جاری ہے۔ ہائیڈ پارک میں چہل پہل لائیں۔ احوال میں نئے آنے والے اور پرانے تمام احباب کو خوش آمدید اور سلام انشاء اللہ جلد دوبارہ حاضری دوں گا۔ نیک دعاؤں کے ساتھ۔

☆ پیارے بھائی! بزم آرائیاں سے آپ اس ماہ جرمانے سے تو بچ گئے مگر اگلے ماہ آپ کا پرچے پر تبصرہ چاہیے۔ ورنہ ہم خود آپ کو طلب کرلیں گے۔ جناح ٹرمینل آنا ہمارے لیے قطعاً مشکل نہ ہوگا۔

✉ ہمارے ایک اور ننھے لکھاری منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے لکھتے ہیں میری طرف سے رمضان المبارک کی سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ اس بار تو بھئی مجھے دو خوشیاں ملی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے گرمیوں کی چھٹیاں مل گئیں اور دوسری...... جلدی بتایئے دوسری کون سی؟ ارے بھئی مجھے نا اس بار سچی کہانیاں 28 تاریخ کو ہی مل گیا۔ اور کہانیاں بھی بہت زیادہ تھیں دل خوش ہوگیا اس بار کیونکہ میں فارغ تھا اس لیے دو دن میں ہی رسالہ ختم کرلیا اور اب بھرپور تبصرہ کررہا ہوں۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے۔ ایم یعقوب' فرح انیس' ممتاز احمد' صائمہ بشیر' سیمیں غزالہ' سدرہ انور علی' محمد ندیم عباس' مجید احمد جائی' مور شاہد' فریدہ فری' سلیمان شبیر' مسز نوید ہاشمی' عادل حسین' عظمیٰ شکور' عارف تبسم' منشی محمد عزیز مئے' ثروت شان' عبدالغفار عابد کے تبصرے لاجواب رہے۔ احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالیوں کو خوش آمدید' سچی کہانیاں میں دن بدن نکھار آتا جارہا ہے۔ فرح انیس' سیمیں غزالہ' سدرہ انور علی' مور شاہد' مسز نوید ہاشمی' عارف تبسم' میری تحریر پسند کرنے کا بے حد شکریہ' غزالہ آپی صائمہ نے طارق کو سدھارنا تھا اور جب عارف خود شرمندہ تھا حالانکہ صائمہ نے اسے کوئی سزا نہیں دلوائی تھی اور ویسے بھی شریف عورتوں کا کام گھر بسانا ہوتا ہے اجاڑنا نہیں۔ بہر حال بہت شکریہ رائے دینے کا۔ کہانیوں میں قائد میں شرمندہ ہوں' تقدیر نے لوٹا مجھے' گلاب لمحے بکھر گئے ہیں اچھی کہانیاں تھیں۔ کنارا مل گیا مجھے اچھی کوشش تھی۔ دوسرا ووٹ اچھی کہانی تھی مگر سمجھ نہیں آئی (دوبارہ پڑھو) ساجن کی کہانی بہترین تخلیق کیا افتخار بھٹی نے۔ یہ آگ کب بجھے گی اور ہم کب سوچیں گے بیسٹ کہانیاں تھیں۔ بہت اچھا لکھا فرح آپی نے۔ بڑے ابا' عشق بے پروا' میرا کالا ہے دلدار' مقدمہ خون کا' بے بی روم' قطرہ قطرہ پگھلا ہوں ایک تھی رابعہ' لمحوں کی بھول' بہت ہی خوبصورت کہانیاں تھیں۔ سیدھی دل میں اتر گئیں۔ چار مہرے کا کھیل میں حارث پر بہت غصہ آیا۔ ٹو کاری نہیں' حمیرا خان نے بہت اچھا لکھا۔ باپ بھائیوں کو اپنی بہنوں پر اعتبار کرنا چاہیے۔ راحیل پر بے حد غصہ آیا اب پچھتانے کا فائدہ؟ کوا اور سویرا بھی اچھی کہانی تھی۔ زہر عشق کے اس بار

# احوال میں شامل ہونے والے نئے احوالی



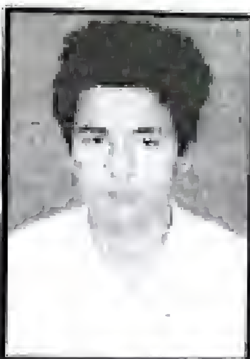
نبیل جاوید، سرگودھا



قربان علی، جسو کے شیلر



عارف شہزاد صادق آباد



اشعر عتیق، کراچی



سلیمان شبیر تلہ گنگ



ایم وکیل عامر جٹ ساہیوال

صفحات زیادہ تھے پھر بھی جلدی ختم ہو گیا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے سب نے بہت محنت کی۔ ہر کہانی اپنی مثال آپ تھی بہت سے بھی بہت مزہ آیا۔ اس بار ہم شکل کی قسط بھی بہت پسند آئی۔

☆ پیارے منعم! تبصرہ شاندار کیا تم نے...... باقی رہی کہانیوں کی بات تو وہ تم کو فون پر بتا دی تھی۔ خوش رہو۔

✉ جسو کے شیلر، حجرہ شاہ مقیم اوکاڑہ سے یہ پہلی بار آمد ہے قربان علی کی لکھتے ہیں السلام علیکم! ماہ جون کا شمارہ ملا پڑھ کر بہت مزہ آیا سب کی اسٹوریاں کمال تھیں ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر محنت کی ہوئی تھی۔ میں پہلی بار سچی کہانیاں میں لکھ رہا ہوں۔ امید ہے نا امید نہیں کریں گے۔ یہ رسالہ بہت کمال کا ہے۔ کاشی بھائی میں آپ کو بتا دوں کہ میں یہ رسالہ اپنے پیارے چھوٹے بھائی جیسے کزن یاسر کی وجہ سے پڑھ رہا ہوں اور اس بار احوال میں حاضر بھی ہوا ہوں۔ سنا تھا کہ آپ نئے لکھنے والوں کو بہت اچھے طریقے سے ویلکم کرتے ہیں (مطلب!!!) چلو دیکھ لیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ بھائی آج کل تو یہ رسالہ بڑے عروج پر جا رہا ہے، جس میں بڑے بڑے رائٹر شامل ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ سر پلیز مہربانی میرا لیٹر احوال میں شامل کر لیجیے گا۔ آخر میں میرے کزن لوگوں سے وسیم، سرفراز اینڈ شعیب پلیز دیکھو میں نے بھی لکھنا شروع کر دیا ہے آپ بھی لکھو۔

☆ پیارے قربان! تمہاری سادگی پر قربان اور پھر خوش آمدید! یہ بتاؤ اب خود تبصرہ لکھو گے یا بیچارے ہمارے معصوم یاسر کو تنگ کرو گے۔ اور ہاں سچی کہانیاں تمہارا اپنا پرچہ ہے۔ تمہارے لیے اس کے دروازے ہمیشہ سے کھلے تھے مگر تم نے آنے میں دیر کر دی۔ مگر ساتھ نہ چھوٹے۔

✉ یہ آمد ہے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور کی اسلام آباد سے، لکھتی ہیں کیسے ہیں سر، بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔ جی جی سمجھ گئی ہیں رمضان مبارک کی برکتیں، رحمتیں جو سمیٹ رہے ہیں تو میری طرف سے بھی رمضان کریم کی مبارک قبول فرمائیں۔ ایک بات تو بتائیں...... لفظوں کا ذخیرہ کہاں چھپا رکھا ہے۔ جناب احوال میں آپ کے احساسات جذبات خیالات بولتے ہیں۔ کمال ہے صاحب۔ ہمیں بھی کچھ سکھا دیجیے پلیز۔ جون کی چل چلاتی دھوپ میں زبردست سا سچی کہانیاں ملا سرورق پر ماڈل کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آئیں۔ پھر منزہ سہام کے خیالات پڑھے۔ کتنا سچ بولتی ہیں اُف اُس زمین کی نہیں لگتی پلوٹو یا عطارد سے شفٹ ہوئی لگتی ہیں۔ احوال میں سب سے ملاقات ہوئی بہت اچھا لگا۔ بات سنیں ایڈیٹر صاحب! اس بار کہانیاں کچھ الگ سی تھیں۔ میرے برادر کی دلہن عظیم الدین انصاری صاحب کہانی کوئی تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ایک لڑکی کی بیوفائی اور بہن کی وفا۔ کوشش جاری رکھیں۔ عشق نے پامال کیا صبا اقبال اچھا لکھا آپ نے اور شکر ہے اُسے اندھیروں سے نکال کر اُس کی شادی کرا دی، بہت شکریہ ورنہ دل دکھتا۔ ما نجھی ساتھ نبھانا رے۔ جی بالکل قیصر شاہد خوب ساتھ نبھایا آپ نے لڑکی کا۔ اس کو منزل دے دی۔ اُف، اُف کیا کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس قدر محبت عزت قائد سے واہ جی کمال ہے قائد میں

شرمندہ ہوں اچھا لکھا ریحانہ نسیم صاحبہ' ایسا محبت وطن بھی کوئی ہوسکتا ہے، ہم تو اب تک حیرتوں کے سمندر میں موجزن ہیں۔ تقدیر نے لوٹا ہے مجھے اس اسٹوری میں گڈی آپا نے ماما کے جذبے کو بیان کیا ہے۔ ہائے چمن اعوان صاحبہ آپ نے سچ ہی تو کہا مرد بے وفا ہے۔ واقعی عورت سب قربان بھی کردے مگر مرد ذات بے وفا ہے گلاب لمحے واقعی تو بکھر گئے جب اعتماد ختم تو سب ختم پھر محبتیں نہیں دیتیں بس سمجھوتے رہ جایا کرتے ہیں۔ کنارا مل گیا مجھ کو بابر نایاب کچھ افسانوی سا تاثر نہیں تھا اسٹوری میں' وہ ملی۔ شادی ہوئی پھر سب بدل گیا دنیا حسین ہوگئی۔ نہ سماج ظالم بنا نہ کوئی دنگا نہ فساد۔ چلیں جی مان لیتے ہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ ثانیہ بھٹی زبردست سچویشن بارش' ایکسیڈنٹ اور ہیرو کا لڑکی کو بچالینا اور پھر لڑکی کا لڑکے کو شادی کی پیش کش واہ گڈ...... میرا کالا ہے دلدار' چلیں جی بریک ٹائم۔ چپس وغیرہ نکالیں اب...... جن کا روزہ نہیں۔ ''بے بی روم' صدف آصف کی لکھی اسٹوری۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے بہت سے ننھے بچے آس پاس رو رہے ہیں یعنی کہ ہم اُس ڈے کیئر سینٹر میں رہے جب تک اسٹوری نہ ختم ہوئی۔ ہائیڈ پارک میں موت' یاسر کی کا مرسلہ دم والا تھا۔ کبھی شعر بھی اچھے لگے۔ مجموعی طور پر اے ون رسالہ ہے سچی کہانیاں سو پڑھ ڈالا اچھا جی چلتی ہوں۔ افطاری بھی تو بنانی ہے۔ دعائیں پیار سب کے لیے۔

☆ بہت عزیز عظمیٰ شکور! دیکھیے آپ کے تبصرے کی جگہ رکھی تھی۔ اسی طرح آپ کی آمد کا بھی انتظار رہتا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✉ یہ آمد ہے احوال میں ہماری پیاری بہن فرخندہ بتول کی رحیم یار خان سے' لکھتی ہیں پیارے کاشی بھیا اسلام وعلیکم! سب سے پہلے تو میری طرف سے آپ کو اور سچی کہانیوں کے تمام اسٹاف کو ایڈوانس عید مبارک او ہو قارئین ناراض نہ ہو آپ سب کو بھی میری طرف سے ایڈوانس عید مبارک سچی کہانیاں چار تاریخ کو مجھ تک پہنچا۔ آتے ہی میری کزنز نے پوری طرح پڑھ پڑھ کر چاٹ ڈالا۔ بقول ان کے کہ انہیں سچی کہانیوں کی ہر کہانی زبانی رٹ جاتی ہے حالانکہ اپنی کلاس کا سبق اتنی جلد یاد نہیں ہوتا خیر چلو کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے سلسلے وار کہانیاں پڑھیں۔ دونوں اچھی طرح آگے بڑھ رہی ہیں۔ دل کرتا ہے پڑھتی جاؤں، کبھی ختم نہ ہوں۔ اگلے ماہ تک کا انتظار کسی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ باقی سب کہانیوں میں سب سے اچھی مجھے مقدمہ خون کا لگی۔ جبکہ چار مہرے کا کھیل دوسرے اور قائد میں شرمندہ ہوں۔ تیسرے نمبر پر رہی۔ احوال میں سب سے اچھا تبصرہ سدرہ انور علی کا لگا۔ باقی سب بھی اچھے تھے۔ تابندہ سہام آپی کی سچی کہانیوں میں تصویر دیکھی۔ تابندہ آپی کو نئی زندگی میں قدم رکھنے پر بہت بہت مبارکباد بھیا میں نے آپ کو ماں کی روح کہانی بھیجی تھی کیا آپ کو مل گئی۔ ایک اور کہانی احساس گناہ' بھیج رہی ہوں۔ اب تو نا قابل اشاعت کے الفاظ سے ڈر لگتا ہے۔ خیر مجھے ضرور بتایئے گا کہ میری کہانی قابل اشاعت ہے کہ نہیں ہاں ایک اور بات کیا ایک ہی کوپن پر دو کہانیاں بھیج سکتے ہیں۔ جواب ضرور دیں اب اجازت دیں اس دعا کہ ساتھ کہ آپ کی عید بہت اچھی گزرے۔ اگلے ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

☆ پیاری فرخندہ! تبصرہ بہت لیٹ ملا۔ خیر اگلے ماہ کوشش کرنا جلد ارسال کردو۔ ایک کوپن پر ایک ہی کہانی بھجوائی جاسکتی ہے۔

لیجیے ساتھیو! مترو! متھو! پیارو! اس ماہ کا احوال اپنے اختتام کو پہنچا۔

سب کو ماہِ رمضان اور اس کا انعام' عید الفطر' مبارک ہو۔

انشاء اللہ زندگی رہی تو اگلے ماہ پھر ان ہی صفحات پر آپ کے روبرو ہوں گے۔ تب تک کے لیے اجازت۔

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

نمایاں شخصیات، سچے واقعات

# ریحام خان



احمد سجاد بابر

## ایک پرکشش، پُراسرار اپسرا

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے، آپ نے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہمیں انٹرویو دیا ہے۔"

طرحدار، خوبصورت، معصوم خدوخال والی اینکر نے اپنے مہمان پر پہلا ہی سوال اس بے تکلفی سے جڑا کہ مہمان کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ پانی کے سینے پر لہر کی مانند اٹھی اور لہر کی مانند فوراً ہی دم بھی توڑ گئی، مہمان نے سنبھل کر کہا

"میرا خیال ہے آپ نے صحیح طرح پوچھا نہیں ہو گا۔"

چلیں ٹھیک ہے، ہوسکتا ہے، ہم سے کوئی غفلت ہوگئی ہو، لیکن اگر اتنی ہی رفتار رہی تبدیلی آنے کی تو کیا جو تبدیلی پرامس کی گئی ہے، وہ تبدیلی بھی یونہی خراماں خراماں آئے گی۔"

نیوی بلو کلر میں ملبوس شوخ اینکر خاتون، جو اپنی عمر سے بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی، نے لبوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے رسان سے کہا۔ خاتون بہت ہی پُراعتماد تھی۔ اس نے سفید دوپٹہ ایک پٹی کی شکل میں تہہ کر کے محض بائیں کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔ اس کی Steps میں بنی ہوئی زلفیں گردن تک ہی چہرے کا احاطہ کر رہی تھیں، دائیں ہاتھ میں قلم تھامے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، سوال کرتے ہوئے اس کے چہرے پر تدبر اور سنجیدگی بکھر جاتی۔ فتح کر لینے والا انداز اور مسحور کر لینے والی شخصیت اس کے بڑے ہتھیار تھے۔ مہمان واضح طور پر متاثر نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ اعتماد بی بی سی جیسے بڑے نشریاتی ادارے میں 'موسم کا حال' سناتے رہنے کی وجہ سے آیا تھا، 'ویدر گرل' کے طور پر جانی جانے والی حسین خاتون اب پاکستان کے میڈیا کو اپنے حسن اور ٹیلنٹ کی چمک سے خیرہ کر رہی تھی۔

آج کے اس پروگرام کی اینکر پرن انگلینڈ پلٹ "ریحام خان" اور مہمان کرکٹ کی دنیا کے کامیاب کپتان، ورلڈ کلاس آل راؤنڈر، شوکت خانم کینسر ہاسپٹل کے بانی اور پاکستان تحریک انصاف کے بانی عمران خان تھے، جو عالمگیر شہرت کے حامل تھے!!

☆......☆......☆

"اٹس ٹو مچ، تمہیں کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہی ہو گا اب...... یا فیملی لائف یا پھر میڈیا لائف"

مرد نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر غیض و غضب جیسے ثبت ہو گیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے یہ میرا جنون ہے۔ میں اپنا کیریئر داؤ پر نہیں لگا سکتی۔"

عورت نے سنبھل کر جواب دیا، اس کے خوبصورت نقوش میں مشرقی جاذبیت جھلک رہی تھی، اردو بولنے کا انداز اسے انگلش سپیکنگ ظاہر کر رہا تھا، یہ اس وجیہہ مرد کی بیوی تھی جس کی پرورش مغربی معاشرے میں ہوئی تھی۔ اس لمحے اس کے دل و دماغ میں اپنے والد کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''ہمیشہ وہ کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔ غلط یا درست بعد کا مسئلہ ہے۔''

''یعنی تم اس چمک دمک کی خاطر، اس گلیمر کی چاہ میں اپنا گھر قربان کر دو گی؟ تین بچوں کی ماں ہو تم، ذرا بھی افسوس نہیں ہو رہا تمہیں اس فیصلے پر......''

مرد کی آنکھوں اور لہجے سے بے اعتباری جھلک رہی تھی۔

''تمہیں افسوس کیوں نہیں ہوا جب تم نے میری ازدواجی زندگی کا وار کر کے مجھے مجبور کرنے کا سوچا۔ بہر حال یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔ میں کوئی دیہات کی ان پڑھ جاہل عورت نہیں جو تمہاری محتاج ہوں گی۔''

عورت نے برف جیسے لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر کو جانے لگی

''ایک بات اور...... یہ فیصلہ بابا جان کا بھی ہے، اس لیے یہ مت سمجھنا کہ یہ گیدڑ بھبھکی ہے۔''

مرد نے دو ٹوک انداز میں اس کی پشت کو گھورا۔

''مجھے ہر تاوان دینا منظور ہے مگر میں میڈیا جاب نہیں چھوڑ سکتی...... اٹس فائنل''

اس نے پہاڑوں کی سی سختی سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

یہ خوبصورت اور گلیمرس خاتون ریحام خان تھی جو نئی منزلوں کا انتخاب کر رہی تھی اور اس کا مخاطب اس کا شوہر، اس کا پھوپی زاد، اس کے تین بچوں کا باپ اعجاز الرحمن تھا۔!!

☆......☆......☆

اس کے والد نے تو جانے کب سے ''خان'' اپنے نام کے ساتھ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت ترقی پسند تھے اور لسانی، صوبائی، علاقائی تعصبات سے آزاد تھے۔ اس کی پرورش مغربی انداز میں ہوئی، اس نے اپنی جڑوں کو خود تلاشنا شروع کیا، زندگی کو اپنی مرضی سے گزارا، یہ اعتماد اسے اس کے والد نے دیا کہ زندگی ایسے جیو جیسے تم چاہتے ہو، غلط یا درست تو بعد کی بات ہے، مثال کے طور پر گھر میں کبھی پاکستانی کھانا نہیں پکتا تھا، اس نے پراٹھا، آلو گوشت وغیرہ کبھی نہیں دیکھا ہوا تھا، والد صاحب سرجن تھے تو گھر میں بڑا بورنگ قسم کا کھانا بنتا تھا، جس میں مرچ، ادرک، لہسن وغیرہ کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پیدائش پاکستان کی نہیں، وہ رشتوں کو ترسی تو اسے رشتوں کی قدر ہوئی، اس نے بہن بھائیوں کے رشتوں کو انجوائے نہیں کیا کیونکہ وہ اس سے کافی بڑے تھے، دادا دادی، نانا نانی، کزن وغیرہ جیسے رشتے بھی اس کی زندگی میں نہیں رہے، اس وجہ سے اس کا خواب جوائنٹ فیملی سسٹم اور بھرا پرا گھر تھا......!!!!

اپنے کیریئر کی ابتدا میں چونکہ وہ ابھی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی اور سفر سب سے بڑا چیلنج تھا' صبح کلاس اٹینڈ کر کے ہر شام 2 گھنٹے ڈرائیو کر کے لائیو شو کے لیے جانا پڑتا تھا اور ایک سال میں 1 لاکھ سے زیادہ میل کا سفر طے کیا۔ یہ سب سے بڑی پرابلم تھی مگر اس نے اسے خود پر حاوی نہیں ہونے دیا اور اپنے مشن کی طرف بڑھتی رہی۔ ویسے اب جب وہ مسلسل سفر اسے یاد آتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے کہ اس نے ہمت نہیں ہاری۔

وہ اگر اینکر نہ ہوتی تو ایک ٹیچر ہوتی۔ اسے مطالعہ کا ذوق بھی تھا، پہلے فکشن اور بعد میں ''آپ بیتیاں'' اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس نے ساری عمر سفید فاموں سے بھرے علاقوں میں گزاری۔ بچپن بہت اچھا گزرا 'والدین کی بھرپور توجہ ملی' پیدائش بیرون ملک ہوئی اس لیے قرآن اور اردو زبان خود والدہ نے گھر میں ہی سکھائی۔ اس نے کیریئر کا آغاز لیگل ٹی وی سے کیا اور اس وقت وہ پوسٹ گریجویٹ براڈ کاسٹ جرنلزم پڑھ رہی تھی وہاں پر ہی بحیثیت اینکر اور سینئر پروڈیوسر بہت کامیابی ملی۔ شاہ رخ خان کے ساتھ کمرشل شوٹ کیا، جس کی وجہ سے ایشین ناظرین میں بھی مقبولیت بڑھی۔ جوں جوں آپ کی پہچان بنتی جاتی ہے آپ کا کام میں دل اسی قدر زیادہ لگتا جاتا ہے اور آپ کے سیکھنے کی لگن بھی رفتار پکڑ لیتی ہے۔ اس ساتھ بھی یہی ہوا' شوق پہلے سے

ہی کافی تھا مگر جب لوگوں کی طرف سے عزت ملنا شروع ہوئی اور لوگوں نے اس کے کام کو سراہا تو بہت حوصلہ ملا۔

وہ کلاس سسٹم کے تفاخر کے خلاف تھی، اس نے انگلینڈ میں بھی ان علاقوں سے اپنے کیریر کا آغاز کیا جو محرومی کا شکار تھے، وہ تو برقع کے بھی خلاف نہیں تھی، اس کے خیال میں برقع اتنا بڑا مسئلہ نہیں جتنا مغرب اس کو پیش کرتا ہے، اس سے بڑی برائیاں موجود ہیں جن سے نبٹنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔ خواتین کی آزادی سے اتنے خطرات نہیں جتنا ہمارا معاشرہ سوچتا ہے کیونکہ عورت اپنے کلچر سے زیادہ مضبوطی سے جڑی ہوتی ہے۔ وہ جتنی مرتبہ بھی پاکستان آئی تو اسے پاکستانی کلچر متاثر نہ کرسکا، کچھ ایسے تلخ واقعات ہوئے، کچھ ایسے مناظر دیکھے کہ وہ پاکستانی کلچر کے قریب نہ آسکی، اس نے کبھی پاکستان آنے کا نہیں سوچا تھا۔ اس کے لیے شاید یہ سب سے بڑی سزا ہوتی کہ وہ پاکستان آتی، مگر پھر اسے پاکستان آنا پڑا۔ کسی کی مدد کے لیے وہ پاکستان آئی مگر اب شاید اس شخص کو مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کچھ گھریلو مسائل تھے جن کی وجہ سے وہ یہاں آئی۔ پاکستانی میڈیا کو جوائن کرنے کی ایک بڑی وجہ اس کی والدہ تھیں' والد کی وفات کے بعد اس نے سوچا کہ والدہ کے پاس رہنا زیادہ موزوں ہوگا اور اس وقت پاکستان تاریخ کے جس موڑ پر کھڑا ہے یہاں پر بحیثیت صحافی تاریخ کا حصہ بننے کے مترادف ہے۔ اسے بہت سارے چینلز سے آفرز تھیں لیکن اس نے 'نیوز ون ٹی وی' کا انتخاب کیا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی 'سی۔ ای۔ او' سیما طاہر سے بہت متاثر ہوئی۔

ریحام خان کے نزدیک پاکستان میں زیادہ بڑا مسئلہ منافقت ہے، وہ کہتی ہے کہ اگر آپ چادر اوڑھ کر اور دروازہ بند کر کے ایسے کام کریں جو کہ گورے بھی کبھی نہ کریں تو اس کے خیال میں سکرٹ پہن کر باہر گھومنا پھرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ آپ خود کو ویسا ہی پیش کر رہے ہیں جیسے آپ ہیں۔ اگر ہاتھ میں تسبیح ہے مگر کام منشیات کا ہے، گھر میں پندرہ عورتیں رکھی ہوئی ہیں، لوگوں کے گھرانے آپ تباہ کر رہے ہیں، تو کم سے کم مغربی کلچر میں یہ تو نہیں ہے نا۔ صرف مسلمان نام رکھ لینا یا مسلمان گھرانے میں پیدا ہو جانا مسلمان ہونے کی گارنٹی نہیں۔



ریحام خان کی عمران خان سے انٹرویو کے دوران پہلی ملاقات کا منظر

اللہ نے اسے بہت کامیابیاں عطا کیں، بی بی سی نے اسے خود جاب آفر کی، اپنی پسند کی جگہ پر اسے رکھا، اس نے "سینئر براڈ کاسٹ جرنلسٹ" کی پوسٹ سے استعفیٰ دیا، یہ سب کچھ جو ملا، اس میں وہ اپنا کمال نہیں سمجھتی، یہ سب اللہ کی طرف سے تھا۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس پر اللہ کا بے حد کرم رہا ہے، پھر وہ کیوں نہ اپنے مالک کا شکر ادا کرتی، اور شکر کا بہترین طریقہ زندگی میں کچھ اچھا کر جانا ہے۔ پاکستان سے اسے اتنا پیار، اتنی محبت ملی کہ وہ جو چھ ماہ کے لیے آئی تھی، واپس نہ جاسکی۔

ریحام خان کا تجزیہ ہے کہ بحیثیت قوم ہمیں گپ شپ لگانے کا بہت شوق ہے اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ٹاک شوز اتنے زیادہ مشہور ہیں۔ ریحام کے خیال میں ہمارے ہاں لوگوں کو باتیں کرنے اور اپنے نظریات شیئر کرنے کا بہت شوق ہے۔ معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ ٹیلی وژن ہے اور پھر ٹاک شوز کو لوگ ملکی حالات

اور سیاستدانوں کے آپس میں تکرار کی وجہ سے بہت توجہ سے سنتے ہیں۔ آپ کسی بھی جگہ دیکھ لیں جہاں پر بھی تین چار لوگ اکٹھے ہوں گے وہ ملکی حالات اور حکومتی کارکردگی کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔

☆......☆......☆

ریحام خان پر یہ بات صادق آتی ہے کہ ''وہ آئی، اس نے دیکھا اور فتح کرلیا''۔ ریحام خان لیبیا میں پیدا ہوئیں اور زیادہ تر تعلیم برطانیہ میں حاصل کی۔ انہوں نے اپنی صحافتی کیریئر کا آغاز بی بی سی سے کیا۔ 2013 میں الیکشن کوریج کے لیے ریحام نے نیوزون کو جوائن کیا۔ اینکر پرسن اور اب کپتان خان کی اہلیہ ریحام خان کچھ عرصہ قبل انگلینڈ سے پاکستان منتقل ہوئیں اور دھرنے کے دوران ان کی عمران خان سے قربت بڑھنے لگی۔ ریحام خان مانسہرہ کے رہائشی ڈاکٹر نیئر رمضان کی بڑی بیٹی ہیں، ان کی پیدائش والد کی لیبیا میں ملازمت کے دوران 4 اپریل 1971 کو ہوئی تھی، ریحام خان کا پہلا نکاح 23 جولائی 1992 کو ایبٹ آباد میں پھوپی زاد کزن ڈاکٹر اعجاز الرحمان سے ہوا، ریحام خان کے شعبہ صحافت سے منسلک ہونے کے بعد ان کے سسر اور شوہر سے شدید اختلافات پیدا ہوگئے تھے جس کی بنا پر ان کی علیحدگی ہوئی، وہ ایک مدت تک بی بی سی لندن سے بھی منسلک رہیں اور موسم کا حال سناتی رہی ہیں۔

ریحام خان کے سابق شوہر سے تین بچے ہیں جو انگلینڈ میں والد کے پاس رہتے ہیں، ان کے بائیس سالہ بیٹے کا نام ساحر جب کہ دو بیٹیوں کے نام ردا اور عنایہ ہیں۔ ساحر رحمٰن 1993ء میں پیدا ہوا، ردا رحمٰن 1997ء میں اور عنایا رحمٰن 2003ء میں پیدا ہوئی۔ سابق گورنر و چیف جسٹس عبدالحکیم خان بھی ریحام خان کے چچا ہیں۔ ریحام خان کی پہلے شوہر ڈاکٹر اعجاز الرحمان سے شادی اور طلاق سے متعلق کاغذات بھی سامنے آگئے تھے، پہلے نکاح کے وقت ریحام خان کی عمر اٹھارہ سال تھی جبکہ ان کی علیحدگی 13 دسمبر 2006 کو ہوئی۔ پہلے نکاح کے گواہان میں غلام جیلانی سکنہ چنی گٹی مانسہرہ اور مفتی محمد ادریس سکنہ مفتی آباد مانسہرہ تھے۔ ذرائع کے مطابق ریحام خان کی پہلی شادی کا حق مہر ایک لاکھ روپے مقرر کیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

دنیا بھر کے میڈیا میں چہ میگوئیاں تو پہلے سے ہی جاری تھیں۔ عمران خان پر دنیا بھر کے کیمرے فوکس تھے کیونکہ 15 اگست سے جاری اسلام آباد دھرنا اپنے عروج پر تھا، عمران خان شادی کا اعلان بھی کر چکے تھے۔ 'کون ہوگی عمران خان کی اہلیہ' یہ سوال ہر کسی کے ذہنوں پر دستک دے رہا تھا۔ 16 دسمبر کو سانحہ پشاور کا غم کلیجے نوچ رہا تھا۔ جب اچانک ''ریحام خان، ریحام خان'' کی تکرار نے دنیا بھر کو گرفت میں لے لیا تھا، ہر کوئی اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اس کے بی۔ بی۔ سی کے کلپس ڈاؤن لوڈ کیے جا رہے تھے، عمران خان کی طرف سے مسلسل خاموشی تھی۔ عمران خان نے دھرنے کے شرکا سے خطاب میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ نیا پاکستان بننے کے بعد شادی کرنا چاہتے ہیں۔

پھر اچانک دھماکہ ہوا، عمران خان کی جانب سے ریحام سے شادی کا اعتراف کرلیا گیا، ظاہر یہی کیا گیا کہ شادی ابھی ہوئی نہیں ہے، عمران خان اور ریحام خان کی رسم نکاح 8 جنوری کو بنی گالہ میں عمران خان کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ پاکستان تحریک انصاف کی سیکریٹری اطلاعات نے سماجی رابطے کی ویب سائٹ ٹوئٹر پر اپنے پیغام میں عمران خان کے نکاح کی تصدیق کی۔

انھوں نے کہا کہ شادی یا ولیمے کی تقریبات منعقد نہیں ہوں گی، کل غریب بچوں میں کھانا تقسیم کیا جائے گا۔

شادی میں عمران خان کی چاروں بہنوں نے شرکت نہیں کی۔ عمران خان کا خاندان نہیں چاہتا تھا کہ کپتان ریحام خان سے شادی کرے جبکہ تحریک انصاف کے قائدین بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ عمران خان کی بہن علیمہ خان نے برطانوی میڈیا سے بات کرتے ہوئے واضح طور پر مایوسی اور غصے کا اظہار کیا کہ ریحام اب ان کی بھابی ہے، جبکہ انہوں نے یہ تک کہہ ڈالا کہ وہ اور ان کا خاندان ریحام سے ملنا نہیں چاہتے۔ عمران خان کے خاندان کے ذہن میں کسی کونے میں یہ بات بھی چھپی ہوگی کہ آیا ریحام، عمران خان کو سیڑھی بنا کر خود

اپنے لیے دولت، شہرت اور سیاست کے نئے افق دریافت کرنا چاہتی ہیں۔

عمران خان اور ریحام خان کا نکاح پڑھانے والے مفتی سعید نے تقریب کے بعد میڈیا سے مختصر گفتگو میں بتایا کہ نکاح کے گواہان میں عمران خان کی جانب سے ذاکر خان، جبکہ ریحام کی جانب سے ان کے عزیز سیف خان موجود تھے۔ تاہم اس تقریب میں کوئی سیاسی شخصیت موجود نہیں تھی۔ انھوں نے کہا کہ حق مہر ایک

ہیں۔"

ریحام خان نے مزید کہا "ہمارے لیے سب سے زیادہ بچوں کی اہمیت ہے، ہم دونوں میں اپنے بچوں کا خیال رکھنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا مشترک ہے، گھر میں میرا کردار ماحول کو اچھا رکھنا ہوگا تا کہ گھر کا ماحول خوشگوار رہے جب کہ مجھے سیاست میں کوئی خاص دلچسپی نہیں میں اپنا کام اور پروگرام جاری رکھنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ عمران خان نے کبھی میرے کام پر اعتراض نہیں کیا



ریحام خان اپنے سابق شوہر اور عمران خان اپنی سابقہ اہلیہ کے ہمراہ

لاکھ روپے مقرر کیا گیا ہے۔

اپنی رہائش گاہ "بنی گالا" میں شادی کے بعد پہلا انٹرویو دیتے ہوئے عمران خان نے کہا۔

"جب میں نے ریحام خان کے بچوں کو دیکھا تو میں نے ان سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی شادی کا فیصلہ کرنے کے لیے مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔"

ریحام خان نے کہا۔

"عمران خان عام پاکستانی مردوں سے بہت مختلف ہیں۔ وہ سادہ طبیعت اور بہت رحم دل شخص ہونے کے ساتھ بہترین افراد میں بھی بہتر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عمران خان نے مجھے پرپوز کیا اور شادی کی پیش کش کی جب کہ میں ان کی شخصیت سے اتنی متاثر تھی کہ شادی سے انکار نہیں کر سکی، میں اپنے بچوں کے لیے رول ماڈل چاہتی تھی اور عمران خان تمام والدین کے لیے رول ماڈل

اور نہ میں ان کے کام میں مداخلت کرتی ہوں۔ ذاتی زندگی میں صحافت اور سیاست کو دور رکھنے کا ارادہ ہے۔"

عمران خان کا کہنا تھا کہ شادی میں بہت سارے دوستوں کو دعوت دینا چاہتا تھا، تاہم ایسا نہیں ہوا۔ ہم نے سادگی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ پشاور حملے کے بعد عالیشان طریقے سے شادی کرنا مناسب نہیں تھا، اسی وجہ سے ہم نے سادگی سے شادی کا فیصلہ کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے پہلی شادی میں بھی سابقہ اہلیہ جمائمہ کے والدین سے کہا تھا کہ دھوم دھام سے شادی کرنے میں پیسے ضائع نہ کریں۔

عمران خان کا کہنا تھا کہ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا غم میری طلاق تھی کیونکہ اس کی وجہ سے میرے بچے مجھ سے دور ہو گئے تھے، اگر میں ان کے چھوٹے ہوتے شادی کرتا تو ان کو بہت زیادہ دکھ ہوتا۔ جبکہ ریحام خان کا کہنا تھا کہ میں نے جو بھی فیصلہ لیا ہے اپنے بچوں

کے بہتری کے لیے لیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے اور عمران کے بچے ایک ہی عمر کے ہیں۔

بچوں کے حوالے سے سوال پر ریحام نے مسکراتے ہوئے کہا

''ہمیں یہی بچے کافی ہیں اور ویسے بھی ہم کرکٹ تو کھیلتے نہیں ہیں تو ہمیں کوئی کرکٹ ٹیم تو نہیں بنانی''

ایک انٹرویو کے دوران جب ریحام خان سے یہ پوچھا گیا کہ انہیں عمران خان نے کیسے پروپوز کیا تھا؟ تو انہوں نے کہا

''عمران نے مجھے انتہائی شائستگی سے شادی کی پیشکش کی تھی، انہوں نے مجھے پروپوز کیا اور کہا کہ میں استخارہ کر رہا ہوں اور اس کے بعد ہم شادی کریں گے''

عمران خان کا کہنا تھا کہ میرے لیے شادی کا فیصلہ مشکل تھا کیونکہ بچے چھوٹے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ایک خاندانی نظام ہوتا ہے جس میں تمام بچے ایک ساتھ بڑے ہوتے ہیں مگر برطانیہ میں صورتحال بہت مختلف ہوتی ہے وہاں آپ کو اپنے بچے اکیلے ہی پالنا ہوتے ہیں اور پھر اگر آپ کی طلاق ہو جاتی ہے تو اس صورتحال میں تین بچے پالنا بڑا مشکل کام ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جب میں نے ریحام کا کام دیکھا تو یہ دوسری وجہ تھی کہ میں ان کو پسند کرتا۔

عمران خان نے کہا کہ میری عمر 62 سال ہے مجھے اپنی شادی کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، جس پر ریحام کا کہنا تھا کہ لوگوں کی باتوں سے ڈر کر اور تنقید سے گھبرا کر پیچھے ہٹنے والی نہیں، میں نے جس شخص کو چنا وہ ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہیں اور میرے اوپر کوئی اتنی بڑی ذمہ داری نہیں کہ میں گھبرا جاؤں۔

شادی کے تحفے کے حوالے سے ریحام کا کہنا تھا کہ میں نے فی الحال خان صاحب سے یہی تحفہ مانگا ہے کہ ہر ہفتے یا کم از کم مہینے میں ایک یا دو دفعہ پشاور ضرور لے جایا کریں۔

ایک سوال پر انہوں نے کہا کہ عزت اور کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، میں نے صاف دل سے شادی کی ہے اور ریحام کی خوبیوں کو دیکھ کر ہی شادی کا فیصلہ کیا ہے، مجھے اس بات کی فکر نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے میں نے اپنے اللہ کو جواب دینا ہے ریحام خان سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ عمران خان نے کہا کہ میرا فوری طور پر شادی کا ارادہ نہیں تھا تاہم میڈیا پر خبریں چلنے کے بعد شادی جلدی کرنا پڑی۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ مجھے تحفے دینا چاہتے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ شوکت خانم اسپتال پشاور کے لیے فنڈ دیں۔

☆......☆......☆

ریحام خان سے شادی کا اعلان زلزلے کی طرح ہر شے کو تہ و بالا کر گیا، میڈیا پر ریحام خان کی زندگی کے آئے روز نئے نئے پہلو سامنے آتے رہے، برطانوی اخبار 'ڈیلی میل'' ریحام خان کی زندگی کا متنازعہ ترین پہلو سامنے لے آیا۔ جس کے بعد ریحام خان کو تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک ویڈیو کلپ میں ریحام خان کو ناپاک جانور (سور) کو پکڑ کر پکاتے دکھایا گیا جس کے منظر عام پر آنے کے بعد ریحام خان سے متعلقہ نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ فوٹیج 2011ء کی ہے جب ریحام خان بی بی سی کے ساتھ کام کر رہی تھی اور انہیں مذکورہ ''ڈش'' فروخت کرنیوالے ایک اسٹال پر کھڑے دکھایا گیا۔ ویڈیو میں دیکھا گیا ہے کہ متنازع جانور کی ڈش پکانے میں مہارت رکھنے پر دو مرتبہ ایوارڈ حاصل کرنیوالا ڈیوڈ بیل ساتھ کھڑا ہے جو ریحام خان کو پکانے کا بہترین طریقہ بتا رہا ہے۔ مسٹر بیل کا کہنا تھا کہ انہیں اس تنازعہ کی سمجھ نہیں آرہی حالانکہ ریحام خان نے میلے میں 'ڈش' کھائی ہی نہیں تھی۔ رپورٹ کے مطابق ان دنوں متنازع مذکورہ ویڈیو انٹرنیٹ پر تیزی سے گردش کر رہی ہے اور پاکستان میں بھی دھوم مچا رکھی ہے۔ جہاں ناپاک جانور کا نام لینا یا چھونا بھی اچھا تصور نہیں کیا جاتا۔ برطانوی اخبار نے لکھا کہ ریحام خان سے خفیہ شادی کے بعد عمران خان کے لیے بھی آئے روز نئے نئے تنازعات کھڑے ہو رہے ہیں۔

ریحام خان کا بولڈ ماضی بھی وجہ اعتراض بنا جس کا تماشا سوشل میڈیا پر دیکھا گیا۔ بی بی سی کی ''موسمی لڑکی'' کے نام سے مشہور ریحام خان کی مختصر ملبوسات میں

تصاویر ہوں، ان کی ڈانس کی ویڈیو ہو یا پھر کچھ اور بولڈ تصاویر..... عمران خان کے مخالفین نے بلاشبہ سوشل میڈیا پر ان کی ذاتی زندگی پر ایسے رکیک حملے کیے جو ظاہر ہے کسی کو زیب نہیں دیتا۔ عمران خان کا رنگین ماضی ایک دفعہ پھر دہرایا گیا اور ان کی ریحام خان سے شادی کو دراصل دو رنگین مزاج انسانوں کی شادی کے طور پر پیش کیا گیا۔

ان ذاتی حملوں نے ریحام خان کو اس قدر پریشان کردیا کہ انہوں نے پہلے تو سوشل میڈیا پر اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی اور تمام تصاویر کو فوٹو شاپ کی کارستانی قرار دیا۔ لیکن جب یہ حملے تیز ہوئے تو ان سے پریشان ہو کر اپنے پروگرام سے چھٹیاں لیں اور گھر چلی گئیں۔ لیکن یہ ریحام خان کی مشکلات کا صرف آغاز تھا جو انہوں نے اکھڑ اور خودسر کپتان سے شادی کرکے مول لیں، نجانے آگے کتنا کچھ ان کا منتظر تھا۔ ریحام خان کی ذات سے منسلک ایک بڑی پریشانی ان کا ماضی بھی ہے جو گواہی دیتا ہے کہ وہ زندگی میں ایک بڑا مقام بنانے کے لیے کتنی متحرک اور پرجوش رہی ہیں۔ وہ کوئی روایتی پاکستان خاتون نہی ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب ان کو لگا کہ ان کے شوہر جو ان کے تین بچوں کے باپ بھی تھے، ان کے کیریئر اور زندگی میں آگے بڑھنے کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں تو انہوں نے ان سے طلاق لے لی۔ عمران خان کے خاندان اور پارٹی کو ریحام خان کی نیت پر شک ہے، کیونکہ یہ پاکستان کی خاتون اول بننے کا ایک بہت بڑا شارٹ کٹ ہے جبکہ پارٹی کی قیادت میں بھی انہیں ایک اہم حصہ مل جائے گا۔

آنے والا وقت جو بھی پیغام لے کر آئے، یہ سچ ہے کہ عمران اور ریحام اس وقت ایک خوش جوڑے کی سی زندگی جی رہے ہیں، عمران ہر صبح ریحام کو گلاب کا پھول پیش کرتے ہیں، وہ ورزش کو جاتے ہیں اور ریحام ان کا دلیہ تیار کرتی ہے، ریحام کے نزدیک وہ عمران جتنی ورزش تو نہیں کرسکتیں، البتہ عمران جتنا تیز دوڑ سکتی ہیں۔ ریحام عمران کو ایک اچھا شوہر کہتی ہیں کیونکہ عمران نے کبھی اپنی سابقہ بیوی جمائما کی برائی نہیں کی۔ ریحام خان نے اب شوبز کے میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ دو فلموں کی پروڈکشن کے لیے بالکل تیار ہیں جس میں سے ایک "جانان" ہوگی۔ فلم 'جانان' کی لیڈ اسٹار برطانیہ کی رہنے والی اداکارہ ارمینا رانا خان ہیں جنہوں نے فلم میں اپنے کردار کے حوالے سے بتایا۔ اس سے قبل رعنا خان مختلف ٹی وی ڈراموں میں کام کرچکی



ریحام خان، ویدر بے بی کے روپ میں

ہیں جن میں عشق پرست، کرب اور بن روئے وغیرہ شامل ہیں لیکن کسی فلم میں وہ پہلی بار اداکاری کریں گی۔ انہوں نے فلم کے حوالے سے بتایا کہ یہ خیبر پختون خوا کی عوام پر فلمائی جائے گی۔ فلم 'جانان' ایک پختون خاندان پر مبنی رومانوی اور مزاحیہ فلم ہوگی۔ خیبر پختونخوا کی حکومت کی جانب سے ریحام کو اسٹریٹ چلڈرن کی سفیر بھی مقرر کیا گیا ہے۔

آج ریحام ایک سائے کی طرح عمران کے ہمراہ ہیں۔ لوگوں کے خدشات جو بھی ہوں، یہ واضح نظر آتا ہے کہ ریحام عمران خان کے ساتھ ساتھ چلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان میں ذہانت بھی ہے اور ملکی و عالمی سیاست کی سمجھ بوجھ بھی۔

جانے آنے والی رُتوں کے آنچل پر کیا لکھا ہے!!!

☆☆......☆☆

پہلی سچ بیانی

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوش بو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

# گھور اندھیرا جیون میرا



اعجاز احمد فلکراں

لاہور سے ایک بدقسمت دوشیزہ کی داستانِ الم

میں شادی کے کئی سال بعد حاملہ ہوئی تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا کہ اب میرے ہاں بھی اولاد ہوگی۔ میں بھی ماں بنوں گی۔ مجھے بھی بچے ماں ماں پکاریں گے اور میرا کردار معاشرے اور خاوند کے آگے اور زیادہ جاندار ہو جائے گا۔ ان ہی دنوں میں نے اپنے میاں صاحب سے پوچھا آپ کو بیٹی چاہیے یا بیٹا۔

''خدا جو بھی دے دے، خدا کا شکر ادا کروں گا۔'' انھوں نے ایک دلکش مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے جواب دیا جیسے کوئی لازوال خوشی مل رہی ہو۔

میں نے فوراً ان کے ہونٹوں کے آگے ہاتھ رکھ دیا اور سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ قبولیت کی گھڑی ہے، جو بھی نہیں صرف بیٹا یا بیٹی، جو بھی میں کچھ اور بھی شامل ہو سکتا ہے۔''

انھوں نے تھوڑا سا شرمسار ہو کر دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دے۔''

ڈلیوری کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ میری ساس میری دیکھ بھال کر رہی تھیں اور میری گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ انھوں نے مجھے سمجھایا کہ گھبراؤ نہیں، عورت بچہ پیدا کرتی ہے اور خدا پیدا کروانے والا۔ جب عورت بچہ پیدا کرتی ہے اس وقت خدا اور پیدا کرنے والے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔ خدا اپنی مخلوق بڑھانے کے لیے ایسے نازک موقع پر عورت کا ساتھ دیتا ہے۔''

اچانک میری خوشی غم میں تبدیل ہوگئی، جب مجھے یہ خبر دی گئی میرے ہاں مردہ بچہ پیدا ہوا ہے اور میری آس، آکاس بیل میں بدل گئی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے مجھے آئندہ ماں بننے کے لیے نااہل قرار دے دیا تھا۔ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے کر دوسری شادی رچالی۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا میرے سرالی آنگن میں بچے دیکھنا چاہتے تھے۔ قسمت میری خراب تھی۔ میں زندگی کے بقیا دن والد صاحب کے پاس گزارنے لگی۔ ہر دن تنہائی کا کانٹا بن کر گزر رہا تھا۔ کوئی مصروفیت نہ تھی۔ کچھ ایسے ہی گرم دن تھے۔ ہم بھی دوسرے لوگوں کی طرح لوڈ شیڈنگ سے تنگ تھے۔ نہ بجلی، نہ پانی، نہ گیس۔ وقت ان تینوں چیزوں کا انتظار کرتے ہوئے گزر رہا تھا۔ حالانکہ انسان کو صرف ایک عادت ڈالنی چاہیے کہ اسے کوئی عادت نہ پڑے۔ رات تو کسی طور کٹ جاتی تھی مگر دن بہت طویل ہو جاتا تھا۔ طبیعت میں عجیب چڑچڑاپن پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ جس سے علاوہ بھی عجیب ذہنی کیفیت میں الجھا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم نے سوچا کچھ دنوں کے لیے ماموں اشرف کے ہاں ایبٹ آباد چلنا چاہیے اور انھیں

ان کی بیٹی کی مبارکباد پیش کرنا چاہیے۔ اسی بہانے کرخت لوڈشیڈنگ سے جان بھی چھوٹ جائے گی۔ لہٰذا ایک دن ہم مصمم ارادہ کرکے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے اور ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں پلیٹ فارم پر ایک مال گاڑی آکر رکی۔ اسے دیکھ کر لوگ ایک کاپر رنگ کے ڈبے کے گرد جمع ہونے لگے۔ اندر سے ایک بچے کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے یہ بلی کی آوازیں ہیں۔ کچھ کے خیال میں یہ پلوں کے رونے کی آوازیں تھیں۔ اور کچھ لوگ ڈر رہے تھے۔ بہرحال کچھ لوگوں نے ہمت کرکے پائیدان پر چڑھ کر بچے کو دیکھا۔ وہ گائے بھینسوں کے گوبر سے لپٹا ہوا بھوک پیاس سے تڑپ رہا تھا اور دائیں بائیں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ چند لوگ حرامی اور گناہ گناہ کی آوازیں کس رہے تھے۔ میں نے ڈبے کے اندر داخل ہو کر اسے پیار سے اٹھا کر سینے سے لگالیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس کے ساتھ لگی ہوئی غلاظت کو صاف کیا اور بیگ سے چادر نکال کر اس میں لپیٹ لیا۔ بڑی بڑی

بادامی آنکھیں تھیں اس کی۔ سر سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں چوڑے تھے۔ کچھ لوگ ماشاءاللہ ماشاءاللہ کہہ رہے تھے۔ اس وقت ہجوم سے ایک بچوں والی عورت نے مجھے دودھ کا فیڈر پیش کیا اور کہا۔

''اس کو دودھ پلاؤ، بھوکا ہوگا۔'' میں نے اس کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ اتنے میں پولیس آگئی انھوں نے کہا۔ ''بچے کو لے کر تھانے چلو۔'' میں نے اباجی سے گڑ گڑا کر فریاد کرتے ہوئے ''اباجی یہ لاوارث بچہ ہے۔ مجھے گود لے دیں۔ میں پالوں گی اس کو۔'' ''بیٹی کل کو اس نے جوان بھی ہونا ہے۔ ہم اس کو کیا بتائیں گے اس کے والدین کون تھے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے اس کے وارث اسے ڈھونڈ لیں اور مانگ لیں۔ ہمارے لیے بڑے مسائل کھڑے ہوجائیں گے۔ تم اس کے ساتھ دل نہ لگاؤ بلکہ پولیس کے حوالے کردو۔ ورنہ ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔'' اباجی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اباجی کوئی نہیں آئے گا، یہ لاوارث بچہ ہے۔ اگر اس کو کسی نے رکھنا ہوتا تو اس طرح گندگی میں نہ پھینکتا۔'' میں



نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ بہرحال میری منتیں اور التجائیں سن کر وہ راضی ہو گئے اور پولیس کے ساتھ تھانے پہنچ گئے۔

میں نے ممتا بھرے لہجے میں ایس ایچ او سے کہا، ''میں بے اولاد ہوں۔ اس بچے کو گود لینا چاہتی ہوں، اس کا کوئی وارث نہیں۔'' ایس ایچ او نے مجھے بہت سمجھایا، ''بی بی یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ کل کو اگر آپ کو خدا نے اولاد دے دی تو آپ اس لاوارث بچے کو چھوڑ سکتے ہیں اور یہ بچہ دوسری بار احساس محرومی کا شکار ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے اس بچے کو یتیم خانے میں جمع کروانے دیں، وہیں پل بڑھ کر جوان ہو جائے گا۔''

ابا جی نے میری سابقہ صورتِ حال ایس ایچ او کے آگے بیان کر دی تو وہ بچہ دینے پر راضی ہو گیا۔

ابا جی نے اسی وقت ایک ملازم کو پیسے دے کر مٹھائی منگوائی اور سٹاف کو کھلائی۔ سب نے مجھے مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اس کا نام عطاءاللہ رکھو، کیونکہ یہ اللہ نے مجھے معجزانہ طور پر عطا کیا ہے۔'' میں نے عظیم جذبے کے تحت فیصلہ کر لیا کہ اس بچے کو پال پوس کر جوان کروں گی۔ تاکہ مالک کائنات مجھ سے راضی ہو جائے۔

عطاءاللہ نے ابتدائی دنوں میں ہی مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ مسکراہٹ سے اس کا چہرہ کھل کر چڑھتے سورج کی رنگت جیسا ہو جاتا تھا۔ دیکھنے والے مبارکبادیں پیش کرتے ہوئے کہتے تھے۔

''لڑکے نے پنگھوڑے میں ہی مسکرانا شروع کر دیا ہے۔ یقیناً بڑا ہو کر ہنسی کی پٹاری بنے گا۔'' وہ جلدی سے بڑا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دوسری بار کپڑے پہناؤ تو چھوٹے ہو جاتے تھے۔ عادات پتا نہیں کس پر جائیں گی جو مسکراتا رہتا ہے۔

ہاتھ پکڑنے کیلئے بڑھاؤ تو گلے لگ جاتا ہے۔ سیر کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ خود ابھی بولنا سیکھ رہا تھا کہ دوسرے بچوں کی باتوں کا توتلی زبان میں ترجمہ کر کے بتا دیتا تھا۔ سکول جانا شروع ہوا تو ایک بار سنا ہوا سبق اس کو ازبر ہو جاتا تھا۔ ناز برداریاں اس حد تک اندر چھپی ہوئی تھیں کہ اپنا الگ صابن رکھتا۔ جیب میں ہر وقت رومال رکھتا۔ کپڑے بدلے جاتے تو استری اور جوتے پالش ہونے کا خیال بھی رکھتا۔ جیسے قد بڑھتا جا رہا تھا ویسے ہی حسن میں بھی بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں اپنا تمام پیار اس پر نچھاور کر رہی تھی کہ میں ہی اس کی حقیقی والدہ ہوں۔ اس کی بہترین پرورش کر رہی تھی، اس کو اچھی اچھی باتیں سکھا رہی تھی۔

جوانی میں اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی اور اس کے قہقہوں کی آوازیں سننے والوں کی پسلیوں کو دوہرا کر دیتی تھیں۔ اس کے قہقہے سن کر لوگ غم بھول جاتے تھے۔ واقعی اچھا قہقہہ وہ ہوتا ہے جس کو سن کر جسم میں گدگدی ہونے لگے۔ چھوٹے لوگوں میں اس کا دراز قد کیکٹس کے پودوں میں اروکیریا کے درختوں کی طرح لگتا تھا۔ اس کے حسن کا جواب پورے علاقے میں نہیں تھا۔ اسے دنیا میں دو ہی کام تھے۔ قہقہے لگانا اور سوچتے رہنا۔ جو لوگ اسے قہقہے لگاتے ہوئے دیکھتے کہتے، اس کے اندر غم چھپے ہوئے ہیں اور جن بیوقوفوں کے آگے وہ بہت گہرائی کی باتیں کرتا'' کہتے اسے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔'' جو لوگ اس کو بیک وقت قہقہے لگاتے اور سوچتے ہوئے دیکھتے۔ کہتے۔ ''زندہ دل شخص ہے'' اس کے ذہن میں عظیم خیالات جگہ بناتے جا رہے تھے۔ وہ کسی نہ کسی چیز پر تحقیق کرتا رہتا تھا۔ میں نے اسے ایک ہی بات سمجھائی تھی کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کر کے عظیم انسان کہلائے۔

☆......☆......☆

عطاءاللہ نے چھت کے ایک چھوٹے سے کمرے میں سائنس لیبارٹری بنائی ہوئی تھی۔ وہ اور اس کا دوست عظمت کئی کئی گھنٹے لیبارٹری میں بیٹھے ہلکے بھاری پانی پر تجربات کر کے بجلی کا کوئی آلہ بنانے کے بارے میں تحقیق کرتے رہتے تھے۔ میں عظمت سے اس کی دوستی کی وجہ سے کافی بے فکر تھی۔ کیونکہ وہ بھی ایک ہونہار لڑکا تھا۔

ہمارے سامنے والا ایک گھر کافی عرصے سے خالی پڑا ہوا تھا۔ ایک دن فروخت ہو گیا اور وہاں ایک چھوٹی سی فیملی آ کر آباد ہو گئی۔ اس خاندان میں ایک لڑکی مسرت بھی شامل تھی۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ عطا اس لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ عطا کو آہستہ آہستہ مسرت کے سراپے سے پیار ہو گیا۔ وہ مسرت کو دیکھ کر ساکت بت کی طرح کھڑا ہو جاتا تھا۔ مسرت پری چہرہ دوشیزہ مجسم تھی۔ وہ بھی حسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنے سرخ رخساروں پر لٹیں لٹکائے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ عطا مسرت کی چنچل اور شوخ اداؤں

کا اسیر ہوتا گیا۔ موسم بہار کے کھلے ہوئے پھولوں جیسا رنگ تھا اس کا۔ بڑی دھوکہ باز کشش سے بھرپور شکاری آنکھیں تھیں اس کی۔ گلابی رنگ سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ کپڑے، جوتے، پرس، چوڑیاں، میک اپ کٹس، کمروں کے پردے، سب گلابی رنگ کے استعمال کرتی تھی۔ حتیٰ کہ کتابوں پر کور بھی گلابی رنگ کے چڑھاتی تھی۔ نزدیک کی نظر کمزور ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے فریم بھی گلابی رنگ کے استعمال کرتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ کوئی ماورائی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔ مگر پاؤں بے حد کھردرے تھے۔ شاید انھیں بنانے سنوارنے پر توجہ نہیں دیتی تھی۔

عطا اور مسرت کئی مہینوں تک ویب کیم پر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور چھپ چھپ کر ایک دوسرے کو ملتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے سے دور رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک رات میں عطاء کے کمرے میں کھانے کی ٹرے لے کر گئی۔ وہ سینے پر کاپی رکھے، آنکھیں بند لے کر گہری سوچوں میں گم بیڈ پر لیٹا تھا۔ میں نے اس سے باز پرس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم سارا دن مسرت کے خیالوں میں کھوئے رہتے ہو، رات کو سوتے بھی ہو کہ نہیں۔''

اگر چہ وہ میرا بیٹا تھا مگر مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ لہٰذا وہ رازداری والی باتیں مجھے بتانے میں عجلت محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس نے بڑا پیارا جواب دیا۔ ''ماں جی نیند میں پیار کا بھی اپنا ہی مزہ ہے اور اجالے کا الگ سرور۔ جب مسرت میرے خیالوں میں پھول بن کر مسکراتی ہے تو میرا ذہن تر و تازہ ہو جاتا ہے اور میں اس کے پُر مسرت چہرے کے آگے شرما جاتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ شرارتی آنکھوں سے بازو کھول کر شرارتیں کرتی ہے اور بہکی بہکی چالیں چلتی ہے تو میرا دل اس کی خوشبوؤں سے معطر ہو جاتا ہے اور خوشی سے دل میں قہقہے پھوٹنے لگتے ہیں۔ جب نظریں جھکا کر باتیں کرتی ہے تو مجھے اس کی مترنم آنکھوں میں ڈوبتے سورج کا گمان گزرتا ہے۔ وہ پُرکشش نظروں سے پیار لیے خوشبوؤں کی طرح ہر وقت میرے محور میں گردش کرتی رہتی ہے۔ وہ اس قدر خوبصورت ہے کہ اس کا حسن ہر حسین چیز سے زیادہ حسین ہے۔''

''کیا تمہاری مسکراہٹیں اور قہقہے بھی اس پر کچھ اثر انداز ہوتے ہیں۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میری مسکراہٹیں اور قہقہے فرضی ہیں۔ ماں جی مجھے اس کا چہرہ ستاتا ہے۔ میری اس سے شادی کروا دیں۔ میں نیند میں بھی تڑپتا ہوں۔ کسی پل قرار نہیں آتا۔ کبھی کبھی اس سے دوری کے غم میں میرے دل میں رونے کی شدید خواہش جاگ اٹھتی ہے کہ کہیں اس کو مجھ سے کوئی چھین کر نہ لے جائے۔'' عطاء نے آزردہ لہجے میں جواب دیا۔

میں نے احتیاطاً پوچھا ''اگر وہ نہ ملی تو تم کیا کرو گے۔''

اس نے التجائی انداز میں فریاد کرتے ہوئے کہا ''ماں جی میرے کانوں میں پڑنے والے آپ کے فقرے نے عجیب بے چینی پیدا کر دی ہے۔ ایسا نہ کہیں، ہمیں دو رنگوں کی طرح ملا دیں جو ایک دوسرے میں مدغم ہو کر علیحدہ نہیں ہو سکتے۔'' ''کیا اس نے بھی تم سے کوئی عہد و پیمان کیے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''اس نے ہر حال میں میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں۔'' ساتھ ہی اس نے سینے پر رکھی کاپی کھول کر دکھائی۔ جس کے پہلے صفحے پر مسرت کی تصویر تھی اور اگلے صفحے پر تحریر تھا۔ ''میں ہر حال میں تمہارا ساتھ نبھاؤں گی۔'' نیچے مسرت کے دستخط تھے اگلے اوراق پر بھی تصویریں اور کچھ ایسی ہی تحریریں تھیں اور نیچے مسرت کے دستخط تھے۔

''لیکن محبت میں مرنا نہیں بلکہ ہر حال میں جینا بڑی بات ہوتی ہے۔'' میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ایک دن عطاء نے میرے ساتھ ذکر کیا کہ مسرت نے مجھے بتایا ہے کہ میرے والدین میری شادی کہیں اور کرنے والے ہیں۔ میں تمہارے علاوہ کسی اور سے شادی نہ کروں گی۔ مگر میری کوئی نہیں سنتا۔ سب مجھے بیوقوف بنا رہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں تمہاری روح کے اندر چھپ جاؤں یا مر جاؤں۔''

میں نے مسرت کے والدین سے دونوں کی منگنی کے بارے میں بات کی تو انھوں نے بڑے واضح لفظوں میں انکار کر دیا کہ'' ہم برادری سے باہر شادی نہیں کرتے۔ میں نے ان کو یہ پیشکش بھی کر دی۔

''اگر آپ عطاء کو گھر داماد رکھنا چاہتے ہیں یا مسرت کے نام شہر کی بارونق جگہ پر زمین، جائیداد خریدنا چاہتے ہیں تو میں اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔'' اس آفر پر بھی ان کا

انکار تھا۔ میں نے اس بات کا بھی خدشہ ظاہر کیا کہ ''اگر دونوں نے کورٹ میرج کر لی یا گھروں سے بھاگ گئے تو دونوں خاندان عزت گنوا بیٹھیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے دو محبت کرنے والوں کو گھر بسانے دو۔ ویسے بھی ان کی محبت اب کوئی راز نہیں۔ دونوں کی محبت کے قصے زبان زد عام ہیں اور عشق کا بھوت خود ہی چڑھتا ہے خود ہی اترتا ہے۔ اس کو ختم کرنے میں دوسرے لوگ بے بس ہوتے ہیں۔ اگر کچھ برا ہو گیا تو دونوں خاندان خاک چھانتے پھریں گے۔''

بہر حال وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ پہلے مسرت کے نام کوئی جائیداد خریدی جائے۔''

چند دن بعد میں نے مسرت کے نام ایک مکان خرید لیا اور شادی کی تاریخ پکی ہو گئی۔

☆......☆......☆

ایک دن مسرت کی والدہ یعنی میری سمدھن بڑی گھبرائی ہوئی آئی اور مجھ سے رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگی، ''بہن برا مت ماننا، مجھے لڑکے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔ آپ لڑکے کا حسب ونسب بتائیں۔ یہ لڑکا کون ہے، اس کا آپ سے کیا رشتہ ہے، اس کے باپ کا کیا نام ہے۔''

''میں اس کی باتیں سن کر پریشان ہو گئی اور حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کسی نے بہکانے کی کوشش کی ہے۔''

مگر وہ بضد تھی کہ ''میں عطاء کے باپ کے بارے میں جانے بغیر اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گی۔''

میں نے اس سے سوال کیا، ''آخر سارے معاملات طے ہونے کے باوجود تمہیں یہ خیالات کیوں پیدا ہوئے۔''

''میرے ذہن میں موجود تھی، لیکن کلیئر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں اس کی بات سن کر کچھ دیر خاموش رہی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ سچ کہوں تو رشتہ توڑ دے اور جھوٹ بول کر اپنے ضمیر پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے سچ بتا دینا ہی مناسب سمجھا اور پھر میں نے اسے سچ بتا دیا۔

وہ میری بات سن کر سکتے میں آ گئی اور کچھ دیر تک مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔

میں نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ اور کیفیت دیکھ کر اس سے پوچھا، ''تو کیا میں یہ سمجھوں کہ......'' میں بات کرتے کرتے رک سی گئی۔

اس نے میرا ادھورا جملہ سنا جیسے سکتے کی کیفیت سے باہر نکل آئی ہو۔ ''نہیں بہن، وہ نہیں جو تم کہنا چاہتی ہو۔''

میں نے پوچھا، ''کیا وہ نہیں۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ پوچھنے لگی، ''جب تم نے اسے مال گاڑی سے اٹھایا تھا، کیا دن تھا؟''

مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں تھی۔ میں نے اسے مہینہ اور سال بتایا تو بتاتے ہوئے مجھے کچھ یاد آ گیا۔

میں نے کہا، ''کچھ توقف کرو، میں تمہیں صحیح تاریخ بھی بتا دیتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے پوچھنا چاہوں گی، ان سب تفصیلات کا جاننا تمہارے لیے کیوں ضروری ہے۔''

اس نے جواب دیا، ''اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔''

میں اپنے بیڈ روم میں گئی اور الماری سے پولیس کارروائی کی رپورٹ لے آئی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے رپورٹ پڑھتے ہی دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ میں گھبرا گئی کہ یکدم اس کی ایسی کیفیت کیوں ہو گئی۔ پھر اس نے مجھے بتایا۔

''یہ میرا ہی بیٹا ہے، میں نے اسے مال گاڑی میں ڈالا تھا۔ اس کا جواب سن کر میرے پاؤں تلے سے زمیں نکل گئی اور رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ اے میرے خدا یہ کیا ہو رہا ہے۔''

پھر میں نے پوچھا، ''تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟''

اس نے کہا، ''میرے ساتھ پیار میں کسی نے دھوکہ کیا تھا۔ میں حاملہ ہو چکی تھی۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے میں نے لڑکے کو جنم دے کر زندہ ٹرین کے ڈبے میں ڈال دیا تھا۔ میں اس کو مار کر دوسرا گناہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر آج میں دونوں کی شادی کر کے ایک اور گناہ کرنے والی تھی۔''

اس عورت کے انکشافات نے میری دماغی شریانیں توڑ مروڑ کر رکھ دیں۔ وہ عورت میرے آگے ہاتھ جوڑ کر واپس چلی گئی اور اگلے دن سامنے والا مکان خالی ہو گیا۔ عطاء کو کچھ بتانا اور چھپانا میرے لیے بڑا مسئلہ بن گیا تھا کہ میں اسے کیسے ہینڈل کروں۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا یا وہ ہماری باتیں سن چکا تھا۔ وہ بہت اداس اور کھویا کھویا رہنے

لگا۔اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

ایک رات بارہ بجے کے قریب عطاء کے کمرے سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں مشکل سے آنکھوں کے پپوٹے کھول کر کھڑی ہو گئی کہ اس وقت چیخوں کی آوازیں کیسی اور کہاں سے آ رہی ہیں۔ جیسے ہی میرے حواس ٹھیک ہوئے، مجھے محسوس ہوا کہ یہ آوازیں تو عطاء کے کمرے سے آ رہی ہیں۔ میرا دل عطاء کی دلدوز چیخوں سے پھٹنے لگا اور کنپٹیوں میں خوف کی لہریں گردش کرنے لگیں۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا عطاء کے کمرے میں بدروحیں چنگھاڑ رہی ہوں۔ میں اس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ اس کے کمرے سے شعلے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دیواریں لرز رہی تھیں۔ اندر سے چیزوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ باہر کھڑکیوں اور دروازوں پر لگے رنگ عجیب گھناؤنی شکلوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نے حیرت اور کشمکش میں میں دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو ناکام رہی۔ آخر ایک بھاری کرسی اٹھا کر میں دروازے پر دے ماری اور وہ ایک دھماکے کی آواز سے کھل گیا۔ کچھ شعلے اور دھواں میرے جسم سے ٹکرائے۔ میرا چہرہ تھوڑا جھلس گیا۔ سامنے عطاء تڑپ رہا تھا اور آگ کے شعلے سانپوں کی شکل میں اس کے چاروں طرف لہرا رہے تھے۔ میں واپس مڑ کر ایک کمبل لانے کیلئے بھاگی اور واپس آ کر جلدی سے اس کے جسم کو کمبل میں لپیٹ لیا اور وہ ایک دودھ پیتے پیاسے بچے کی طرح میرے جسم سے چمٹ گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ میں نے اس کے پر درد آنسو صاف کیے اور تسلیاں دیں۔

تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف میرے لیے جینا ہے۔ وہ ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ اچانک عطاء میری طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے یہ اس کی آخری سانسوں کا وقت ہو۔ میں اس کے جسم سے لپٹی ہوئی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ اس کی ساری تکلیف کو اپنے اندر جذب کر لوں۔ لیکن تکلیف زدہ انسانوں کو بھی اس وقت تک موت نہیں آ سکتی جب تک ان کا رزق کرہ ارض پر موجود ہو۔ اس کے کپڑے جل چکے تھے اور آنکھیں بجھنا شروع ہو چکی تھیں۔ اس کے نہ مانگنے پر بھی میں نے اس کو پانی کا گلاس پیش کر دیا جو اس نے پیا اور آدھا گر گیا۔ میں نے فوراً گاڑی نکالی اور اس کو ہسپتال کی طرف لے کر بھاگی۔ عطاء کا جسم کافی حد تک جھلس چکا تھا۔ بچ گیا مگر......

☆......☆......☆

پس ایک ہی غم نے اس کی قہقہوں بھری دنیا کو اذیت کی آگ میں جل کر پگھلنے پر مجبور کر دیا۔ گھناؤنی سوچوں نے اس کے جسم کو گدھوں کی طرح نوچنا شروع کر دیا۔ فکریں اور پریشانیاں اس کے اردگرد کائیں کائیں کر کے اس کے حسن کا مذاق اڑانے لگیں۔ ہر لمحہ اس کو ایسے محسوس ہوتا جیسے اس پر انگارے گر رہے ہوں۔ زندگی بچ گئی مگر گردن کے پٹھے سکڑ کر ایک جگہ جم گئے۔ دونوں کندھے ہلائے بغیر مڑ نہیں سکتا۔ کمزوری اور نقاہت میں دوا اور کھانا بھی میں اس کو کھلاتی۔ اس کی روز بروز گرتی صحت دیکھ کر میں بھی دماغی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی۔ پہلے وہ تھوڑا سا پاگل ہوا پھر زیادہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مکمل سے بھی زیادہ۔ اس کے دماغ کے کچھ حصے مر گئے۔ مگر جسم پورا زندہ تھا۔ اپنی طرف سے دنیا میں وہ تھا اور اس کی تنہائی۔ ایک پاگل دور اس کے اندر بس گیا تھا۔ دنیا اس کو خالی خالی لگنے لگی اور وہ خلاؤں کو گھورتا رہتا یا خود کلامی کرتا رہتا یا کسی بھی کپڑے کو پکڑ کر گانٹھیں مارتا رہتا۔ جیسے اپنی طرف سے کسی کی گردن مروڑ رہا ہو۔ بعض اوقات وہ کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ گھومتا رہتا۔ آہستہ آہستہ اس نے چیزوں اور لوگوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ بچوں کے لیے تو وہ اچھا خاصا تماشا بن گیا۔ وہ اس کو پاگل پاگل کی آوازیں کستے رہتے۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس کو پاگل خانے لے جاؤں۔ آخر پاگل خانے میں رہنے والے بھی تو کسی کے بیٹے، کسی کے بھائی، کسی کے باپ ہوتے ہیں۔

آج میرا راج دلارا میرا عطا پاگل خانے میں ہے۔ پتا نہیں کون سے ایسے حساب ہیں جو وہ کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ مگر نہ اُس کے حساب ختم ہوتے ہیں نہ ہی وہ خلاؤں میں سندیسے بھیجتے تھکتا ہے میری زندگی زخم زخم ہو چکی قسمت کسی روٹھے یار کی طرح سکھ کی چھایا بھی سر پر نہیں چھوڑتی۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ دعا کریں خدا میرے عطاء اللہ کی مشکل آسان کر دے اور ایک دُکھی ماں کی مامتا بھی قرار پا جائے۔ (آمین)

☆☆......☆☆......☆☆

# ہم نے تو وفا کی تھی

نسیم صدرالدین سرائی

زہر بجھے رشتے، آستین کے سانپ کی طرح ہوتے ہیں، کراچی سے ایک آبلہ پائی

میرے ابو کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ سب سے بڑے بھائی حسین تھے، پھر میرے ابو شہاب الدین پھر ایک بہن زینب تھی اور پھر چھوٹے بھائی رجب علی تھے۔ بڑے بھائی ابو سے تقریباً سولہ سال بڑے تھے، چونکہ دادا کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے تایا ابو کچھ آزاد خیال اور من موجی قسم کے آدمی ہو گئے تھے۔ وہ زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرنا نے اور میں گزارتے تھے۔ کام کاج سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ آوارہ گردی ہی ان کا پیشہ تھی دادی کی ڈانٹ پھٹکار کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت کی ایک مشہور طوائف گل ناز جو اپنی خوبصورتی کے باعث قاتل حسینہ مشہور تھی کلفٹن کے ساحل سمندر پر ناچ گانا کرتی تھی۔ اس کے کوٹھے پر عاشقوں کی قطار لگی رہتی تھی۔ تایا ابو بھی اس کے چاہنے والوں میں شامل تھے اور وہ بھی تایا ابو کو دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ تایا ابو روز اسے دیکھنے کے بہانے جاتے لیکن جو اسے استعمال کر کے خوب پیسا کما رہے تھے دراصل وہ اس کے دلال تھے ذریعہ آمدن بھی عورتوں کو اغواء کرنا اور انہیں نچوانا۔ ایک دن تایا جان نے کوٹھے پر موجود پہرے داروں کو دھوکا دے کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما اور وہاں سے نکل گئے۔ بڑی مشکلوں سے ان دونوں نے بھاگ کر شادی کر لی اور اپنی ایک الگ دنیا بسا لی۔

ان کی شادی کو تقریباً سات برس کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس دوران ان کی دو بیٹیاں بھی ہو چکی تھیں۔ بڑی بیٹی کا نام یاسمین اور چھوٹی بیٹی کا نام سکینہ تھا۔ جو خوبصورتی میں بالکل اپنی ماں پر گئی تھیں۔

ایک دن گل ناز کو مارکیٹ میں ان کے گروہ نے گھیر لیا جو خریداری کے لیے گئی ہوئی تھی۔ وہ سارا وقت اس کے پیچھے چپکے سے رہا یہاں تک کے دوسرے دن اس کے گھر کا ٹھکانہ بھی دیکھ لیا۔

پھر دوسرے دن تایا ابو کام پر گئے ہوئے تھے تو کچھ لوگ گھر میں گھس کر گل ناز کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس نے بڑی منت سماجت بھی کی مگر سب رائیگاں گئی۔ وہ روتی رہی، چیختی رہی کہ مجھے اپنی بچیوں کے ساتھ چھوڑ دو مگر وہ ظالم معصوم بچیوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اسے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔ گل ناز کی ساری کوشش ناکام ہو گئی۔

جب تایا ابو شام کو کام سے واپس آئے تو انہیں سب باتوں کا پتا چلا تو ان کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی کیوں کہ وہ گل ناز کو بے انتہا چاہتے تھے۔ وہ اسی وقت گل ناز کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے لیکن اسے نہ ملنا تھا نہ ملی۔ نہ

جانے اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ انہوں نے اس ڈر سے کہ کہیں ان کا راز نہ کھل جائے اور اس سے بچیوں کی زندگی پر بھی برا اثر پڑے گا پولیس میں رپورٹ بھی نہیں لکھوائی تھی بلکہ خود ہی اسے ڈھونڈنے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ لوگ اسے کہیں اور لے گئے یا قتل کر دیا پتا نہ چل سکا۔

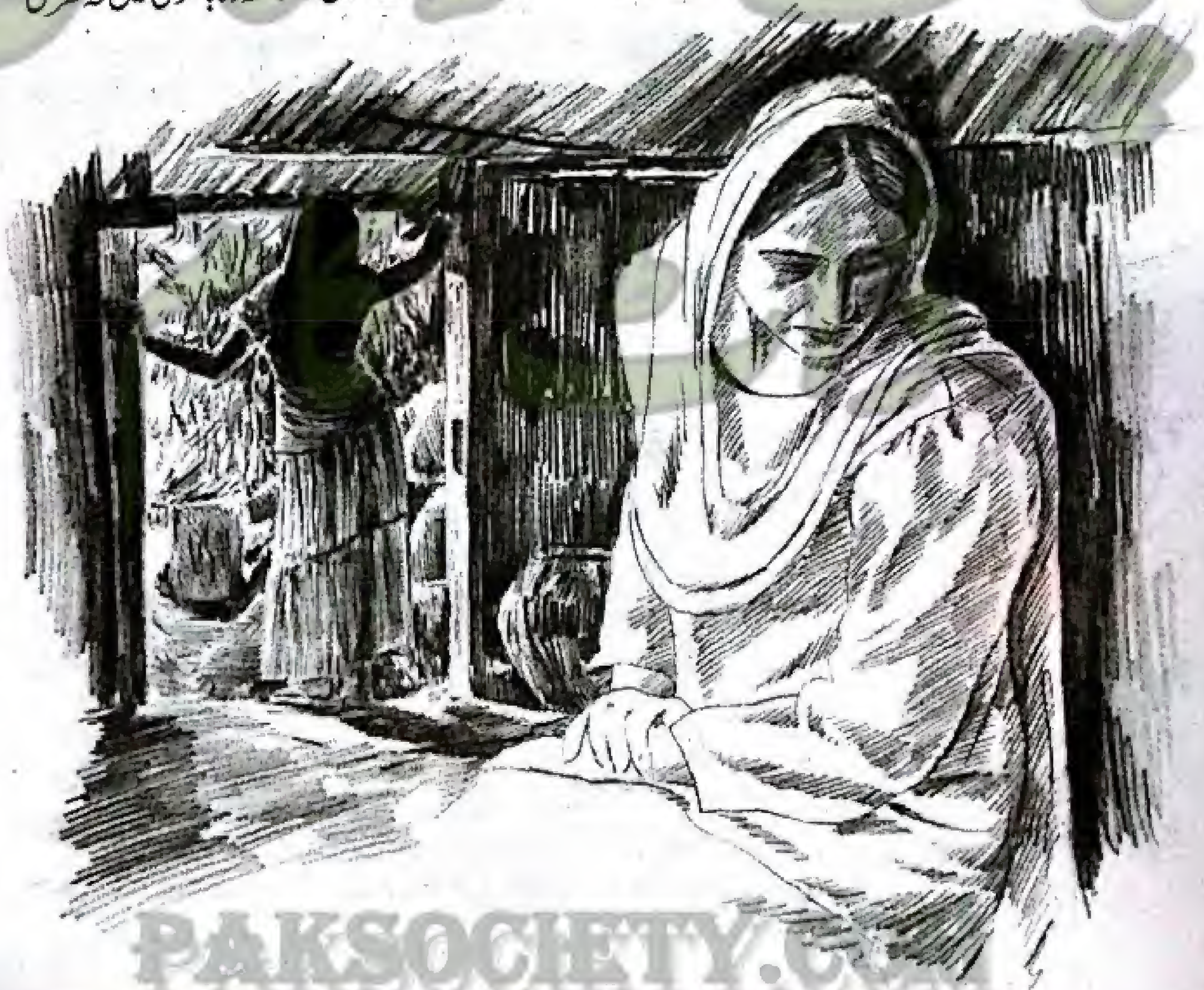
اس واقعے کے بعد وہ تقریباً اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ تایا اب اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ ان کی دماغی حالت بہت کمزور ہو چکی تھی۔ وہ روزانہ ساحل سمندر پر جاتے اور گل ناز کو آوازیں دیتے۔ ان کی دونوں بیٹیاں دادی کے پاس رہتی تھیں لیکن وہ بھی بوڑھی ہو چکی تھیں اس لیے بچیوں کو سنبھالنا ان کے لیے مشکل کام تھا۔ زینب پھوپی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔

پھر دادی نے ابو کی شادی کروادی اور بچیوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری امی نے لے لی۔ اسی دوران تایا ابو کی لاش ساحل سمندر پر پائی گئی۔ ان کے جسم پر کوئی زخم کا کوئی نشان نہیں تھا اور نہ ہی خراش تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پانی میں ڈوب کر خودکشی کی ہے اسی لیے پولیس نے اس کیس کی فائل بند کردی۔

اب تایا ابو کی دونوں بیٹیوں کو ابو نے سینے سے لگایا اور کہا کہ پہلے یہ میرے بچے ہیں اور اپنے بچے بعد میں، ابو کے بھی چار بچے تھے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں، لیکن ابو ہم سے زیادہ انہیں پیار کرتے تھے۔

جب یاسمین اور سکینہ سولہ برس کی ہوگئیں تو ان کے بھی بڑے پرزے نکل آئے تھے۔ قدرت نے جس فیاضی سے ان کی ماں کو حسن دیا تھا اس لحاظ سے یہ دونوں بھی خوبصورت تھیں اور اکثر نہ جانے کیوں وہ بالکونی میں کھڑی رہتی تھیں۔

ایک بار وہ بالکونی میں کھڑی ہوئی تھیں تو نیچے سے ایک منچلے نوجوان نے ایک پتھر پھینکا جس پر ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا شاید وہ خط تھا۔ جس پر کوئی پیغام لکھا ہوا تھا۔ جب اس نے نیچے دیکھا تو اسے نیچے آنے کا اشارہ کیا ابو گھر پر ہی تھے۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا تو اسے کچھ خطرہ محسوس ہوا۔ ابو نے انہیں ڈانٹا کہ وہ بالکونی میں نہ کھڑی



ہوں۔ انہیں ڈانٹنے کے بعد ابو نیچے گئے کہ انہیں بھی سمجھائیں لیکن ان نوجوان لڑکوں نے ابو کو بری طرح پیٹا۔ ابو لہولہان ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد امی نے ابو کو سمجھایا جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہیں۔ ان کی شادی کر دیں۔ میں بھی پورا دن چھوٹے بچوں میں لگی رہتی ہوں۔ اس لیے میری توجہ بھی ہٹی رہتی ہے۔ یہ جوان لڑکیوں کو گھر میں بٹھانا ٹھیک نہیں۔

ابو نے کوشش کر کے قرض لے کر اور امی نے اپنے سارے زیور بیچ کر ان دونوں کی شادیاں کروادیں۔ یاسمین تو شادی کے بعد میر پور خاص چلی گئی جبکہ سکینہ کراچی میں ہی رہ رہی تھی۔

ابو سکینہ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ کیوں کہ وہ چھوٹی بھی تھی اور ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں رہتی تھی۔ سکینہ کے بھی پانچ بچے تھے۔ تقریباً ہماری ہی عمروں کے پھر ہم لوگ اس مکان کو چھوڑ کر کسی نئی جگہ شفٹ ہو گئے۔ جو کافی دور تھی اور آنے جانے میں اچھا خاصا وقت لگتا تھا۔

جب ہم لوگ نئی جگہ پر شفٹ ہو گئے تو ابو کو سکینہ کی بہت یاد آتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ بھی ہمارے قریب آ جائے۔ سکینہ بھی ضد کرتی تھی کہ مجھے آپ کے گھر کے قریب رہنا ہے تاکہ مجھے آنے جانے میں آسانی ہو اور میں اپنے بچے چچی کے پاس چھوڑ جاؤں۔

میری بڑی بہن نازیہ جو کہ بہت زیادہ ذہین و فطین تھی اور ہر بات کو گہرائی تک سمجھ لیتی تھی اس نے کہا ابو اسے وہیں رہنے دیں۔ اگر یہ ہمارے گھر کے قریب آئی تو روزانہ لڑائی ہوگی۔"

ابو یہ سن کر بہت غصہ ہوئے اور بہن کو ڈانٹا کہ تم نے میری بھتیجی کے خلاف ایسی بات کیسے کہی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں انہیں کتنا چاہتا ہوں۔

اس وقت جو بات ہوئی اس کا ابو کو بڑا دکھ ہوا۔ کچھ عرصے بعد ابو نے کوشش کر کے سکینہ کو بھی اسی اپارٹمنٹ کے سامنے فلیٹ میں شفٹ کروا دیا۔ جس میں ہم لوگ رہتے تھے۔

اب سکینہ ہمارے سامنے والی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ دونوں کے فلیٹ کی گیلری آمنے سامنے نظر آتی تھی۔

انہوں نے اپنے بچوں کو بھی ہمارے ہی اسکول میں داخل کروا دیا۔ ہم سب روزانہ اسکول ساتھ جاتے تھے۔

ایک دن ہم سب اسکول سے واپس آ رہے تھے۔ کہ سکینہ کی بیٹی رابعہ جو کہ میری بہن سے ایک سال چھوٹی تھی اس نے کہا۔

"اے سنو! آج ہم لوگ دوسرے راستے سے چلتے ہیں۔ اس راستے میں ایک بہت بڑا خوبصورت باغ آتا ہے۔ اس کو اس باغ میں سے پھول توڑنے تھے۔ لیکن میری بہن نے کہا کہ نہیں اسی راستے سے گھر چلتے ہیں کیوں کہ وہ راستہ کافی لمبا پڑتا تھا۔" لیکن وہ نہ مانی اور زبردستی ہم کو چھوڑ کر اسی راستے سے چلی گئی۔ جب ہم لوگ گھر آئے تو سکینہ نے ہماری باتوں کا یقین نہ کیا۔ ہم نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر نہ مانی۔ وہ ہم سے کہہ رہی تھی کہ تم میری بیٹی ایسے اکیلا چھوڑ کر کیوں آئے۔ ہم نے کہا ہم نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا بلکہ وہ ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنی سی بات پر ہم لوگوں سے اس بے انتہا لڑائی کی۔ اس نے امی کو بھی بہت گالیاں دیں یہ سارا تماشا وہ اپنی گیلری میں کھڑی ہو کر کر رہی تھی۔ اور سارے بلڈنگ والے اپنے فلیٹ کی کھڑکیوں میں سے کھڑے ہو کر دیکھ اور سن رہے تھے۔ بعض لوگ تو اس کی زبان درازی پر کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ اسی دوران ان کے بیٹوں نے پتھر مار کر ہماری کھڑکیوں کے سارے شیشے توڑ دیے۔ ہمارے پورے گھر میں شیشے ہی شیشے بکھر گئے۔ یہ سب دیکھ کر امی چپ اور افسردہ ہو گئیں۔

رات کو جب ابو گھر آئے تو ہم نے یہ سب ماجرا ابو کو بتایا لیکن ابو کسی بھی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ ان کی بھتیجی نے ایسا کیا ہے۔ ٹوٹے ہوئے شیشے دکھانے پر بھی ابو نے ہم سے کہا۔ تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔ سکینہ ایسا نہیں کر سکتی۔ سارا قصور تمہارا ہوگا میں خود جا کر دیکھتا ہوں کیا بات ہے۔"

جب ابو سکینہ کے گھر گئے تو سکینہ نے خوب ابو کو برا بھلا کہا۔ آپ تو ہمیں ہر وقت ڈانٹتے رہتے تھے اور آپ میرے پاس ملنے نہیں چائے پینے آتے ہیں۔ اس کا چائے کا طعنہ سن کر بھی ابو خاموش رہے اور اسے ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہا۔

ابو کو سکینہ کے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی۔ اگر امی کبھی کہتیں بھی کہ چائے پی کر جائیں تو ابو کہتے کہ چائے تو میں سکینہ کے ہاتھ کی ہی پیوں گا۔'' نہ جانے کیوں ابو کا اس قدر لگاؤ سکینہ کی طرف تھا وہ اس کی بڑی سے بڑی بات بھی سہہ جاتے تھے۔

اور اپنے ساتھ کبھی بسکٹ، کبھی کیک بچوں کے لیے لے کر ہی جاتے تھے۔ اس روز یوں ہوا ابو سکینہ کی تمام باتیں سن کر چپ چاپ گھر واپس آگئے۔ کچھ ہی دیر بعد ابو کی طبیعت بگڑنے لگی اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوگئے۔ امی نے جلدی سے بھائیوں کو ساتھ لیا اور ابو کو ہسپتال لے گئیں۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ انہیں اٹیک ہوا ہے۔ جس بھتیجی کو ہمیشہ ہاتھ کا چھالا بنا کر انہیں اتنے چاہ و پیار سے رکھا تھا۔ آج وہی چھالا ان کے دل پر پھوٹا تھا۔

ابو اسپتال سے گھر آنے کے بعد بھی اداس اور کھوئے کھوئے رہتے تھے ان کی ذہنی کیفیت بڑی عجیب سی ہوگئی تھی۔

سکینہ نے لڑائی کے بعد ہم سب سے بولنا بند کر دیا۔ سامنے رہتے ہوئے بھی یہ سب برداشت کرنا ابو کے لیے مشکل تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں میرے بھائی نیچے پان کی دکان پر گئے تو سکینہ کا بڑا بیٹا راشد بھی وہیں کھڑا تھا۔ اس نے بھائی کو دیکھتے ہی گالی دی۔ اس کی اور بھائی پان کی دکان پر ہی لڑائی ہوگئی۔ اسی دوران پان کی دکان سے قینچی اٹھا کر بھائی کے بازو میں گھونپ دی۔ جس سے بھائی کے بازو کا گوشت کٹ گیا۔ زخمی حالت میں بھائی گھر آئے۔ اس حالت میں دیکھ کر امی کی چیخ نکل گئی۔ پھر امی ابو فوراً بھائی کو ہسپتال لے گئے جہاں اسے پانچ ٹانکے لگے۔

سکینہ نے لحاظ، مروت اور غیرت تقریباً چھوڑ دی تھی اس کے بچے بھی ہمیں راستے میں مار کر بھاگ جاتے، صورت حال بہت کشیدہ ہوگئی تھی۔ امی نے ابو سے کہا۔

''اس سے پہلے کہ کوئی برا نقصان ہو جائے، ہم یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلتے ہیں۔'' اس واقعے کے بعد ابو کا دل بھی سکینہ کی طرف سے بہت کھٹا ہوگیا تھا۔ ان کی ذہنی اور قلبی حالت بھی کافی متاثر ہوئی۔ لہٰذا یہ سب حالات دیکھتے ہوئے ابو نے ہامی بھر لی اور ہم لوگ وہ فلیٹ اونے

پونے میں بیچ کر کسی دوسری جگہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔

☆......☆......☆

ابھی ہمیں اس فلیٹ میں رہتے ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ابو کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا، کچھ لوگوں نے کہا۔

انہیں کسی عامل کے پاس لے کر جاؤ چونکہ امی نماز روزے کی بہت پابند تھیں، اس لیے امی نے ان باتوں پر دھیان نہ دیا۔ اور ڈاکٹروں سے ابو کا علاج جاری رکھا۔

ایک دن بھائی پریشان سا گھر آیا اور امی کو بتایا کہ ”ابو دھوپ میں بس اسٹاپ پر لیٹے ہوئے ہیں۔“ امی نے جلدی سے بھائی کو ساتھ لیا اور ٹیکسی میں ڈال کر ابو کو گھر لے آئے۔ اس دن کے بعد ابو کی طبیعت دن بدن بگڑتی چلی گئی۔ ابو سارا دن بستر پر ہی رہتے۔ ان کو نہلانا دھلانا سب بھائی اور امی مل کر کرتے تھے۔ ابو سارا دن گھر میں رہتے تھے۔ ایک بھائی پرچون کی دکان پر کام کرتا تھا۔ امی گھر میں کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں، بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا، اوپر سے ڈاکٹروں کی فیسیں اور دوائیوں کا خرچہ...... گھر کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ابو کی حالت مزید بگڑ گئی۔ ان کی زبان بالکل بند ہو گئی۔ کچھ بول نہ پاتے۔ ہم سب کو دیکھتے تو روتے، اسی حالت میں ابو کو ہسپتال میں داخل کر دیا۔ دوسرے دن شام کو عصر کے وقت ابو کا انتقال ہو گیا۔

ابو کے سوئم کے موقع پر ان کے دوست ہمارے گھر پر آئے، جو بہت پرہیزگار نمازی تھے۔ انہوں نے امی کو جو کچھ بتایا وہ ہمارے پیروں سے زمین کھسکا دینے کے لیے کافی تھا انہوں نے بتایا۔

”بھابی“ بھائی صاحب پر تو کسی نے بہت سخت کالا جادو کروایا ہوا تھا اور اسی وجہ سے ان کی موت ہوئی ہے۔“

یہ سن کر امی کو بہت افسوس بھی ہوا ایک دم ان کی زبان سے نکلا۔

”کاش! میں ان کا روحانی علاج بھی کروا لیتی۔“ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

☆......☆......☆

ابو کے انتقال کو چھ ماہ ہوئے تھے وہی 26 تاریخ اور جمعرات کا دن تھا کہ مغرب کے وقت اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ امی نے دروزاہ کھولا تو سکینہ کا بڑا بیٹا راشد کھڑا تھا۔ اسی نے میرے بھائی ندیم کو قینچی مار کر زخمی کیا تھا لیکن اس وقت امی نے اس سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ اس نے امی سے کہا۔ چاچی میری بہن جمیلہ کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”کیا!“ میری امی بہت ہی رقیق دل کی مالک تھیں۔ وہ کسی کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

”آج ہی رات کو اس کی تدفین ہے۔“

تھوڑی دیر بعد امی ان کے گھر گئی تو پتا چلا ان کی بیٹی جمیلہ جو ہمارے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی، جس کی عمر سولہ سال تھی۔ اسکول میں کسی درخت کے پاس کھیل رہی تھی کہ اسی درخت کے نیچے کسی ماورائی مخلوق (جن) کا بچہ سو رہا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے آ کے دب گیا اور مر گیا۔ اسی لیے اس (جن) نے جمیلہ کو دو تین مہینوں تک کافی اذیت دے کر مار ڈالا۔ مرتے وقت جمیلہ کے جسم پر نیل کے نشان واضح تھے۔ اس کے چند سال بعد ہی سکینہ کا بڑا بیٹا جس نے ندیم بھائی کو قینچی ماری تھی۔ اس کو کینسر ہو گیا۔ بہت لاچارگی اور بے بسی کی حالت میں اس کی موت ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے اسی لیے انہوں نے ہمارے ساتھ جیسا برا کیا تھا ویسا پھل پایا تھا۔

لیکن میں آج بھی جب یہ بات سوچتی ہوں کہ میرے ابو نے جسے اپنی ساری زندگی اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا، کسی کے لیے برا کرنا تو دور کی بات تھی، وہ کسی کے لیے برا سوچتے بھی نہ تھے، انہیں کس جرم کی سزا ملی کہ جوانی میں ان کی بیوی بیوہ اور چھوٹے بچے یتیم ہو گئے۔ ہم لوگ اب بھی اذیت میں مبتلا ہیں۔ خدا جانے ہمیں اس عذاب سے کب نجات ملے گی۔ کرے کوئی بھرے کوئی کہ مصداق تایا کی اولادوں کا کیا، ابا کی وفاؤں کا صلہ بھی ہمیں آج بھی بے سکونی کی صورت مل رہا ہے۔ یا پھر آستینوں میں سانپ پالنے کا یہی انجام ہوتا ہے؟

☆......☆......☆

تیسری سچ بیانی

# کٹی پتنگ

سیما عروج صدیقی

کراچی سے اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی زندگی کی ڈور ہمیشہ دوسروں ہاتھ رہی



دروازے پر کوئی بڑی دیر سے دستک دے رہا تھا۔ میں گہری نیند میں تھی۔ بمشکل اٹھی دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ کوئی بھکارن خستہ حلیے میں تین چھوٹی مگر پیاری پیاری بچیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ میں نے معاف کرو کہہ کر دروازہ بند کر دیا اور بڑبڑاتی ہوئی دوبارہ کمرے کی طرف چل دی۔

مجھے گہری نیند سے جاگنا اس وقت بہت ناگوار لگا تھا۔ تبھی دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

''اب کون آ گیا؟'' میں ایک بار پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ دیکھا تو وہی بھکارن آنکھوں میں نمی لیے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''سیما باجی آپ مجھے بھول گئیں۔ میں شہلا ہوں۔''

''شہلا؟'' میں نے اُسے بغور دیکھا مجھے شرمندگی سے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں جسے بھکارن سمجھ کر دروازہ بند کر آئی تھی وہ تو......

''اوہ تم آؤ آؤ اندر آؤ۔ اُف میں تو تمہیں بالکل نہیں پہچان سکی۔ تم اتنی بدل گئیں۔ مجھے تو تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی ہے اور بالکل یقین نہیں آ رہا۔ غور سے دیکھو تو بھی پہچان مشکل سے ہو رہی ہے۔ شہلا یہ تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے۔'' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی کا کرب کسی کو اتنا بھی بدل سکتا ہے۔

قریباً دس سال پرانی ہی تو بات تھی جب اس حسین لڑکی شہلا کو میں نے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنایا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ معصوم سی شہلا پر بہت روپ آیا تھا۔ اُن دنوں میں بیوٹی پارلر چلا رہی تھی۔ وہ اوپر والے پورشن میں کرائے پر رہتی تھی۔ گھر میں اُس کا نمبر دوسرا تھا۔ وہ سب بہن بھائیوں میں بالکل الگ تھی۔ گوری رنگت پیارے سے نقوش سراپا بھی بھرا بھرا تھا۔ ایک ہی نظر میں دل کو بھا جاتی۔ اُس پر بہت عزت اور محبت سے بات کرتی تھی۔ اُس پر اسے اپنے غریب کنبے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتی اور ساری تنخواہ ماں کو لا کر دے دیتی۔ جب سے یہ لوگ ہمارے اوپر کے پورشن میں کرائے پر آئے تھے ایک عجیب گہما گہمی رہتی۔

رات گئے جب اُس کا باپ آتا تو صبح تک اُس کے بڑبڑانے کی آوازیں آتیں، اکثر وہ اپنی بیوی کو گالیوں سے بھی نوازتا۔ فیکٹری سے آ کر کبھی کبھی شہلا میرے پاس آ جاتی تبھی اُس نے بتایا کہ اُس کا باپ ہمدرد کی کسی برانچ میں کام کرتا تھا۔ وہاں سے نوکری ختم ہونے کے بعد اب ابا کچھ نسخوں پر ہی گھر چلاتے ہیں۔ وہ مردوں کو دوائیں بنا کر دیتے ہیں اور کبھی مہینے پندرہ دن میں اماں کے ہاتھ پر کچھ رکھتے ہیں۔ چھوٹا بھائی اکلوتا ہونے کی وجہ سے بگڑتا جا رہا ہے۔ لاڈ پیار کی وجہ سے وہ بُری صحبت میں پڑ گیا ہے۔ کام کرنے سے جی چراتا ہے۔ اب گھر کا گزارا مجھ پر اور چھوٹی بہن پر ہی ہے۔ ہم دونوں کی تنخواہ سے بھلا گھر کیسے چل سکتا ہے؟ ہمارے گھر میں اکثر فاقے ہوتے ہیں اور اکثر میں بھی بھوکی ہی فیکٹری چلی جاتی ہوں۔ کبھی کبھی صبح شام چائے پاپا اور پراٹھا کھا کھا کر دل بری طرح اُکتا جاتا ہے۔

جب شہلا نے یہ بتایا تو میں نے اُن کے حالات کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ واقعی اُن کے گھر کی حالت بہت بُری تھی۔ باپ نہ صرف بگڑا نواب تھا بلکہ نجانے کن رنگینیوں میں مست تھا کہ صبح کے تیسرے پہر وہ گھر میں گھستا مجھے کچھ کچھ شبہ ہوا کہ وہ نشہ بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو بدمست ہاتھی کی طرح بیوی کے ساتھ ساتھ جوان بچیوں کو بھی مارنے سے گریز نہ کرتا۔

شہلا ایسی جی دار تھی جو باپ کو کبھی کبھی آئینہ دکھا دیتی جس پر وہ اُسے بدزبان منہ زور کہہ کر اُسے جانوروں کی طرح پیٹ ڈالتا۔ میں نے ایسا ظالم باپ اب تک نہیں دیکھا تھا۔ ایک روز شہلا آئی تو اُس کے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ پہلی بار اُسے دیکھ کر ایسا لگا چاند پر داغ پڑ گیا ہو۔ یہ کارنامہ بھی اُس کے ظالم باپ کا تھا۔ اُس کی تو اتنی استطاعت بھی نہیں تھی کہ وہ نئے دانت لگوا لیتی تبھی اُس نے مجھے بتایا کہ سیما باجی یہ جو میری امی لنگڑا لنگڑا کر چلتی ہیں۔ خرکار تو بھیک منگوانے کے لیے ٹانگیں توڑتے ہیں۔ ہمارے باپ نے امی کی ٹانگ اپنے ظلم سے توڑ دی اور علاج بھی نہیں کروایا۔ میری امی بھی نجانے کون سی مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ اسی ٹوٹی ٹانگ سے ہی زندگی کو گھسیٹ رہی ہیں۔

میں نے دیکھا کہ اُن کے گھر کھانا کئی کئی روز نہ پکتا بلکہ اب تو روز ہی صبح صبح شہلا کی ماں بیرونی دروازہ کھٹکھٹا کر مجھ سے کچھ نہ کچھ مانگتی کبھی چینی، کبھی سالن، حد یہ کہ روٹی تک وہ لینے پر مجبور ہوتی کہ گھر میں آٹا نہ ہوتا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز وہ مجھ سے لینے آ جاتیں۔ نہ صرف مجھ سے بلکہ محلے بھر سے وہ ضروریات زندگی کی ہر چیز مانگ لیا

کرتیں۔ کافی حد تک اس طرح وہ گزرا کیا کرتیں تھیں۔

انہوں نے محلے میں دعا سلام بڑھا رکھی تھی۔ لوگ انہیں مجبور جان کر اکثر و بیشتر مدد بھی کر دیا کرتے تھے۔ لیکن کیونکہ میں اُن کی مالک مکان اور ہمسائی بھی تھی۔ سب سے زیادہ انہوں نے میری ہی ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ جس سے میں پریشان ہونے لگی تھی۔ اگرچہ میں حتیٰ الامکان اُن کی مدد کرتی تھی میں بھی کوئی چیز نہ کھاتی جب تک اوپر نہ بھیج دیتی۔ مجھے اچھا نہ لگتا کہ میں مزے دار کھانا کھاؤں اور نجانے اوپر والے بھوکے ہوں۔ میں مالی مدد بھی کر دیا کرتی۔

کبھی کبھی میں شہلا کی امی کو کھری کھری سنا بھی دیا کرتی کہ آپ نے اپنے شوہر کو بگاڑا ہے۔ بچیوں کو بھوکا فیکٹری بھیج کر میاں اور لڑکے کے لیے کہیں نہ کہیں سے مرغ مسلم کا انتظام کرنے نکل جاتی ہو۔ خود نہ کھاؤ مگر ان کا پیٹ ضرور بھرنا ہے۔ وہ انسان کپڑے بھی فیکٹری کے کلف لگے پہنتا اور زور بیوی پر ہوتا کہ تُو نے دھلوا کر کیوں نہ رکھے۔ نہ جانے وہ عورت واقعی اتنی محبت میں پاگل تھی بیٹے اور میاں کے یا ڈر اور خوف سے اُس کے تمام تقاضے پورے کرتی۔ صبح تک گالیاں کھاتی مگر اُف نہ کرتی اور ٹانگیں دباتی۔ دن ایک بجے جب میاں ہیرو بن کر گھر سے نکل جاتا تو وہ کبھی نیچے آ کر بیٹھ جاتی یا محلے میں چلی جاتی۔ میرا ذاتی تجربہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے اور شوہر سے بے حد محبت کرتی تھی۔ کیونکہ جب میں کہتی کہ ایسے آدمی کو تو گھر نہ گھسنے دو، اتنی خدمت گاریوں کے بعد جو دو بول میٹھے نہ بولے اور نہ کمائے کیا فائدہ ایسے آدمی کا۔''

تو وہ ہنس دیتی میں اُس کے ہنسنے پر بس یہ کہہ کر رہ جاتی کہ واقعی بھئی تم تو جنتی ہو۔'' شہلا کی ماں نے کبھی زبان نہ کھولی کہ اُس کا میاں دن ایک بجے سے صبح پانچ بجے تک کون سا کام کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟''

کبھی کبھی مجھے شہلا کی ماں تمام صورت حال میں قصور وار لگتی کہ شاید انہیں اس طرح کی زندگی کی عادت پڑ گئی ہے۔ اور اُن کا زیادہ حصہ تھا اپنے شوہر اور بیٹے کو ہڈحرام بنانے میں۔ جبکہ بچیاں بہت سادہ بھولی اور محنتی تھیں۔ بھوک اور مشقت سے اُن کے خون خشک ہو گئے

## اللہ والے

ایک ولی سے ابلیس نے کہا۔ '' تجھے اللہ پر بہت یقین ہے تو اونچے پہاڑ پر چڑھ کر چھلانگ لگا دے۔ دیکھتے ہیں کہ تیرا اللہ تجھے بچاتا ہے کہ نہیں۔''

ولی نے جواب دیا۔ '' یہ اللہ کا کام ہے کہ مجھے آزمائے، یہ میرا کام نہیں کہ میں اُسے آزماؤں۔''

مرسلہ: غزالہ ملک۔ بحرین

تھے۔ وہ جانوروں کی طرح کام کر رہی تھیں۔ اُس پر انہیں کچھ بھی میسر نہ تھا۔

اُن ہی دنوں شہلا نے بتایا کہ فیکٹری سے کسی لڑکے نے اُس کے گھر رشتہ بھیجا ہے۔ وہ اِس رشتے سے خوش تھی۔

پھر کچھ دن بعد میری شہلا سے ملاقات ہوئی تو اُس نے بتایا کہ ابو نے اُس رشتے کو منع کر کے اپنے دوست کے بیٹے شان سے اُس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' سپاٹ لہجہ اُس کے کرب کا پتا دے رہا تھا۔

''اچھا کیا تم نے لڑکے کو دیکھا ہے۔''

''جی باجی دیکھا ہے۔''

''کیسا ہے؟''

''بس ٹھیک ہی ہوگا، مجھے زیادہ معلوم نہیں بس اتنا پتا ہے کہ وہ مجھ سے عمر میں کچھ چھوٹا ہے۔ سچ کہوں باجی! میرا دل اس رشتے پر اندر سے خوش نہیں مگر یہ سوچ کر خوش ہوں کہ اس جہنم سے تو نجات ملے گی۔''

مگر شہلا کو علم نہ تھا کہ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں جھونکی جا رہی تھی۔ اُس کے باپ نے بھی اپنی اولاد بیوی بچوں کو خوشی نہیں دی تھی وہ تو صرف ظلم کرنا جانتا تھا اور کسی کو نہیں پتا تھا کہ اس بار بھی وہ ایک ظلم کا پہاڑ اپنی پھول سی بیٹی پر ڈھانے کو تیار تھا۔

☆......☆......☆

جلد ہی وہ دن بھی آ گیا جب شہلا کو میں نے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنایا۔ وہ خوش دکھائی دیتی تھی اور بار بار

کہتی کہ دعا کرنا باجی میری زندگی اچھی گزرے۔ میری زندگی میں تبدیلی آجائے۔''

وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ نجانے شادی کے انتظامات کس نے اور کس طرح کیے تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے حالات اتنے خراب تھے پھر یہ کھانا، جہیز سب ہی کچھ اچھی طرح سے ہو رہا تھا۔ بہرحال میں یہ سوچ کر مطمئن ہوگئی کہ لڑکی کی شادی میں کہتے ہیں اللہ مدد کرتا ہے۔

شہلا رخصت ہو کر چلی گئی۔ کچھ عرصہ بعد اُن لوگوں نے ہمارا گھر چھوڑ کر کہیں اور کرائے پر لے لیا۔ یوں میں اُن لوگوں کو بھول بھال گئی اور آج شہلا کو اتنے سالوں بعد دیکھ کر میری نظروں میں اُس کا عروسی لباس میں کھلا کھلا چہرہ گھوم گیا تھا۔ مگر آج وہ نقاہت سے کھڑی بھی نہیں ہو پارہی تھی۔ میں نے اُسے بٹھایا، پانی پلایا۔ مجھے لگا وہ اور اُس کی بچیاں بھوکی پیاسی ہیں۔ میں نے اُس سے کھانے کا پوچھا تو وہ شرمندہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔

''جی باجی اگر ہے تو دے دیں۔''

میں نے دیکھا وہ کھانا بہت مشکل سے کھا رہی تھی۔ اُس سے کھانا کھایا نہیں جا رہا تھا، شاید وہ بیمار تھی اور ایسا ہی تھا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ تسلی سے بیٹھی تو اُس نے بتایا کہ اُسے گلے میں گلٹیاں ہوگئی ہیں۔ ہاتھوں پیروں کی ہڈیاں بھی مڑ رہی ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں گلے میں کینسر کا شبہ ہے اور ہڈیوں پر بھی اُس کا اثر پڑ رہا ہے۔ باجی مجھ سے کھانا بڑی مشکل سے کھایا جاتا ہے۔ پانی نگلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔''

''تم نے علاج کروایا۔''

''نہیں باجی کیسے علاج کرواؤں۔ میرے پاس کھانے کو نہیں ہے، اُس پر یہ معصوم تین بچیاں۔''

''تمہارا شوہر؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ تو باجی میرے باپ سے بھی زیادہ خراب آدمی نکلا۔ کون سا برا کام ہے جو وہ نہیں کرتا ہے۔ جواری وہ ہے، نشہ وہ کرتا ہے، چیٹر بھی ہے لوگوں کے پیسے کھا جاتا ہے۔ جب جیل سے آتا ہے نشے میں مجھے بہت مارتا ہے مگر بعد میں معافیاں مانگتا ہے۔ بیٹے کی آس میں یہ تین بیٹیاں بھی ہوگئیں مگر پھر بھی اُسے ذرا غیرت نہ آئی۔ شروع شروع میں تو وہ میرے ساتھ اچھا تھا۔ باجی اُس نے میرے دانت بھی لگوا دیے تھے جو ابو نے مار کر توڑ دیے تھے۔'' اُس نے مسکرا کر کہا۔

''تُو بہت بھولی ہے شہلا۔ تیری زندگی برباد ہوگئی ہے تجھے نظر نہیں آتا۔''

''باجی کیا کریں شاید نصیب ہی ایسا ہے۔''

''تمہارے باپ کو پتا نہیں تھا کہ یہ اتنا برا ہے۔''

''ہاں باجی ابو کو سب پتا تھا۔ یہ سب ابو کا ہی تو کیا دھرا ہے۔ شان نے ابو کو میری منہ مانگی قیمت دی تھی۔ اب جب میں بھوکی پیاسی باپ کے در پر آتی ہوں کہ میرے بچے بھوکے بلک رہے ہیں۔ میرے پاس کرایہ تک نہیں ہوتا۔ پیدل بچوں کو میلوں چلا کر لائی ہوں تو باپ میرے شوہر سے ڈر کر مجھے لوٹا دیتا ہے۔ کہتا ہے ہمارا اب تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ماں کہتی ہے مت آیا کر۔ یہاں خود ہم فاقے سے ہیں، تجھے کہاں سے کھلائیں۔ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں جیسا کوئی گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں سے کرتا ہے۔ ماں باپ کی مرضی سے میں رخصت ہوئی یوں پھر میرے ساتھ یہ سلوک ہے۔ شان جیل میں ہے۔ وہ وہاں سے تقاضہ کرتا ہے کہ مجھے ضمانت پر رہا کروا یا پیسے بھیج۔ میں اس حال میں اس کی کیا خبر رکھوں۔ جب جیل سے آتا ہے تو اسی بات پر مارتا ہے کہ تُو نے کچھ نہیں کیا میرے لیے۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس بے سہارا کا کیا بنے گا۔ اُس نے بتایا کہ گھر اپنا ہے۔ جہاں وہ سر چھپائے ہوئے ہے۔ مگر اس کے دیور جیٹھ جو اُس کے گھر کے قریب رہتے ہیں۔ روز روز کے انہی چکروں سے عاجز آکر اب اُس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔'' یہ کہہ کر وہ بالکل خاموش ہوگئی۔ یعنی اب اُس کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔

یہ تھی شہلا کی کہانی جو کسی کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہی تھی۔ نجانے کب اس پتنگ کی ڈور کٹ جائے تو اس کی پھول سی بچیوں کا کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میرا دل ہول اٹھتا ہے۔ بس دل سے دعا کرتی ہوں اللہ شہلا اور اس کی بچیوں پر اپنا رحم و کرم فرمائے آمین۔

☆☆......☆☆

چوتھی سچ بیانی

# سایوں پر نقش

ثمینہ فیاض

ممتا کی طاقت ہر روپ میں اپنا آپ منوا لیتی ہے، آہنی اعصاب رکھنے والی ایک ماں کی داستانِ الم



لوڈشیڈنگ سے پریشان ہو کر میں اکثر اپنے گھر کے پاس بنے ایک پارک میں چلی جایا کرتی تھی، وہیں میری ملاقات الینہ آنٹی سے ہوئی۔ نام تو ان کا کچھ اور ہے لیکن میں الینہ ہی لکھ رہی ہوں اور چونکہ ہم تقریباً روز ہی ایک وقت پر ملتی تھیں تو اچھی دوستی ہو گئی۔

ایک دن جب وہ پارک آئیں تو میں نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں تو کہنے لگیں زندگی نے اتنے رنگ دکھا دیے ہیں۔ اب کیا میں کسی کو اپنے بارے میں بتاؤں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔'' مجھے ان کی بات سن کر کچھ عجیب سی حیرت کا احساس ہوا۔ بظاہر تو وہ ایک خوش پوش فیملی کی خوشحال خاتون لگتی تھیں۔ ان کی باتیں بھی زندگی سے بھرپور ہوا کرتی تھیں۔ میں نے ان کو کبھی اداس نہیں دیکھا تھا ہمیشہ مسکراتی ہوئی ہی ملتی تھیں پر آج اس قسم کی بات پر میں چونک گئی۔ میں نے ان سے اصرار کیا کہ میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' تو کچھ تامل کے بعد وہ اپنی کہانی بتانے پر راضی ہو گئیں۔

ان کی کہانی ان ہی کی زبانی سنیے۔

☆......☆......☆

''میرا تعلق ایک مڈل کلاس فیملی سے تھا۔ میری شادی ہوئی جیسے سب عام لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ ماں باپ کی دعاؤں میں، میں رخصت ہوئی۔ اچھی زندگی گزر رہی تھی۔ شادی کے پانچ سال میں ہماری فیملی بن گئی۔ جس میں میرے شوہر نعیم اور ایک بیٹی فروا شامل تھی۔ جو ابھی چار سال کی تھی میں اپنی فیملی کے ساتھ بہت خوش تھی فروا سے بہت پیار کرتی اور اسے بھرپور توجہ دیتی۔ اچھی باتیں سکھاتی اس کی بہترین تربیت کے لیے کوشاں رہتی۔ نعیم بھی میرے ساتھ مل کر فروا کی اچھی تعلیم اور مستقبل کے خواب دیکھتے۔ ہم دونوں ہی جدوجہد کر رہے تھے کہ اپنی فیملی کے اسٹینڈرڈ کو بڑھا سکیں دن رات کی محنت کا ثمر ہماری خوشحالی کی صورت ملنا شروع ہو گیا تھا کہ اچانک دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر نعیم اس دنیا میں ہم دونوں ماں بیٹی کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

میں اس صدمے سے نکلنے کی پوری کوشش کر رہی تھی کیونکہ اب مجھے اکیلے ہی اپنی بچی کو سنبھالنا تھا۔ میں اپنے دکھ کو بھول کر فروا کے مستقبل کے لیے پریشان تھی۔

میں ایک دم سے فائینینشل کرائسس کا شکار ہو چکی تھی نعیم کا اپنا گھر تھا لیکن عدت کے لیے میکے آ گئی۔ میکے میں صرف میرے بھائی اور بھابی تھے ماں باپ کا بہت پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ گھریلو اخراجات کے لیے عدت تک تو بھائی بھابی نے ساتھ دے دیا تھا مگر اس کے بعد وہ بھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ ان کی اپنی آمدنی کم ہونے اور اس اچانک خرچے پر بھابی کے تیور اور طنز و طعنے مجھ سے برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ سارے گھر کا کام کرنے کے باوجود انہیں میرا وجود بوجھ لگنے لگا تھا بات بے بات فروا اب ان کے ہاتھوں پٹنے لگی تھی ان سب وجوہات کی بنا پر میں نے نوکری کی تلاش شروع کر دی بہت سی جگہوں پر اپلائی کیا۔ جگہ جگہ دھکے کھانے کے باوجود تعلیم کی کمی کے باعث نوکری نہیں ملی۔ میں نے اپنی سہیلی سے اس سلسلے میں بات کی۔ اس کے شوہر ٹی وی میں کہیں کام کرتے تھے اور ایک ٹی وی چینل میں ریسپشنسٹ کی جاب کے لیے میں نے اپلائی کر دیا تھا۔ نوکری تو نہیں ملی لیکن اتفاق سے ایک جونیئر آرٹسٹ کا کردار کی آفر مل گئی تھی۔ میں نے پیسے سن کر کام کر لیا تھا کم ہی سہی مگر نہ ہونے سے تو بہتر ہی تھا۔ عزت کی چٹنی روٹی تو مل جاتی۔

میں نے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کئی دن مختلف جگہوں پر چھوٹے چھوٹے رول کرنے پر مجھے کچھ پیسے مل گئے تھے۔ اس بات کا ذکر جب میں نے خوشی خوشی گھر جا کر کیا تو بھائی ٹی وی پر کام کرنے کا سن کر غصہ کرنے لگے۔ کئی دنوں تک جب میں ہر دفتر میں نوکری تلاش کر رہی تھی تو کسی کو بھی میری پروا نہ تھی کہ میں کیسے اتنی محنت کروں گی وہ تو بس اپنی زندگی میں ہی مگن تھے اور پھر سارا دن تھک کر جب میں گھر آتی تو بھابی کے تیور دیکھ کر سارے دن کی بھوکی پیاسی ہو کر بھی میری بھوک ویسے ہی مر جاتی اور اس دن جب مجھے چند پیسے میری محنت کی کمائی کے مل گئے تھے

تو میرے بھائی کی غیرت اچانک جاگ اٹھی تھی پھر اس ساری صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے میری بچی کو رکھنے سے انکار کر دیا اور مجھے فوری طور پر نعیم کے گھر جانے کے لیے کہہ دیا گیا۔ میں بہت پریشان ہوئی تھی پر جانا تو تھا۔ سو میں نعیم کے گھر واپس آ گئی۔ اب اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ مجھے ہی پالنا تھا۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسے اکیلے گھر میں چھوڑ نہیں سکتی تھی اس لیے مجھے ٹی وی اسٹیشن پر فروا کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ کام کے دوران فروا کبھی مجھے تنگ کرتی تو کبھی لوگوں سے کوئی غلط بات کو سن کر سوال کرتی مگر میں مجبور تھی۔ میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہ تھا اس لیے کام کرتی رہی۔ تھوڑا بہت کما بھی لیتی تھی جس سے راشن پانی کی ضرورت پوری ہو رہی تھی مگر فروا کے اسکول اور اس کی تربیت کی بارے میں سوچ کر میں اب بھی بہت فکر مند تھی۔ مجھے جونیئر آرٹسٹ کے کئی رول مل چکے تھے۔''

الینہ آنٹی کی آواز بھر آ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے اپنے ساتھ لائی ہوئی منرل واٹر کی بوتل ان کی جانب بڑھا دی۔ وہ کچھ لمحے کے لیے خاموش ہو گئی تھیں پھر جیسے پانی پینے سے ان کے دل کو سکون ملا تھا اور انہوں نے بات وہیں سے شروع کر دی جہاں رکی تھیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی کہہ رہی تھیں۔

''لوگوں کے رویے بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدل ہی جاتے ہیں، چاہے بعد میں کتنا ہی آرام اور آسائشیں مل جائیں پر کچھ وقت اتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ ان کی چبھن مرتے دم تک دل سے نہیں جاتی۔

ایک رات جب میں ٹی وی اسٹیشن سے گھر واپس آ رہی تھی۔ اس رات زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی اور کوئی تین بج رہے تھے۔ پورا راستہ سنسان تھا۔ سناٹے کی وجہ سے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا مگر گھر تو جانا ہی تھا سو ہم جا رہے تھے کہ راستے میں کچھ غنڈے مل گئے۔ جو بد تمیزی کرنے لگے میں بھاگ نکلی تھی لیکن انہوں نے فروا کو پکڑ لیا۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں پلٹ کر واپس آئی اور ان سے لڑنے لگی۔ عورت ذات کا ان موٹے موٹے غنڈوں سے لڑنا آسان کام

## کولمبس کے دعویدار

کرسٹوفر کولمبس (1447-1506) کے انتقال کے فوری بعد یہ تعین نہ ہو پایا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور اس کی مقبولیت کی وجہ سے تیس مختلف شہر ایسے تھے کہ جن کا دعویٰ تھا کہ کولمبس اس شہر کا باشندہ تھا۔ کولمبس کی جائے پیدائش کے ساتھ ساتھ تاریخ پیدائش سے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ چھبیس مختلف تاریخیں اُس کی پیدائش کی بتائی جاتی ہیں اور سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس کو مرنے کے بعد ایک بار دفن نہیں کیا گیا بلکہ اُسے آٹھ بار ایک جگہ سے دوسری جگہ نکال کر دفن کیا گیا تھا۔

مرسلہ: توصیف خان۔ کراچی

نہیں تھا لیکن کسی بھی طرح مجھے اپنی بچی کو بچانا تھا اور میں نے فروا سے کہا تم بھاگو میں آتی ہوں۔ میں انہیں روک رہی تھی۔ ان سے لڑ رہی تھی لوگ سمجھتے ہیں کہ گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت آوارہ ہے اور اپنی بد کرداری کی وجہ سے کام کرنے نکلی ہے لیکن کوئی بھی اس عورت کی پریشانی کو نہیں سمجھتا جو ماں ہے اور اس کے بچے بھوکے ہیں۔

فروا خود چھوٹی سی بچی تھی اُسے اتنی سمجھ تو تھی نہیں۔ وہ بھاگتی ہی چلی گئی اور گم ہو گئی۔ وہاں سے ایک آدمی گزر رہا تھا انہوں نے غنڈوں سے لڑتے اور خود کو بچانے کی کوشش کرتے دیکھ کر مجھے بچایا تھا۔''

الینہ آنٹی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی ہنس کر کہنے لگیں۔ ''کسی فلمی ہیرو کی کہانی لگتی ہے نہ، پر یہ سچ میں میرے ساتھ ہوا ہے۔'' پھر اپنی بات کو شروع کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

''میرا ان سے تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ تو نعیم کے دوست شفیق ہیں۔ نعیم کے منہ سے ان کا کافی ذکر سن چکی تھی لیکن کبھی ملی نہ تھی۔ در حقیقت ان سب حالات سے پہلے میں بھی ایک سیدھی سادی گھریلو خا

تون تھی جسے صرف اپنی گھر داری سے دلچسپی ہوتی ہے۔'' ایک ٹھنڈی آہ کے ساتھ انہوں نے اپنی بات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

''خیر پھر ہم دونوں مل کر فروا کو ڈھونڈ رہے تھے لیکن فروا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ ساری رات گزر گئی تھی۔ دن بھر ہم دونوں مل کر فروا کو مختلف اسپتالوں، تھانے اور اسی علاقے کی مسجدوں سے اعلان کرواتے پھر رہے تھے آخر مجھے ایک فلاحی ادارے کا خیال آیا تھا وہاں معلوم کرنے پر فروا ہمیں مل گئی۔

اس کے بعد شفیق آئے دن خدا ترسی میں ہماری غربت کے سبب کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے دوست کی وجہ سے بھی میرا خیال کرتے کہ بیوہ ہوں، کس طرح سارے کام کروں گی اسی سوچ کے تحت وہ کبھی ہمارے گھر کے چھوٹے موٹے کام جیسے سودا لانا اور بل جمع کروانا بھی کر دیا کرتے تھے حالانکہ وہ کبھی گھر کے اندر نہیں آئے صرف دروازے سے ہی لوٹ جاتے تھے۔

خاندان اور محلے والوں سے تو ویسے بھی مجھے کوئی توقع رہی نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو میں ٹی وی پر کام کر رہی تھی دوسرے ہمارے گھر اب ایک نامحرم مرد کا آنا جانا دیکھ کر لوگوں نے بدکرداری کا الزام بھی میرے ماتھے پر سجانا شروع کر دیا تھا اور اس دن تو حد ہی ہوگئی تھی۔ محلے کے کچھ مرد حضرات نے شفیق کو راستے میں روک لیا اور ان سے خوب باز پرس کی کہ تم الینہ کے کیا لگتے ہو جو اس طرح اس کے گھر آتے جاتے ہو۔ آج وہی محلے والے جو ہمیں بھوکا مرتا دیکھ رہے تھے کبھی کوئی یہ نہ پوچھتا تھا کہ تم نے کتنے دن سے کچھ کھایا بھی کہ نہیں کتنے دن سے فاقہ سے ہو۔ آج اچانک ان کی غیرت بھی جاگ اٹھی تھی اور اسلام کی ساری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ بس یہ ہی یاد نہ تھا کہ پڑوسیوں اور رشتے داروں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔''

الینہ آنٹی کے لہجے میں میں نے واضح طنز دیکھا تھا۔

''شفیق نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ ان سب باتوں کے بعد شفیق مجھ سے ملے اور انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ ایک حادثہ میں ان کی بیوی اور دو بچے گھر میں آگ لگنے کے سبب جل کر دنیا سے چلے گئے ہیں اور وہ اب اپنے ایک دس سال کے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں جسے سنبھالنا کم از کم ان کے لیے کافی مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے شادی کے لیے پرپوز کر دیا۔ ان کے بیٹے اور اپنی بیٹی دونوں کی تربیت اور اس مشکل بھری زندگی کو میں اکیلے نہیں چلا سکتی تھی۔ انہی سب باتوں کا خیال کر کے میں یہ سب سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

میں پوری رات سوچتی رہی کہ ان چند مہینوں میں میں کن کن مشکلات سے گزری ہوں لیکن جیسے ہی مجھے اپنی فروا کے مستقبل کا خیال آیا تو صرف اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ اگر شفیق نہ ہوتے تو میں اپنی فروا کو کبھی نہ ڈھونڈ پاتی اور ٹی وی اسٹیشن میں فروا غیر لوگوں کے بیچ پل رہی تھی۔ جہاں اچھے برے ہر طرح کے لوگ موجود تھے ایسے میں وہ اسکول بھی نہیں جا سکتی تھی ان سب وجوہات کی بنا پر میں شادی کرنے پر راضی ہوگئی تھی۔ دنیا چاہے جو بھی کہے میرا دل صاف تھا میرا رب جانتا ہے میرا کسی سے کوئی عشق عاشقی والا چکر نہیں تھا۔ میں نے جو بھی کیا اسلام کے دائرے میں رہ کر کیا۔ نکاح کرنا جرم نہیں ہے۔ بہرحال وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔''

وہ بات کرتے کرتے جیسے کہیں کھوسی گئی تھیں شاید ماضی کی کچھ اور یادیں ان کے دماغ کو جھنجھوڑ رہی تھیں میں انہیں واپس حقیقت میں لے آئی۔

''پھر کیا ہوا آنٹی۔'' وہ جیسے چونک گئیں۔

''ہاں پھر!'' انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''انہی دنوں مجھے ٹی وی اسٹیشن سے ایک ڈرامے کے لیے لیڈ رول کی آفر آئی تھی لیکن شفیق نے شرط رکھی تھی کہ اب تم کام نہیں کرو گی اس لیے میں اپنے کیریئر کو چھوڑ کر بچوں پر توجہ دینے لگی۔ اب مجھ میں صرف ایک ماں تھی جس نے اپنے کیریئر اور اپنی محنت سے حاصل کیے ہوئے اس سنہری موقع کو چھوڑ کر صرف اپنی بچی کی خاطر ہر شرط کو منظور کر لیا تھا۔ میں دل سے مطمئن تھی ایک بار پھر زندگی جینا چاہتی تھی۔ اس ٹوٹے ہوئے گھر کو پھر گھر بنانا چاہتی تھی۔ میرے

پیار اور توجہ سے میرا سوتیلا بیٹا سائم بھی مجھ سے ممتا کی توقع رکھنے لگا اور میں اس کی توقع پر پوری اترنے لگی۔ میں اسے بھی بہت پیار سے پال رہی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں سائم مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ ہماری پوری فیملی خوشی سے زندگی گزار رہی تھی زندگی کے سارے ہی رنگ واپس آ گئے تھے۔ اب دونوں بچے ایک دوسرے کو سگے بہن بھائی کی طرح چاہنے لگے تھے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے تو کبھی کبھی کسی کھیل کے دوران لڑنے بھی لگتے۔ میں دونوں بچوں کو انصاف سے اور پیار سے سمجھاتی تو کبھی ان پر لڑنے کی سزا میں خوب ڈانٹتی۔ کبھی کبھی بیٹے کا ساتھ دیتی تو کبھی اپنی بیٹی کی حمایت کرتی۔ دونوں بچے ایک ہی اسکول میں پڑھ رہے تھے۔

شفیق نے ایک چھوٹی سی گارمنٹس فیکٹری لگائی تھی اور اس سے اچھی آمدنی ہو رہی تھی وہ مختلف بوتیکس پر ریڈیمیڈ کپڑے بنا کر سپلائی کرتے تھے۔ بھائی بھابی سے بھی ہمارے مراسم اچھے ہو گئے تھے۔ محلے والے بھی اب عزت کرنے لگے تھے اس سارے عرصے میں زندگی نے اتنی کروٹیں لیں کہ لوگوں کے چہروں پر چڑھے نقاب واضح ہو گئے۔ سارے بھرم ٹوٹ گئے۔ الینہ آنٹی کی آنکھوں میں اس دن میں نے پہلی اور شاید آخری بار نمی تیرتی دیکھی تھی۔ واقعی وہ ایک بہت باہمت خاتون تھیں۔ اپنی آنکھیں صاف کرتے کرتے انہوں نے ایک بار پھر اپنی بات کہنا شروع کی۔

''پھر اچانک وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا مگر شاید یہی میرے نصیب میں لکھا تھا۔ شفیق کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ اس حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ ہم اپنے دونوں بچوں کا اسکول میں داخلہ کرا چکے تھے اور اخراجات کا بوجھ پھر میرے ناتواں کندھوں پر آ گیا تھا اس لیے مجھے پھر کام شروع کرنا پڑا۔ ایک بار پھر میں اسی دوراہے پر آ کھڑی ہوئی تھی جس سے ایک بار پہلے گزر چکی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری لیکن اب کی بار شفیق کی گارمنٹس فیکٹری کو سنبھالنے لگی ساتھ ساتھ دونوں بچوں کو بھی پالتی رہی اور ان کی بہترین تربیت کرتی رہی۔ آج میرا وہی بیٹا انجینئرنگ کالج میں فائنل ایئر کا اسٹوڈینٹ ہے اور بیٹی انٹر پری میڈیکل سے کر رہی ہے میرا ارادہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا ہے۔ یہ تھی میری زندگی کی کہانی آج میرے وہی بھائی جو مجھے اس دور میں چھوڑ بیٹھے تھے جب مجھے ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی میرے کردار پر کیچڑ اچھال کر بے گھر کرنے والے آج اسی بہن کے بیٹے سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنا حق جتا کر گئے ہیں۔ سوچتی ہوں اب کیا جواب دوں یہی سوچ کر دل بھر آیا اور کسی سے کہنے کو دل چاہا تو تم کو سب کچھ بتا دیا۔ کبھی کبھی ایک ایسے شخص کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس سے آپ اپنے دل کی ہر بات کہہ دیں تو دل کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔''

وہ سب کہہ کر واقعی ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھیں ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ تھی۔ اس دن میری نظر میں ان عام سی نظر آنے والی خاتون کی عزت اور بھی بڑھ گئی اور میں سوچنے لگی اس ایک جذبے ممتا میں میرے رب نے کتنی طاقت رکھی ہے کہ قربانیاں دے کر، ہر رشتے کو کھو کر بھی صرف اولاد کے لیے ہر ستم سہہ جانا اور زندگی کو آگے بڑھانا۔ ممتا صرف گھر بیٹھ کر بچوں کو پالنے اور ان کی اچھی تربیت کا ہی نام نہیں بلکہ ان بچوں کے لیے دنیا سے لڑنا بھی پڑے یا کمانا پڑے تو ان کی خاطر یہ بھی کر گزرنا ممتا ہے۔ ان ہی بچوں کی خاطر اپنی محنت سے حاصل کیے گئے سنہری موقع کو چھوڑ دینا بھی ممتا ہے لوگ کہتے ہیں ورکنگ وومن اچھی ماں نہیں بن سکتی۔ یہ بات بھی غلط ثابت ہو گئی۔ سوتیلی ماں بھی ممتا دے سکتی ہے۔ ماں کی ممتا ہر روپ میں موجود رہتی ہے اور میں سمجھتی ہوں ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی الینہ آنٹی جیسی خواتین ہوں گی جو اپنے بچوں کے لیے ہنستے ہنستے قربانیاں دے کر زندگی گزار دیتی ہوں گی۔ اسی لیے تو ہمارے پیدا کرنے والے نے ماں کے پیروں تلے جنت رکھ دی ہے۔ ابر میں ابر چھپے ہوتے ہیں اور مائیں سایوں پر نقش بناتی جاتی ہیں۔ ممتا لٹاتی جاتی ہیں۔

☆☆......☆☆

# میں خوشی ہوں



ایم یعقوب

ڈیرہ غازی خان سے اُس دوشیزہ کی کتھا جسے بے اعتباری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا





''میرا نام خوشی ہے اور میں ڈی جی خان سٹی صدر میں رہتی ہوں۔'' دھیمی آواز میں بات کرتی خوشی اپنے اوپر ظلم وستم کی فریاد بیان کر رہی تھی۔ ظلم وتشدد سے ٹیڑھی ناک اور جلا ہوا سیدھا ہاتھ اس کی گزری زندگی کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر انسان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا مگر......

''آج کے اس دور میں کون کسی کا اپنا ہے۔'' آہستہ آہستہ خوشی کی آواز بھرائی۔ آنکھیں خشک تھیں مگر دل کو قرار نہ تھا۔

''میں نے ایک بہت ہی بڑے امیر گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ مجھ سے بڑے دو بھائی ہیں اور مجھ سے چھوٹی بہن، ہمارے علاوہ میری دوسری سوتیلی ماں سے دو بھائی اور دو بہنیں سوتیلی تھیں۔ گھر میں نوکر چاکر، خاکروب، کپڑے دھونے والی ماسی، کھانا بنانے والی ماسی کار، بنگلہ، آرام وآسائش کسی کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے ابو بہت بڑے بزنس مین تھے۔ دبئی میں منی بینک اور پاکستان کے بڑے شہروں میں ایکسچینج وغیرہ کا ابو کا بزنس تھا۔ دنیا کی ہر چیز منہ سے نکلتے ہی ہمارے قدموں میں ہوتی، مجھے اپنی قسمت پر ناز ہوتا۔ پر مجھے امیری سے کوئی سروکار نہ تھا غریبوں کا احساس دل میں تھا۔ کبھی چوری چھپے غریبوں کی مالی مدد کرتی جو مجھے بدلے میں دعائیں ملتی۔ جب میری پڑھنے کی عمر ہوئی تو ابو نے انگلش اسکول میں داخل کرا دیا۔ پڑھتے پڑھتے میں مڈل میں آ گئی۔ وقت گزرتا گیا اور بڑی بے رحمی سے اذیت میں دھکیلنے کو میرے سر پر سوار ہو گیا۔ میں جوانی کی دہلیز پر تھی اب بچوں والی شرارتیں کھیل کود، موج مستی سب چھوٹ گئی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہر کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرتی مگن تھی۔ پڑھائی دلچسپی تھی جو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرے باقی بہن بھائی پڑھائی سے فارغ ہو کر دنیا کے موج میلوں میں کھو گئے۔ گھر والوں نے کہا کہ بس کرو اتنا نہ پڑھو۔ کیا کرو گی۔''

جب یہ باتیں میرے کانوں میں گونجتیں تو مزید پڑھنے کا جنون طاری ہوتا میں نے گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے پڑھنا ہے بس جو بھی ہو جائے میں اپنی ضد پر اڑی رہی آخر گھر والے مان گئے۔ گھر سے اسکول تک میں بڑی کار میں جاتی اور واپس بھی کار میں لوٹتی۔ جب گاڑی اسکول کے گیٹ پر بریک لگاتی تو سب کی نظریں مجھ پر یا کار پر ہوتیں اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت حسین صورت سے نوازا تھا۔

ان ڈھیروں لڑکے لڑکیوں میں سے کچھ میری

فرینڈز تھیں اور کچھ ایسے آشنا تھے جو کہ خون کے رشتے ہوتے ہوئے بھی انجان تھے۔ اکثر ایک لڑکا میرا آتے جاتے پیچھا کرتا ہے۔ میں ایسا محسوس کر رہی تھی مگر مجھے کیا جو بھی تھا۔ مجھے کیا غرض تھی۔ ایک دن اس قلاش انسان کو میں نے چور نظروں سے دیکھتا ہوا پکڑ لیا تو ایک دوسرے کے تعارف کے بعد پتا چلا کہ اس کا نام عابد تھا۔ میری ماں کے ماموں کا بیٹا تھا۔

وقت گردش کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا میں آہستہ آہستہ عابد سے زیادہ گھل مل گئی تھی۔

کبھی کبھی ایسا لگتا کہ جب تک عابد سے بات نہ کروں تو میرے دل کو قرار نہیں حاصل ہوتا۔ عابد میرے دل و دماغ میں سما چکا تھا۔

دن رات ہر پل میں اس کی یادوں میں کھوئی رہتی۔ میں اس وقت مڈل کے ایگزام دے چکی تھی۔ ہمارا پیار پروان چڑھ رہا تھا۔ اکثر فون پر بات ہوتی، عابد کبھی ہمارے گھر کا چکر لگالیتا اس طرح میں اپنی پیاسی آنکھوں کی پیاس بجھالیتی۔ میں تو دل و جان سے اس کی تھی وہ بھی میرا تھا مگر صرف میری خوبصورتی یا دولت کے لیے میں اس بھکاری کو، اپنے اندھے پیار کی وجہ سے سمجھ نہ پائی۔ پھر ہماری محبت کے گلی کوچوں میں چرچے ہونے لگے امی میرے پاس آئیں پوچھا۔

''خوشی کیا واقعی تم عابد سے پیار کرتی ہو۔'' پہلے تو یہ الفاظ سنتے ہی مجھے کپکپی چھوٹ گئی۔ جسم میں تھرتھراہٹ سی پیدا ہوگئی۔ اپنے اوپر ضبط رکھتے ہوئے اپنے دل کی بات زبان سے امی کو سنادی۔ پھر امی نے خوشی بھرے لہجے میں دعا دی اور چلتی گئیں۔

کچھ دن بعد میری چھوٹی سوتیلی بہن نے آ کر بتایا کہ عابد سے میرا نکاح طے پا رہا ہے جو امی بخوبی سرانجام دے رہی ہیں۔''

دل میں خوشی کی لہر لہرانے لگی۔ میں بہت خوش تھی



کہ جسے چاہا اسے پالیا۔ مگر وہ خوشی، وہ مسرت چند گھڑی کی مہمان ٹھہری آئی اور چلتی بنی۔ دکھوں کی طرف دھکیلتے ہوئے زندگی اجیرن کردی۔ ایک پتھر کی مورتی جیسا میرا حال کردیا۔

اب عابد اسکول چھوڑ چکا تھا اور رکشہ چلانے لگا تھا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ رکشہ چلانے والوں پر مجھے اتنا غصہ آتا کہ زندہ دفن کردوں۔ مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر سب کچھ سہتی رہی۔ اتنے امیر گھرانے کی لڑکی جسے دیکھتے ہی راہ چلتے مسافر رک جاتے۔ گاڑی چلاتے ڈرائیور آپس میں ٹکراتے۔ وہ حسن کی ملکہ اور معمولی رکشہ ڈرائیور سے پیار..... کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ عابد جب بھی آمنے سامنے یا ملاقات ہوتی تو کہتا۔

''خوشی جان آج دو ہزار دو کام کے لیے چاہیے ہیں اور کبھی پانچ ہزار۔ واپس کرنے کا کہہ جاتا۔ مگر کرتا نہیں۔ میرا پیار لالچ کی جگہ لیتا رہا اور وہ احساس جذبات بھری پیار کی باتیں سب کچھ ضرورت بن گئی۔ لالچ پن بڑھتا رہا۔ میں سب کچھ چپ چاپ سہتی رہی کہ آخر عابد بدل جائے گا۔

ہمارا نکاح طے پایا چند دن بعد گھر میں خوشیوں کی بہاریں تھیں۔ نئے خواب تھے نئی زندگی کے جذبات تھے۔ فرسٹ ایئر کے ایگزام دے کر گھر پر تھی۔ میری کارکردگی محنت لگن دیکھ کر سب گھر والوں نے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی یوں میرا نکاح عابد سے پڑھوا دیا گیا۔ کچھ پل تو اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتی ہوئی محسوس کررہی تھی۔ وقت نے کروٹ بدلی جس سے میری زندگی کی ہر خوشی، ہر سکھ مجھ سے دور ہوگیا اور میرے اپنے بھی بیگانے ہوگئے۔ میں اپنے محبوب کی مطلب پرستی، خودغرضی پر غزلیں لکھتی۔ ناول پڑھتی امی کی نظر مجھ پر ہوتی۔ اپنی ڈائری بھی لکھتی تھی۔ گھر کا ہر فرد گھورتا رہتا کہ یہ بڑی سی کتاب پر روزانہ کیا لکھتی رہتی ہے۔ کئی دفعہ امی ابو کی ڈانٹ پڑی تھی کہ یہ رسالے وسالے نہ پڑھا کرو یہ سیدھی سادھی لڑکی کو خراب کردیتے ہیں۔ مگر ان کو کیا پتا کہ ان میں کتنا درد چھپا ہوتا ہے جسے پڑھ کر دلی سکون محسوس ہوتا ہے۔ چند آنسو کے قطرے بہہ نکلتے دل غم سے تھوڑا خالی ہوجاتا ہے۔ میری ماں کی نظر مجھ پر ہوتی۔

میں ڈائری میں سب لکھتی اور روتی کہ میری محبت صرف میری دولت حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اسے میری چاہت میرا پیار نظر نہیں آتا۔ رونا میرا معمول بن چکا تھا۔

فرسٹ ایئر کے ایگزام کے بعد میں گھر میں اکیلی تھی۔ کچھ دنوں بعد میری کزن بتول نے کال کی کہ سب کلاس میٹ اور تمام ٹیچرز ٹور پر ریڈی ہیں۔ تم بھی ساتھ چلو بہت مزا آئے گا۔ خوب انجوائے کریں گے۔ میں اور میری ماں اس وقت گھر میں تھیں۔ باقی سب کوئی کہیں تو کوئی کہیں نکلا ہوا تھا۔ میں امی کے پاس دوڑتی ہوئی آئی اور امی سے کہا کہ سب کلاس میٹ اور استانیاں لاہور ٹور پر تیار ہیں مجھے بھی انوائٹ کیا ہے مجھے جانا ہے۔''

امی نے کچھ پیسے دیے اور ساتھ اجازت بھی دی۔ جب انسان بدلتا ہے تو آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتا کچھ یوں ہی میری امی نے میرے ساتھ کیا۔ لمحوں میں خون کا رشتہ پانی پانی ہوگیا۔ مجھے گھر سے تو اجازت مل گئی تھی۔ مگر ساری زندگی کے لیے طعنے سہنے کے لیے ایک ہی لمحے میں میرے اپنے بیگانے ہوگئے۔ وقت نے ایک ایسا میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا، جس کے نشان مرتے دم تک ختم نہیں ہوں گے۔ سگی ماں نے سوتیلی ماں سے بھی زیادہ برا سلوک کیا۔ میں شام کو سب کلاس فیلوز کے ساتھ ٹور پر چلی گئی۔ راستے میں میرے سیل کی بیٹری لو ہوگئی موبائل پاور آف ہوگیا۔ قدرت بھی انسانوں سے کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے۔

جب صبح ہوئی ہم لاہور اترے اور ہوٹل میں ریسٹ کیا تو موبائل کو چارج کیا۔ جیسے ہی آن کیا تو میری بدقسمتی میرا سر پھوڑنے لگی۔ اچانک ابو کی کال آگئی کال اٹینڈ کی تو گرجتی آواز نے میرے ہوش اڑا دیے۔ ابو نے پوچھا۔

''ہماری عزت نیلام کر کے کس جگہ جا بیٹھی ہو اور کس یار کے ساتھ ہو۔'' میرے حواس ہوا میں رفو ہوتے گئے۔ جواب میں کچھ کہنا چاہا تو ابو نے کہا صرف اتنا بتا کہ اس وقت کہاں ہو۔'' میں نے جگہ بتائی۔ ابو نے کہا کہ وہیں رکنا میں ابھی آیا۔ میرے ذہن میں سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہونے لگی۔ خیر یہ تو ابو ہی بتائیں گے آکر۔ پتا نہیں کیا قیامت آنی ہے قیامت سے پہلے۔

سوچ سوچ کے میرا بُرا حال تھا۔ ڈر خوف سے میرا چہرہ لال پیلا تھا۔ ہر کسی کے چہرے کو دیکھتی اور سوال کرتی۔ سب کو ٹال مٹول کرتی رہی۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھی اور خدا سے دعا کی کہ ہر مشکل آزمائش میں کامیاب کرنا۔

کچھ دیر بعد ابو میرے کمرے تک آ پہنچے۔ انہوں نے کہا کہ گھر چلو ضروری بات کرنی ہے۔"

میرا دل کانپ رہا تھا نجانے کون سی آفت برپا ہونے والی ہے۔ ہم رات کے 12 بجے شہر ڈی جی خان آ گئے۔

جب گھر میں داخل ہوئے تو گھر میں کہرام برپا تھا۔ ہر شخص کسی قیامت کا منتظر تھا۔ سب نے جب مجھے دیکھا تو آنکھیں پھٹی پھٹی سی لگنے لگیں۔ میں بھاگ کر تو نہیں گئی تھی امی کی اجازت سے ٹور پر گئی تھی۔ مجھے کیا پتا میرے جانے کے بعد یہ تماشا کھڑا ہو جائے گا۔ پھر ابا میرے پاس آئے اور بولے۔"کہاں گئی تھی۔ کس کے ساتھ ہماری عزت آبرو کا جنازہ نکالا ہے بتاؤ۔" اتنے میں میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش ہونے لگی۔ میں دوڑتی چلاتی ہوئی امی کے پاس دوڑی تو ابو اور میرے بھائی نے بازوؤں اور بالوں سے پکڑا۔ جس سے گردن کا مہرا نکل گیا۔ میری سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ کوئی میرا بچاؤ نہ کر پانے آ نہ کسی نے آگے بڑھ کر ابو کو مارنے سے روکا۔

اُس وقت میری ماں ڈائن بنی کھڑی اپنی بیٹی کو پٹتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے امی کو خدا کے واسطے دیے پاک رسول کریم ﷺ کی قسمیں دیں کہ میں پاک دامن ہوں۔ میں کسی کے ساتھ بھاگ کر نہیں گئی۔ امی سے پوچھ کر۔ اجازت مانگ کر گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھا تھا اور ماں تم تو بولو نہ۔ کیوں چپ کے تالے لگے ہیں منہ پر۔ کیا میں آپ کی بیٹی نہیں، کیا میں نے آپ کے بطن سے جنم نہیں لیا۔"

ماں نے صرف یہ جواب دیا کہ تم جس یار کے ساتھ گئی تھیں وہاں ہی رہتیں۔"

ہائے میرے خدا! یہ الفاظ سننے سے پہلے مجھے زندہ درگور کر دیا ہوتا ایک ماں سے ایسی باتیں تو نہ سنتی۔ اپنی بیٹی کو ظالموں کے آگے مار کھاتے ہوئے سب تماشائی بنے دیکھتے رہے۔ پھر ایک بار بھائی اپنا حق ادا کرنے چلا آیا۔ لوہے کی سلاخ اٹھائی اور مجھ پر وار کرنے لگا۔ اس وقت کوئی میرے حق میں نہیں تھا۔ میرا خدا بھی مجھ سے امتحان لے رہا تھا۔ آزمائش بھی تو لینی تھی خدا پاک نے۔ بھائی اپنا ظلم برساتا رہا اور میں سارے ستم بخوشی قبول کرتی رہی۔ جس سے میرے جسم کے ہر حصے پر زخم، چوٹیں درد کی شدت سے دور دور تک میرے رونے چیخنے کی آواز جا رہی تھی۔ ہر شخص تماشائی اپنا کھڑا رہا۔

پھر بھائی نے ابو سے کہا کہ اباجی یہ سب ناول پڑھنے اور عشق بھرے اشعاروں کا کیا دھرا ہے۔ اس کا لکھنے والا ہاتھ ہی جلا دیں۔ آج تک کسی نے اتنا آگے نہ پڑھا نہ کالج نہ یونیورسٹی۔ یہ سب پڑھنے کی وجہ سے آج اس نے ہماری آن داؤ پر لگا دی ہے۔"

"پھر ابو گیس کا سلنڈر لے آئے کچن سے......"

خوشی کی آواز میں فرق آنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ خود پر کنٹرول نہ کر سکی اور بے تحاشا رونے لگی۔ جب اپنے لوگوں کے کیے ہوئے ظلم ہرے ہو جائیں تو آنسو خود بخود بن بلائے چلے آتے ہیں، بین کر کے رونے کے بعد خوشی اپنی پہلے والی آواز میں لوٹ آئی۔

پھر ابو نے سلینڈر کو ماچس سے جلایا اور بھائی کو حکم دیا کہ اسے لے آؤ اور اس کا ہاتھ جلاؤ۔"

ظالم لوگ ظلم کی حدیں پار کر چکے تھے۔ اس وقت مجھے کوئی علم نہ تھا کہ کہاں کہاں لوہے کی سلاخ لگی ہے پھر میرا ہاتھ جلایا۔ میں پہلے ہی سے اندر باہر سے شیشے کی طرح ٹوٹ چکی تھی۔ جب ہاتھ جلایا تو مجھے بعد کا کوئی پتا نہیں۔

کچھ دن بعد ہوش آیا۔ آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو تہہ خانے میں پایا جہاں گرمی اور اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ جسم میرا درد سے چُور چُور تھا۔ درد کی شدت تیز تھی۔ زخموں کی وجہ سے میری چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں مگر میرے گھر والے بہرے ہو کر کانوں میں تیل ڈالے ہوئے تھے۔ یونہی دو دن گزر گئے بھوکے پیاسے۔ شاید اس وقت سب اپنے امتحان کی طاقت دیکھ رہے تھے اور موت میری حالت پر طنز کر رہی تھی۔ خدا سے موت مانگی مگر خدا بھی

کچھ اور مجھ میں صبر کی ہمت دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ رات بھی گئی تیسرا دن آن چڑھا اور باہر سے کسی کے دبے پاؤں آنے کی آواز سنائی دی۔ تین دن سے خشک ہونٹ، پانی کے لیے تڑپ اٹھے۔ مری ہوئی بھوک پیٹ میں درد کرنے لگی۔ چوٹیں اور زخم مرہم کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ کاش کوئی رہبر آ جائے فرشتہ بن کر مجھے اس قید سے باعزت بری کروا دے اور ان ظالم لوگوں کے دل میں بیٹی کا احساس پیدا کر دے۔ کاش جب انسان کے برے دن شروع جائیں تو پرائے کیا اپنے بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔ آہستہ سے دروازہ کھلا تو روشنی میرے ٹوٹے بدن پر آنسو بہانے لگی۔ میری اجڑی حالت پر رشک کرنے لگی، پر ہونا وہی تھا جو میری قسمت میں ازل سے لکھا جا چکا تھا۔ کون ٹال سکتا تھا اُسے۔

میری ملازمہ آسیہ میری خبر لینے آئی کہ میں زندہ ہوں یا پھر...... ہاتھ میں روٹی، پانی کا جگ اور میرے بے جرم زخموں کا مرہم خشک آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو موتی کے قطرے بن کر فرش کو گیلا کرنے لگے۔ میری یہ حالت دیکھ کر نوکرانی کا دل تڑپ اٹھا۔ اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ یہ غیر تھی، وہ میرے اپنے خون کے رشتے تھے، اپنی کوکھ سے جنم دینے والی ماں تھی۔ خوشیاں دینے والا باپ تھا اور بہن کا ہنستا چہرہ دیکھ کر خوش ہونے والے بھائی تھے۔

تین دن سے بھوکی پیاسی درد، اذیت سہتی ہوئی میں ملازمہ آسیہ کو اپنے درد میں شریک پا کر اس کے گلے جھٹ سے گلے لگ گئی اور اپنی قسمت پر گڑگڑانے لگی۔ کسی نے میری آہ میری پکار نہ سنی تھی۔ ملازمہ نے تسلی دی اور میرے ناک کی ٹوٹی ہڈی پر مرہم لگائی اور پورے جسم کے حصوں پر بھی۔ پیار محبت سے اپنے ہونے کا احساس دلایا اور کھانا کھلایا اور پانی پلایا۔

اپنوں کی محبت پر خودکشی کرنے کو دوڑتی مگر غیر کی اپنایت سے جینے کی خواہش جاگ اٹھتی۔ قسمت ہر انسان سے کوئی نہ کوئی بڑے سے بڑا کھیل ضرور کھیلا کرتی ہے۔ میں اپنے ماضی میں جاتی تو دکھ نام کی کوئی چیز نہ ٹکراتی۔ موجودہ حالت دیکھتی تو سکھ کا کوئی نام و نشان نظر نہ آتا۔

آسیہ نے سرگوشی میں میرے اپنوں کے پلان کے بارے میں بتایا کہ امی کا خیال ہے ہماری عزت خاک میں ملانے والی کو اس گھر میں رکھنے سے بچی ہوئی عزت بھی نیلام ہو جائے گی۔ اسے دور پہاڑوں پر چھوڑ آؤ۔ ابو کا صرف بیان کہ صرف یہ مکان فروخت کر دو اور پیارے بھائیوں کے الفاظ کہ گولی مار دیں اور ایک ماہ بعد آسانی سے بیل پر چھوٹ جائیں گے۔ یہ باتیں آسیہ کے منہ سے سُن کر جینے کی خواہش نے دم توڑ دیا۔ آسیہ تو چلی گئی مگر میری سوچ سمجھ سے سب باتیں بالاتر ہو گئیں۔

چوتھے دن کا سورج چڑھا تو میرے آزمائش بھرے وقت میں اضافہ کر گیا۔ چوتھے دن آسیہ مجھے کال کوٹھڑی سے بے رنگ و رونق، جھوٹے فریبی نیا میں لے آئی۔ جہاں کبھی میرے گھر والے میری ہنسی کو ترستے تھے آج وہ دیکھنا بھی برداشت نہ کر پا رہے تھے۔ اُن کے گھورنے سے معلوم ہوتا میں کوٹھے سے پکڑی گئی ہوں یا کسی نے مجھے اپنے کسی عاشق کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ آج انسان نے انسانوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت کھو دی ہے۔ میرا گھر میں قدم رکھنا کوئی بڑا جرم ثابت ہونے کے برابر تھا۔ گھر میں کوئی بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہ کرتا۔ میں ان کی بیٹی سے غیر بن گئی تھی۔ جرم اتنا کہ میں تو ر پڑ گئی تھی۔ کسی سے پیار کیا محبت کی۔ ابو کی خواہش یہ تھی کہ میں ابو کے بھائی کے بیٹے سے شادی کرتی۔ مگر میری ماں نے سب کے منہ اپنی چالاکی اور مکاری سے بند کر دیے تھے اور میرا نکاح عابد سے کر دیا تھا۔ ہر لڑکی کی طرح میری بھی یہی آرزو تھی کہ پیار جس سے ہے اسی سے شادی بھی ہو، مگر میری ماں کے منہ سے نکلے لفظوں اور بیانات نے مجھے بے جرم سے عمر بھر کا قیدی بنا دیا۔ میری زندگی کی خوشیوں کو ایک پل میں نگل گئی اور میری ہنستی زندگی کی خوشیوں کو آگ کا ڈھیر بنا دیا، جس سے صرف دھواں ہی دھواں اٹھتا ہے۔ راتوں کی نیند دن کا اُجالا تنہائی میں سانپ کی طرح ڈستا ہے اور رات کی تاریکی میرے حال پر بین کر کے روتی ہے۔ مجھ سے روٹھی خوشیاں سوال کرتی ہیں کیوں ہوا ایسا؟ کیا ماں کی ممتا کو احساس نہیں آیا اپنی بیٹی کا؟ جسے اپنے ہی بطن سے جنم دیا، پالا پوسا بڑا کیا۔ پڑھایا لکھایا اور ان سب فرائض، احسانوں کا بدلہ یوں چکا کر اپنے ماں

ہونے کا حق ادا کیا جو خدا اور رسول ﷺ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔ کیا وہ سب کچھ ان والدین کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔ فرمانبردار نیک پرہیز گار اولاد تو اپنا سر قلم کروا سکتی ہے اپنے والدین کی خاطر مگر دنیا کے لوگوں کے آگے بدنام نہیں کروا سکتی اور مجھے تو قرآن کا قاری بنایا، پانچ وقت کی پابندی سے نمازی بنایا پھر ایسا کیوں کیا۔ میری خوشیوں کو سب دیمک کی طرح چاٹ گئے۔

پھر یوں راتوں کو خدا سے فریادیں کرتے بے گناہی کی قسمیں کھاتے ہوئے دو سال گزر گئے۔ ان گزرے دو سالوں میں میرا کچھ بھی نہیں بچا۔

جیسے ہی میری بدنامی زمانے میں آگ کی طرح پھیلی تو سب نے میری خوشیوں کو داغ بنا دیا۔ میرا پیار مجھ سے منہ پھیر گیا اور میری سوتیلی بہن سے نکاح کر لیا۔ میں تو پاک دامن ہو کر بھی گناہ گار بنا دی گئی تھی۔ مجھ میں تو عیب بھر گئے تھے۔ ساتھ جینے مرنے کے وعدے پل بھر میں خاک میں دفن ہو گئے اور وہ پیار محبت کے جذبے سیکنڈوں میں دم توڑ گئے۔

اس دن میری خوشیوں بھری زندگی کا، میرے پیار کا جنازہ نکل گیا۔ جس دن عابد کی شادی ہوئی۔ سب اُمیدیں حسرتیں خود بخود ختم ہو گئیں۔ میرے پیار نے بھی مجھ پر اعتماد نہ کیا تو میں نے ایک دن بھائی سے کہا۔ جو بھی کہتا تھا بہنا اور میری پیاری بہنا خوشی تو میری بہن نہیں میری زندگی ہے۔

میں نے بھائی کو کہا بھائی میں اس گھر میں کب تک قیدیوں جیسی زندگی گزاروں گی۔ میری شادی کرو۔ تو بھائی نے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور بولا۔

''اب تیری شادی نہیں ہوگی۔ اب تُو کوٹھے کی زینت بنے گی۔'' پھر مجھ سے برداشت کے پیمانے ٹوٹ گئے۔ جو پہلے دن سے اذیت ناک درد مار پیٹ سہتی آ رہی تھی کسی کو کوئی آہ تک نا سنائی تھی۔ آج چڑھ کر بولی۔

''بھائی شرم کرو۔ اپنی عقل کو ٹھکانے لاؤ اور زبان کو لگام دو۔ میں عورت ضرور ہوں مگر کمزور نہیں۔ مجھے تم لوگوں کی عزت اور خدا کے حکم نے کمزور بنا دیا ہے اس لیے اپنا حق آپ لوگوں سے مانگ رہی ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔ مجھے بے گناہی کی سزا دی جا رہی ہے۔''

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلی آئی اور خدا کے حضور گڑگڑانے لگی۔ ''خدایا! یہ سب کیا ہے۔ کس جرم کی سزا ہے۔

☆......☆......☆

ایک دن میں صبح سویرے نماز پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی تو آگے سے ابو گزرے اور مجھے دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔

''آج سے تیرا سب کچھ یہی کلام پاک ہے یا خدا ہے۔ ہم سب تیرے لیے اور تو ہمارے لیے مر چکی ہے۔''

یہ الفاظ سنتے ہی میں نے ابو کو غور سے مہینوں بعد دیکھا تو میرے اشک رواں ہو گئے۔ میں نے کلام پاک کو اندر رکھا اور ابو کی نصیحت کو اپنی عقل دماغ اور دامن میں رکھ کے گانٹھ دے دی۔ میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ گھر سے بھاگ سکتی تھی۔ دو تین بار خودکشی کرنی چاہی لیکن میرے خدا نے مجھے حرام موت نہ دی۔

میری سہیلیاں میری پڑوسنیں کہتی ہیں کہ تم کہیں دور بھاگ جاؤ جہاں ان کا سایا بھی تم پر نہ پڑے۔'' مگر خدا نے فرمایا کہ ماں باپ کے ظلم و ستم پر فرمانبردار اور نیک اولاد اُف تک نہ کرے۔ پھر میں کیسے اپنے ماں باپ کو بھری دنیا میں رسوا کر سکتی ہوں نہ اپنے خدا کو ناراض کر سکتی ہوں اور آخری نبی ﷺ سے شرمندہ ہو سکتی ہوں۔ نہیں اب میری لاش ہی گھر سے باہر جائے گی میں نہیں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ میرے اپنے اگر نہ بھی تو کیا ہوا......''

یہ تو تھی خوشی کی کہانی جو میں نے قلم کے سپرد کر دی لیکن ایسی کتنی ہی کہانیاں روز جنم لیتی ہیں اور بغیر کسی کے علم میں آئے انجام کو پہنچ جاتی ہیں۔ میرا صرف ایک سوال ہے۔ بیٹی کو رحمت سمجھنے والے اتنے بے اعتبار کیوں ہو جاتے ہیں۔ بیٹی پر بھروسا اور اعتماد ہونا ہی سب سے بڑی اور سچی محبت ہے۔ اگر بیٹی پر سے بھروسہ ختم ہو جائے تو محبت کے سارے ناتے اور زبردستی کے بندھن توڑ کر اُسے ظلم کی بھینٹ چڑھانے کے بجائے اپنے ہاتھوں زہر دے دیں۔ مگر اس صنف نازک پر ظلم نہ کریں۔ ہاتھ، ناک کاٹنا، تیزاب پھینک کر چہرے مسخ کرنا مردانگی نہیں دورِ جہالت کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ بہنوں اور عورت کی عزت کریں کہ یہی ہمارے دین کی تعلیمات بھی ہیں۔

☆☆☆......☆☆☆

# سب راہیں ایک ہوئیں

ڈاکٹر طارق محمود آکاش

سیالکوٹ سے فیوڈل سسٹم کے منہ پر قدرت کا طمانچہ مارتی، ایک نوجوان کی سچی داستان



"بابا کیا غریب کا بچہ غریب ہی رہتا ہے۔ کیا غریب ساری زندگی ان حاکموں کے قدموں میں ہی بیٹھا رہے گا۔ ان کا جھوٹا ہی کھاتا رہے گا۔ چوبیس گھنٹے غریب کی زندگی کا ریموٹ ان ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔

اور ایک روبوٹ کی طرح ہم اُن کے آگے پیچھے گھومتے رہیں گے۔ میں تنگ آ چکا ہوں اس زندگی سے بابا...... کاش آپ نے مجھے تھوڑا پڑھنے کی اجازت دی ہوتی۔ تو میں آج کہیں نوکری کر لیتا اور اِن ظالموں سے تو نجات مل جاتی۔ آپ کو ان کی چاکری کرتے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ بابا خدا کے لیے یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کریں ورنہ میں بھی آپ کی طرح یہاں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔ بابا پلیز مجھے یہاں سے نکالیں۔''

''بیٹا میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے تمہارے جذبات اور احساسات کا مکمل احساس ہے۔ مگر جب یہ سوچتا ہوں کہ شہر میں جا کر ہم کہاں رہیں گے۔ کہاں سے کھائیں گے۔ اور تم مجھ بیمار بوڑھے بابا کو لے جا کر کہاں رکھو گے تو چپ ہو جاتا ہوں۔ یہاں کم از کم سر چھپانے کا آسرا تو ہے اور پھر جیسی بھی روکھی سوکھی مل جاتی ہے، اس میں خدا کا شکر ادا کر کے وقت گزار رہا ہوں مگر اب میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ جب میری آنکھیں بند ہو جائیں تو کہیں ٹھکانہ کر لینا، مگر ابھی بیٹا جیسے بھی ہو، وقت پورا ہونے دو۔''

''نہیں بابا نہیں...... آپ کو خدا میری بھی زندگی دے دے۔ بابا میں آپ ہی کی خاطر تو یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو آرام، اچھی خوراک اور آزادی مل سکے۔ یہاں تو وہ آپ کو آرام ہی نہیں کرنے دیں گے۔''

''اور ہاں بیٹا...... تمہاری ماں نے مرتے وقت اپنی بہن کی بیٹی فاخرہ کا ہاتھ مانگا تھا تمہارے لیے مگر اب تو اسے دنیا سے گئے پانچ برس بیت گئے۔ تب تم دس سال کے تھے اور فاخرہ بھی۔ تب تمہاری ہی عمر کی ہوگی۔ اور اب تم ماشاءاللہ پندرہویں سال میں ہو تو وہ بھی جوانی کی دہلیز میں داخل ہو چکی ہوگی۔ مگر بیٹا تمہاری ماں کے مرنے کے بعد ایک دفعہ ہی تمہاری خالہ آئی تھی۔ اس کے بعد تو وہ جیسے رستہ ہی بھول گئی ہے۔ الماری میں اس کا پتا رکھا ہے۔ اس سے رابطہ ضرور کرنا۔''

''بابا آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا آپ کو چھوڑ کر۔ میں اگر جاؤں گا تو آپ کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔ ہم مل کر جائیں گے خالہ کے پاس مگر ابھی نہیں۔ جب اس قابل ہوں گے تب ہی جائیں گے۔ ابھی تو اس جہنم سے نکلنا بہت ضروری ہے۔ ہم انشاءاللہ بہت جلد شہر میں اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنا چھوٹا سا آشیانہ بنائیں گے۔ بابا آپ نے مجھے آج تک فاخرہ سے رشتے والی بات تو بتائی ہی نہیں تھی۔ ہماری زندگی اتنی سختی سے گزر رہی ہے کہ مجھے بھی آج تک خیال نہیں آیا کہ واقعی ہمیں تو کبھی کوئی ملنے بھی نہیں آیا۔ ایک خالہ تھیں وہ بھی ماں کے مرنے کے بعد منہ موڑ چکی ہیں۔ انہیں شاید یہ محسوس ہوا ہوگا کہ یہ لوگ تو کٹھ پتلی کی طرح ہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے ان کو رشتہ دینے کی۔''

''ارے نہیں بیٹا، ایسی بات بالکل بھی نہیں ہے۔ تمہاری خالہ بہت اچھی ہے۔ دراصل ہم بھی کبھی نہیں گئے نا اس لیے وہ بھی نہیں آئیں۔ انشاءاللہ اُن کو اپنی بہن سے کیا ہوا وعدہ یاد ہوگا۔ اور فاخرہ جہاں بھی ہے خدا اسے زندگی دے۔ وہ تمہارے نام کے ساتھ ہی منسوب ہے۔ اور تو اور تمہاری ماں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اُتار کر فاخرہ کی انگلی میں پہنا دی تھی۔ اس لیے بیٹا تم اپنے ذہن میں کوئی غلط خیال نہ رکھو اور خدا پر بھروسا رکھو۔ وہ بہتر کرے گا۔ یہ رشتوں کی ڈور اتنی کمزور نہیں کہ حالات کی آندھی چلنے سے ٹوٹ جائے۔ زندگی کی شاہراہ پر سانسوں کا کارواں جب تک چلتا رہتا ہے۔ یہ رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے، مگر جیسے ہی یہ سانس بند ہوتی ہے سب کچھ بیگانہ ہو جاتا ہے۔''

☆......☆......☆

مبارک اور زرمینہ کا ایک ہی بیٹا تھا زوار احمد۔ انتہائی غریب گھرانہ تھا۔ مبارک علی، ملک مہربان کی حویلی میں نوکر تھا۔ مالکوں کا بچا ہوا جو کھانا ہوتا وہ نوکروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ شام کو مبارک علی کو جو بھی ملتا، گھر جا کر زرمینہ کو دیتا، جسے وہ خود بھی کھا لیتی اور اپنے بیٹے کو بھی کھلا دیتی۔ نم آنکھوں کے ساتھ دونوں خدا کا شکر ادا کرتے اور اس سے بہتری کی دعا کرتے ہوئے سو جاتے۔

ملک مہربان نام کا تو مہربان تھا مگر اپنے نام کے بالکل اُلٹ، وہ بہت ہی ظالم قسم کا چوہدری تھا۔ گاؤں میں اسکول کا وہ بہت سخت مخالف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک لوگوں کے ذہن میں تعلیم کا تصور ہی بیدار نہ ہو سکا تھا۔

زرمینہ کی بڑی بہن تہمینہ آئی ہوئی تھی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ تہمینہ نے کہا کہ تم لوگ زوار احمد کو ہمارے ساتھ شہر بھجوا دو تاکہ یہ علم کی دولت حاصل کر سکے۔

مبارک علی بھی راضی ہو گیا اور کہا کہ وہ بہت جلد شہر آ کر خود زوار احمد کو اسکول میں داخل کروا آئے گا۔

زرمینہ نے بڑی آپا سے فاخرہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ جسے بلاحیل وحجت قبول کر لیا گیا اور زوار احمد کے نام کی انگوٹھی فاخرہ کو پہنا دی گئی۔

بھوک اور افلاس کی ماری زرمینہ آخر ایک روز سوتے ہوئے چل بسی۔ مبارک علی علی الصبح بیدار ہوا اور زرمینہ کو صبح ہونے کی آواز دے کر نماز ادا کرنے مسجد چلا گیا۔ اور وہاں سے ہی ملک کی حویلی روانہ ہو گیا۔ کافی دن چڑھے، جب زوار احمد بیدار ہوا تو اس نے مری ہوئی ماں کو دیکھ کر چلانا شروع کر دیا۔

جب یہ خبر مبارک علی تک پہنچی تو اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ ظالم سفاک ملک نے حکم صادر کیا کہ پہلے کام ختم کرو پھر چلے جانا۔ آخر دوپہر کو اسے گھر جانے کی فرصت ملی، اور پھر اس بے چارے نے جیسے تیسے کفن دفن کا بندوبست کیا اور اپنی بیوی کو سپرد خاک کیا۔

☆......☆......☆

ملک مہربان کی تین بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی، جبکہ دوسری کی بھی جب اولاد نہ ہوئی تو اس نے تیسری شادی کر لی۔ تیسری بیوی سے اس کے ہاں ایک ہی بیٹی پیدا ہوئی۔ جواب پندرہ سال کی تھی اور شہر میں میٹرک کرنے کے بعد اب گاؤں میں آ گئی تھی۔ ملک اس کو مزید پڑھانے کے حق میں نہ تھا ورنہ وہ کالج جانے کے سپنے دیکھ رہی تھی۔

ملک کو وارث کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے اُس کا ذہن اب چوتھی شادی کے ارادے باندھ رہا تھا۔ بات بات پہ حکم چلانا، ہر ایک کو بُرا بھلا کہنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ نوکروں کو جوتے کی نوک تلے رکھتا تھا۔ اس کی نظر میں یہ لوگ انسانیت کے درجے سے نیچے تھے۔

نمرہ جب اپنے باپ کو ایسے دیکھتی تو اس کی سمجھ میں یہ سب باتیں نہ آتیں کہ آخر میرا باپ ایسا رویہ کیوں رکھتا ہے۔ چونکہ وہ دس سال جب شہر کے ہوسٹل میں رہی تو کبھی کبھار ہی گاؤں میں آتی اور پھر اگلے دن واپس چلی جاتی۔ اس لیے اسے ان سب باتوں کا علم نہ تھا۔

ویسے بھی تب وہ بچپن کا زمانہ تھا۔ اور اب وہ بالغ ہو چکی تھی۔ اور ان سب باتوں کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ بہت حیران تھی کہ گاؤں میں اسکول تک نہیں ہے۔ اور جب وہ اپنے بابا سے اسکول کا پوچھتی تو وہ آگے سے اکڑ کر جواب دیتا کہ اگر یہ کمین لوگ پڑھ گئے تو ہماری چاکری کون کرے گا۔ یہ سن کر نمرہ حیران ہو جاتی اپنے باپ کی سوچ پر۔

☆......☆......☆

تہمینہ کا شوہر اس دنیا میں نہیں تھا۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس کی موت کے بعد کافی رقم بھی ملی تھی، ساتھ میں تہمینہ کو نوکری بھی مل گئی۔ اس کے علاوہ بیمہ پالیسی کی مد میں بھی کافی رقم ان کے ہاتھ لگی۔ گھر بھی ذاتی تھا۔ اس لیے اُن کو کسی بھی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ دونوں بیٹیاں پڑھ بھی رہی تھیں اور ساتھ ساتھ تہمینہ کا ذہن تھا کہ اُن کو بھی جلد ہی ملازمت دلواؤں گی۔ بہن کے مرنے کے بعد اس کا ذہن زوار احمد سے ہٹ چکا تھا۔ وہ اپنی بیٹی گاؤں میں دینے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہ تھی۔ اسی لیے اُس نے دوبارہ گاؤں جانا گوارہ نہ کیا۔ فاخرہ کے ذہن میں البتہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ نہ ہی ماں کے خیالات سے اسے آگہی تھی۔ اس کی توجہ اپنی پڑھائی پر مرکوز تھی۔

☆......☆......☆

زوار احمد سارا دن گھر پر ہی رہتا یا گلی میں بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ایک روز جب وہ گلی میں کھیل رہا تھا۔ تو ملک صاحب اپنی گاڑی پر وہاں سے گزر رہے تھے کہ زوار احمد کی لگائی ہٹ سے ملک کی گاڑی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ ملک نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، باہر نکلتے ہی تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو حویلی لے کر آؤ۔ جب تک شیشے کے پیسے پورے نہ ہو جائیں یہ لڑکا حویلی میں کام کرے گا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی نمرہ اپنے باپ کے اس روپ سے بہت پریشان ہوئی۔ جب ملازم زوار احمد کو گھسیٹتے ہوئے حویلی لے کر آ رہے تھے تو مبارک علی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا گیٹ کی جانب آیا اور زوار احمد کو اِن ظالموں سے چھڑاتے ہوئے گلے لگایا اور پوچھنے لگا کہ آخر ہوا کیا ہے؟"

جب اسے اپنے بیٹے کی خطا کا علم ہوا تو وہ ملک کے پاؤں پر گر کر معافیاں مانگنے لگا کہ وہ اپنے بیٹے کی طرف سے ہوئی غلطی کا ازالہ کر دے گا مگر اس کے بیٹے کو گھر

جانے کی اجازت دی جائے۔ مگر ظالم بے رحم بھیڑیے نے اس کا جرم ناقابلِ معافی قرار دے کر زوار احمد کو جانوروں کے لیے چارہ کاٹنے کے لیے بھجوادیا۔

نمرہ کو جب علم ہوا کہ وہ مبارک بابا کا بیٹا ہے تو اسے دلی رنج ہوا۔ اور اس نے دل میں دعا مانگی کہ کاش اس کا باپ اسے معاف کردے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ زوار ایک غریب باپ کا بیٹا تھا جہاں نہ پیٹ بھر کر کھانا ملتا تھا نہ ہی تن پر پہننے کو اچھا کپڑا۔ مگر خدا کی قدرت کہ وہ بے حد حسین وجمیل نوجوان تھا۔ پہلی ہی نظر میں نمرہ زوار احمد کی جھیل سے گہری آنکھوں میں کھو چکی تھی۔

اس کے ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ کاش اس لڑکے کو تعلیم کا زیور پہنایا جاسکتا۔ نمرہ بہت دعا کرتی کہ کاش اس کا باپ اپنی ذہنیت بدل لے اور گاؤں میں اسکول کھولنے کی اجازت دے دے تو میں خود بچوں کو تعلیم دینے کے لیے سب سے آگے ہوں گی۔

☆......☆......☆

شدید گرمی کا موسم تھا۔ دن کے دس گیارہ بجے کا ٹائم تھا۔ ان دنوں گندم کی کٹائی چل رہی تھی۔ نمرہ سو کر اٹھی تو اس نے مبارک بابا کو ٹھنڈا شربت لانے کو کہا۔ بابا کچن میں شربت تیار کررہے تھے کہ باہر سے زوار اندر حویلی میں داخل ہوا۔ وہ جانوروں کو چارا ڈال کر اور اُن کو چھاؤں میں باندھ کر آیا تھا اور شدید گرمی سے نڈھال تھا۔ جب اُس نے بابا کو جگ میں شربت لے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ باپ اپنے بیٹے کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا مگر اس کی جرأت نہ ہوسکی کہ وہ ایک گلاس اپنے لختِ جگر کو پلاسکے۔ نمرہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ جب مبارک علی شربت لیے اندر داخل ہوا تو نمرہ نے کہا۔

''بابا آپ کا بیٹا کہاں ہے آج کل نظر نہیں آرہا۔'' حالانکہ وہ جانتی تھی کہ زوار باہر فرش پر بیٹھا گرمی سے لڑنے کی کوشش کررہا ہے۔

''جی جی بی بی جی اس نے کہاں جانا ہے جی۔ وہ تو نوکر ہے اور ابھی ابھی جانوروں کی دیکھ بھال سے واپس آیا ہے۔'' بابا جی نے کندھے پر ڈالا رومال ہاتھوں میں لے کر مسلتے ہوئے کہا۔

''بابا اسے ذرا میرے کمرے میں بھجوادیجیے، میں نے بازار سے کچھ منگوانا ہے۔'' نمرہ نے نرمی سے کہا۔

''جی اچھا بی بی جی......''

جب بابا نے جا کر زوار کو نمرہ بی بی کا پیغام دیا تو وہ کہنے لگا۔

''بابا آپ پوچھ آتے کیا کام تھا تو میں وہ بھی کردیتا۔''

''ارے نہیں بیٹا تمہیں خود جانا ہوگا کیونکہ یہی نمرہ بی بی کا حکم ہے۔'' زوار نہ چاہتے ہوئے بھی نمرہ کے کمرے کی جانب چلا گیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو نمرہ نے شربت کا گلاس بھر کر اس کے آگے کردیا۔

''جی بی بی جی...... یہ کیا ہے؟ کیا بابا نے ٹھیک نہیں بنایا؟ میں ابھی اُن سے بولتا ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں وہ دوبارہ بنادیتے ہیں جی۔'' زوار نے حیرانگی اور اُلجھے ہوئے لہجے میں گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے زوار ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم یہ شربت پیو پھر مجھے تم سے ایک کام ہے۔''

''ارے نہیں نمرہ بی بی ایک نوکر مالک کے برتن میں اس کے کمرے میں کھڑا ہوکر کوئی چیز کیسے کھاسکتا ہے۔ معافی چاہتا ہوں نمرہ بی بی، میں ایسا نہیں کرسکتا۔'' زوار نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے مالک کی حکم عدولی کرو گے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں سزا دی جائے۔'' نمرہ بی بی نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں جی......'' زوار ایک دم سٹپٹا گیا تھا۔ ''بس چپ چاپ یہ سارا شربت ختم کرو، مجھے کام ہے تم سے۔'' اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی زوار احمد پورا جگ شربت کا خالی کرچکا تھا۔

''جی بی بی اب آپ حکم کیجیے کیا کام تھا بازار کا جی۔'' زوار نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ تو میں تمہیں کل بتاؤں گی فی الحال تو پوچھنا تھا کہ کیا تم تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتے ہو۔'' نمرہ نے بلا تکلف زوار سے پوچھا۔

''ارے نہیں بی بی...... چوہدری صاحب نہیں چاہتے کہ کوئی گاؤں میں پڑھے۔ میں نے تو بابا کو بہت کہا تھا کہ مجھے شہر چھوڑ آئیں۔ میں پڑھنا چاہتا ہوں مگر بابا راضی نہیں ہوئے۔ پہلے بابا چوہدری صاحب کے کی

تھے۔اب مجھے بھی بتا دیا۔کل کو میرے بچے اس گھر کے خادم بن کر رہیں گے۔اسی طرح ہماری تو پوری کی پوری نسل کمی ہی رہے گی۔''

زوار کی آنکھیں جن میں نمرہ کھو چکی تھی، اُن میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ چکی تھی۔وہ ماتھے سے پسینہ اور آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر جانے لگا تو نمرہ نے اپنا رومال آگے بڑھا دیا۔

زوار احمد اپنی مالکن کے اس رویے سے حیران و ششدر رہ گیا۔باپ اتنا ظالم اور بیٹی اتنی ہمدرد......اس کے ذہن میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔وہ نمرہ سے رومال لے کر منہ صاف کرتا ہوا باہر نکل آیا۔

☆......☆......☆

آج تیسرا روز تھا نمرہ روزانہ مبارک بابا سے پوچھتی تھی کہ زوار کہاں ہے۔تو اُن کا ایک ہی جواب ہوتا کہ بیٹا وہ کھیتوں میں ہے۔گندم کی کٹائی کے سلسلے میں ملک صاحب نے اسے وہاں بھجوا دیا ہے۔

نمرہ کے دل کو چین نہ تھا۔وہ ایک نظر زوار کو دیکھنا چاہ رہی تھی۔اِدھر زوار احمد ابھی تک اس معمے کو حل نہ کر سکا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ نمرہ بی بی اس پر اتنی نوازش کر رہی تھی۔اس نے ابھی تک بابا کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔وہ روزانہ بابا کو مجبور کرتا کہ بابا یہاں سے شہر چلتے ہیں۔یہاں بھی محنت مزدوری کرتے ہیں وہاں جا کر بھی کر لیں گے۔کم از کم جو کمائیں گے۔مل تو جائے گا۔مگر یہاں تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔بس کام کرتے جاؤ اور زندگی گزار کر مٹی میں دفن ہو جاؤ۔ساری زندگی میں ایک دفعہ بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا ہو گا آپ کو۔'' مگر نجانے کیوں گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح مبارک علی بھی یہاں سے نکلنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد گندم کی کٹائی کا کام ختم ہوا تو زوار واپس آیا۔دھول مٹی گرد و غبار میں اَٹا ہوا زوار نمرہ کو بہت پیارا لگ رہا تھا۔وہ کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

زوار کی آنکھیں دن رات جاگنے کے باعث بہت زیادہ سُوجی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔نمرہ کا بس چلتا تو اسے فوراً اپنے اے سی والے کمرے میں بلوا کر اپنے ہاتھوں کی صراحی سے جامِ ٹھنڈک پلاتی مگر وہ اپنے بابا کی موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ اس کے بابا اب سب ملازموں کو بولیں گے کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں جائیں، نہائیں، فریش ہو کر آرام کریں مگر اس کے چوہدری باپ کی فطرت میں رحم نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

اس نے اگلا حکم صادر فرمایا کہ اب اس ساری گندم کو بوریوں میں بھر کر گاڑیوں پر لوڈ کریں تاکہ شہر بھجوائی جا سکے۔''ملک مہربان نے کسی پر مہربانی کرنا سیکھی ہی نہ تھی۔

☆......☆......☆

آج کافی دنوں بعد نمرہ کو زوار سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ملک صاحب شہر گئے ہوئے تھے۔مغرب ہونے میں تھوڑا وقت ابھی باقی تھا۔وہ حویلی کے لان میں بیٹھی دروازے کی طرف ہی دیکھے جا رہی تھی۔اس کے دل کو دو سو فیصد یقین تھا کہ آج وہ ضرور زوار کو دیکھ بھی لے گی اور اس سے بات کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔کیونکہ ملک صاحب رات کو دیر سے لوٹنے والے تھے اور ویسا ہی ہوا۔زوار اس حالت میں گھر میں داخل ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں دودھ کے کین تھے۔شاید وہ جانوروں کا دودھ دوہ کر آ رہا تھا۔نمرہ نے اسے برتن کچن میں رکھ کر آنے کا کہا اور لان میں ہی بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

جب زوار احمد کچن سے واپس آ رہا تھا تو وہ ماتھے سے اپنا پسینہ صاف کر رہا تھا۔نمرہ اس منظر کو دیکھ کر دل سے خوش ہوئی کیونکہ زوار کے ہاتھ میں نمرہ کا ہی دیا ہوا رومال تھا۔

نمرہ نے زوار کو بیٹھنے کا کہا تو وہ نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔نمرہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ نہ مانا۔تو نمرہ نے اسے دوبارہ تحکمانہ لہجے میں کہا تو وہ مجبوراً کرسی پر بیٹھ گیا۔مگر اس کا دھیان بار بار دروازے کی جانب اُٹھ جاتا کہ کہیں ملک صاحب کی گاڑی نہ آ رہی ہو۔

''دیکھو زوار مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔'' نمرہ نے تمہید باندھی۔

''جی بی بی جی! کہیے میں سُن رہا ہوں۔'' زوار نے جھکے سر جواب دیا۔

''دراصل زوار میں چاہتی ہوں کہ تم پڑھو اور پڑھ کر کوئی اچھی سی نوکری کرو۔یہ کام تمہارے شایانِ شان

نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی اچھے عہدے پر بیٹھا دیکھ رہی ہوں۔ اس لیے تم شہر جا کر اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کرو۔ میں تمہیں ہر قسم کی سپورٹ دوں گی۔ تمہیں کوئی پریشانی نہ آنے دوں گی۔ تم مجھے بس یہ بتاؤ کہ شہر میں تمہارے رہنے کے لیے کسی واقف کار یا رشتے دار کا گھر ہے۔ اگر ہے تو ٹھیک ہے اگر نہیں تو اس کا بھی ہوسٹل میں بندوبست کروا دوں گی۔ تم بس یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔"

زوار کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا خدا نے اس کے لیے ویسا ہی بندوبست کر دیا تھا۔ نمرہ تو جیسے اس کے لیے فرشتہ بن کر آئی تھی۔ زوار کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ نمرہ نے اسے یہ کہہ کر واپس جانے کو کہا کہ شام ہونے کو ہے تم جا کر اچھی طرح سوچ سمجھ کر مجھے بتاؤ کہ کتنے دن تک نکل سکتے ہو۔ تاکہ میں تمہارے لیے سب انتظام مکمل کر دوں۔"

☆......☆......☆

رات کو جب زوار اپنے بابا کو یہ سب کچھ بتا رہا تھا تو انہوں نے پہلے تو ان سب باتوں کو مذاق سمجھ کر بھولنے کا کہا کہ بیٹا یہ مالک لوگ خواہ مخواہ ہم غریبوں کو سبز باغ دکھا کر ذلیل کرتے ہیں اور جب زوار احمد نے مجبور کیا کہ بابا نمرہ بی بی ایسی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ دل سے چاہ رہی ہیں کہ میں ترقی کروں تو بابا نے اجازت دے دی کہ ٹھیک ہے تم قسمت آزما کر دیکھ لو۔ مگر بابا خود ساتھ جانے کے لیے رضامند نہیں ہو رہے تھے جبکہ زوار کی ضد تھی کہ وہ بھی جائیں گے تو میں جاؤں گا۔ کیونکہ میرے جانے کے بعد یقیناً ملک مہربان بابا کو اذیت دے گا۔

بابا کسی صورت میں جانے کے لیے رضامند نہیں ہو رہے تھے۔ مگر زوار کو یقین تھا کہ وہ بابا کو راضی کر ہی لے گا۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں پرسوں بابا کو جانا ہی ہوگا۔

☆......☆......☆

موسم برسات شروع ہو چکا تھا، گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ کافی دنوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بابا کچھ حد تک راضی ہو چکے تھے، مگر وہ ابھی بھی کہتے تھے کہ تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔ مگر زوار بالکل رضامند نہیں تھا۔ وہ گاؤں سے ہمیشہ کے لیے نکلنا چاہتا تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ بابا ساتھ ہی جائیں۔ اس لیے اس فیصلے میں کچھ دیری ہوتی جا رہی تھی۔

نمرہ زوار کو جلد سے جلد یہاں سے نکالنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے وہ روزانہ اسے سمجھاتی کہ جلد سے جلد یہاں سے نکلو۔

اچانک شور ہونے لگا کہ مبارک بابا کا ہاتھ کٹ گیا۔ زوار اور بہت سے دوسرے لوگ بھاگے۔ پتا چلا کہ بابا کا چارہ کاٹتے ہوئے ہاتھ کٹ گیا ہے اور خون کی ایک ندی بہہ رہی ہے۔ نمرہ نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور فوراً ہی بابا اور زوار کو ساتھ لے کر شہر کو نکل پڑی۔ سب لوگ حیران تھے کہ ایک کمی کی خاطر مالک کی بیٹی ...... یہ سب لوگوں کے لیے حیران کن تھا۔ ملک مہربان شہر میں تھا اور گھر میں دوسری گاڑی موجود تھی۔

مگر نمرہ کو کسی کی باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ بروقت اسپتال پہنچ گئے۔ جس سے یہ ہوا کہ بابا کی جان بچ گئی۔ مگر ہاتھ کٹ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش اور نمرہ کی جلد بازی نے ایک غریب کی جان بچالی تھی۔ وہ رات زوار اور نمرہ اسپتال میں ساتھ رہے۔

ڈرائیور نے نمرہ بی بی کو واپس جانے کو کہا تھا مگر اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ "وہ مبارک بابا کو تڑپتا چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔"

وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ جب آپریشن کے بعد مبارک علی نیند میں تھا۔ جبکہ زوار احمد گہری سوچوں میں گم ہو جانے کے بعد کچھ کچھ سوچ چکا تھا۔ مگر ایک نمرہ تھی جو مکمل ہوش و حواس میں ایک فیصلہ کر چکی تھی، زوار کے مستقبل کا فیصلہ نمرہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس فیصلے کا مستقبل کیا ہوگا مگر وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

صبح جب زوار کی آنکھ کھلی تو نرس بابا کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ بابا کو ہوش آ رہا تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ دواؤں کے اثر سے نکل رہا تھا۔ زوار احمد نمرہ کو پاس نہ پا کر سوچنے لگا کہ آخر نمرہ بی بی کہاں چلی گئی ہیں۔

جب اس نے باہر پارکنگ میں اُن کی گاڑی بھی کھڑی نہ پائی تو اس کو یقین ہو گیا کہ نمرہ بی بی واپس جا چکی ہے۔

اس لیے وہ واپس آ گیا اور بابا کے پاس آ کر اُن سے طبیعت کا پوچھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اسے نمرہ آتی دکھائی دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تازہ گلاب کا گلدستہ اور دوسرے میں فروٹس سے بھرا شاپر اور دوسری کھانے کی

بہت سی چیزیں تھیں۔

زوار احمد نمرہ کی اس چاہت کو کوئی نام نہیں دے پارہا تھا۔ بابا مسلسل روئے جارہے تھے کہ آخر اُن پر اتنی عنایات کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

زوار کے کوئی سوال کرنے سے پہلے ہی نمرہ نے اسے بٹھایا اور کہا کہ میری بات غور سے سُنو۔

''دیکھو زوار مجھے بہت افسوس ہے کہ بابا کے ساتھ اتنا برا سانحہ پیش آیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ بابا کی جان بچ گئی۔ میں اس کو شاید قدرت کی طرف سے ایک بہانہ سمجھوں گی کہ اس نے تمہیں قید سے آزادی دلوائی۔ اور پھر آزادی کے لیے کوئی نہ کوئی قربانی تو دینا ہی پڑتی ہے۔ بابا نے اپنے خون کی قربانی دے کر تمہیں آزاد کروادیا ہے۔''

پھر نمرہ نے ایک بیگ زوار کو دیتے ہوئے کہا کہ اس میں تمہارے لیے کچھ کپڑے، کتابیں اور ضرورت کی تھوڑی سی چیزیں ہیں اور یہ ایک پتا ہے۔ تم یہاں چلے جانا انشاء اللہ آگے کا سارا کام تمہیں وہاں جاکر سمجھ آجائے گی۔'' اور پھر نمرہ نے ایک بڑی رقم زبردستی زوار کی جیب میں ڈالتے ہوئے اجازت چاہی۔ زوار ابھی تک اس منطق کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ مبارک علی بھی خاموشی سے سارا منظر دیکھ رہے تھے اور پھر نمرہ نے اجازت چاہی اور اچھی طرح بابا کا خیال رکھنے کی تلقین کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

☆......☆......☆

مبارک کو چوٹ لگنے کے اگلے روز جب بعد دوپہر نمرہ حویلی پہنچی تو کہرام مچا ہوا تھا۔ بارش آج بھی برس رہی تھی، اوپر سے ملک مہربان برس رہا تھا۔ تمام گھر پر، ملازموں پر۔

''آخر ایک کمی کا ہاتھ ہی کٹ گیا تھا نا، کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی، اگر وہ پورے کا پورا بھی کٹ جاتا تو یہیں تڑپنے دیتے، اس کو اسپتال پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔'' سب لوگ ہاتھ باندھے دربارِ مہربان میں کھڑے تھے۔ نمرہ اندر آئی اور سلام کر کے سیدھی اپنے روم میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

''بابا نمرہ ہمارے لیے کسی فرشتے سے کم نہیں ہے۔ خدا نے ہم پر اپنا کرم کیا اور سارے کام آسان کردیے۔ میرے خدا نے چاہا تو میں اس احسان کو اُتار دوں گا۔ اور پھر جب اس نے بیگ کھولا تو اس میں بہت سے عمدہ قسم کے کپڑے اور جوتے اور دوسری چیزوں کے علاوہ ایک لفافہ بھی تھا۔ اس نے جب لفافہ چاک کیا تو اس میں ایک خط تھا۔

''ڈیئر زوار احمد!

جانتی ہوں۔ تم بہت حیرانگی سے یہ سب چیزیں دیکھ رہے ہوگے۔ مگر میری یہ تم سے التجا ہے کہ حیرانگی ختم کر کے اپنے مستقبل کی طرف توجہ مبذول کرلو۔ میں نے تمہیں جب پہلی دفعہ دیکھا تو اپنے آپ کو تمہارے آگے ہار چکی ہوں۔

مجھے نہیں پتا یہ کیسا جذبہ ہے۔ جو خود بخود اندر سے بیدار ہوا۔ میں تمہیں اپنا سب کچھ مان چکی ہوں، اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کس طرح خود کو میرے قابل بناتے ہو۔ مجھ سے جہاں تک ہوسکا، میں نے اپنا حق اور فرض ادا کردیا ہے۔ اب ابا جان مجھ سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

جتنی جلدی ہوسکے۔ بابا کو لے کر کسی اور جگہ شفٹ ہوجانا تاکہ ابا جان تم تک نہ پہنچ سکیں۔ پڑھائی دھیان سے کرنا خدا تمہارا حامی وناصر ہو۔

تمہاری منتظر

نمرہ

غربت میں پلے زوار احمد کا دل پیار جیسے جذبے سے واقف ہی کہاں تھا۔ مگر نمرہ کے خط کو پڑھنے کے بعد ساری بات اس کے ذہن میں آگئی۔ اور زوار احمد ایک نئے روپ، نئے جذبے کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹرز نے اس شرط پر کہ روزانہ چیک اپ کے لیے آنا ہوگا۔ مبارک علی کو چھٹی دے دی۔ مبارک علی کو اندازہ نہیں تھا کہ اُن کی اگلی منزل کہاں ہوگی۔

زوار نے باہر ایک رکشے والے کو روکا اور اپنے مطلوبہ پتے پر چلنے کو کہا۔

صرف آدھے گھنٹے کے بعد وہ لوگ مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ زوار نے کرایہ ادا کیا اور دروازے پر دستک دی۔

اندر سے دروازہ ایک بوڑھے آدمی نے کھولا اور بڑے احترام کے ساتھ دونوں کو اندر آنے کو کہا۔ یہ ایک تین مرلے کا خوبصورت صاف ستھرا مکان تھا۔ بزرگ کے علاوہ

کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا وہ اکیلے ہی رہ رہے ہیں یہاں۔ ایک صاف ستھرے بیڈ روم میں لے جا کر مبارک علی کو لٹا دیا گیا اور بوڑھا یہ کہہ کر کہ وہ کچن میں جا رہا ہے۔ آپ کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے۔'' وہاں سے چلا گیا۔

ایسا نرم بستر شاید مبارک علی نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ مگر زوار احمد نے فوراً ہی انہیں کہا کہ بابا آپ کی آنکھ میں اب بھی آنسو نہیں آنے چاہئیں۔ یہ سب خدا نے ہم پر اپنا فضل کیا۔''

پھر بوڑھا ٹرے میں ڈھیروں لوازمات لے کر آ گیا۔ دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر انہیں بتایا گیا کہ ایک کمرہ مبارک بابا کا اور ایک زوار احمد کا اسٹڈی روم ہوگا۔ زوار احمد بہت خوش تھا۔ اسے اپنا مستقبل نظر آنے لگ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے روز اُن کے گھر ایک ٹیچر آئے اور انہوں نے آتے ہی زوار کو اپنا تعارف کروایا اور پڑھائی کی روٹین اور سارا ٹائم ٹیبل سمجھا دیا۔ زوار احمد بہت لگن اور محنت سے پڑھائی میں مگن ہو چکا تھا۔ اچھی خوراک، مکمل بیڈ ریسٹ اور دواؤں کی بدولت مبارک بابا کا ہاتھ بھی جلد ٹھیک ہو رہا تھا۔

مبارک علی کو گھر اور گاؤں یاد آتے مگر زوار احمد اپنے ماضی کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مبارک علی کو یاد آیا کہ تہمینہ کا پتا بھی گھر میں ہی رکھا تھا اور زبانی تو اس کو نہیں علم تھا کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں، جبکہ اُن کو ڈھونڈنا بھی ضروری تھا کیونکہ فاخرہ زوار سے منسوب تھی۔ مگر زوار احمد نے بابا کو سمجھایا کہ آپ فی الحال اپنی صحت اور مجھے اپنی پڑھائی پر توجہ مبذول کرنے دیں۔ وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔ اُس دن کے بعد سے آج تک نمرہ دوبارہ کبھی زوار سے نہ ملی تھی اور نہ ہی کبھی زوار اور مبارک علی نے گاؤں جانے کا سوچا تھا۔ انہیں بالکل علم نہ تھا کہ گاؤں کی کیا صورتِ حال ہوگی، البتہ گھر کے اخراجات اور پڑھائی کے تمام اخراجات بوڑھا ٹائم پر ادا کر رہا تھا۔ ہاں ایک دو دفعہ اسے نمرہ کا خط ضرور ملا تھا۔ جس میں ایک تلقین تھی کہ بھرپور محنت کرتے رہنا اور دوسرا بار بار یہ پوچھا گیا تھا کہ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بابا سے کہہ دینا۔ مگر آج تک زوار نے کبھی کوئی چیز خود سے نہیں مانگی تھی۔

پھر ایک روز زوار احمد جب اپنی محنت لگن اور اپنے ٹیچر کی دن رات کی محنت کی بدولت اس نے میٹرک کا امتحان پہلی پوزیشن میں پاس کر لیا۔ اور جب وہ رزلٹ لے کر گھر آیا تو صحن میں ایک خوبصورت نئی بائیک کھڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے ذہن میں آیا کہ شاید کوئی مہمان آیا ہے گھر میں۔ مگر جب اسے علم ہوا کہ یہ نمرہ کی طرف سے انعام ہے۔ تو اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ خدا کے حضور سجدۂ شکر ادا کرنے لگا۔ مبارک علی بھی خدا کا بہت مشکور تھا کہ اس کے بیٹے کی محنت اور لگن رنگ لائی۔ زوار احمد نے بوڑھے کو کہا کہ وہ فوراً نمرہ سے ملنا چاہتا ہے۔ تو اس نے آگے سے کہا کہ ٹھیک ہے آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔

☆......☆......☆

زوار احمد نے کالج میں باقاعدہ ایڈمیشن لے لیا تھا۔ ساتھ ساتھ اس نے ایک آفس بھی جوائن کر لیا تھا۔ وہ بہت محنت سے ترقی کی طرف گامزن تھا۔ بہت دفعہ بوڑھے بابا کو کہنے کے باوجود بھی نمرہ اسے ملنے نہیں آ رہی تھی۔

ایک روز جب کالج کے بعد زوار گھر آیا۔ تو مبارک علی گھر پر نہیں تھے۔ بابا نے بتایا کہ ویسے ہی چہل قدمی کی غرض سے باہر نکل گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔ اتنے میں بابا اندر آئے زوار نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ بس ویسے ہی نکلا تھا کہ شاید پرانے رشتے دار کہیں نظر آ جائیں۔ مگر لوگوں کا جم غفیر دیکھ کر پلٹ آیا کہ نہ جانے وہ کہاں ہوں گے۔''

''ارے بابا دنیا گول ہے۔ اور پھر وہ لوگ اسی شہر میں ہی ہیں تو ایک نہ ایک روز ضرور مل ہی جائیں گے۔ آپ ابھی اُن کا خیال ذہن سے نکال دیں اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ابھی ہم کچھ بھی نہیں۔ یہ مکان، یہ کپڑے، یہ کھانا سب نمرہ بی بی کی عنایت ہے۔ ابھی ہمیں اپنی شناخت بنانا ہے، پھر ہم انہیں کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ہی لیں گے آپ فکر مت کریں۔''

☆......☆......☆

وقت آگے بڑھتا رہا۔ بوڑھا بابا چند دن بخار میں مبتلا رہنے کے بعد رخصت ہو گیا۔ اس نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ جس اسکول میں نمرہ بیٹی پڑھتی تھی میں وہاں پر چوکیدار تھا۔ نمرہ کو پہلے دن سے ہی مجھ سے بہت

پیار تھا۔ میری کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بیوی ہی واحد سہارا تھی۔ وہ بھی جلد ساتھ چھوڑ گئی۔ اور پھر نمرہ میری بیٹیوں کی طرح رہی، اُس نے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی، یہ مکان میرا ذاتی تھا مگر اس میں ضرورت کی تمام چیزیں نمرہ بی بی نے لاکر رکھی تھیں۔ اور پھر بوڑھے نے مرنے سے قبل اپنا مکان زوار کے نام لگوا دیا تھا۔

ایک روز مبارک علی کی طبیعت کچھ ناساز تھی اور زوار بھی آفس سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ اس لیے وہ اکیلا ہی ڈاکٹر کے پاس گیا۔ دوا لے کر وہ نکل ہی رہا تھا کہ تہمینہ بھی شاید دوا لینے کی غرض سے کلینک میں داخل ہوئی۔ مگر نہ جانے کیوں اس نے مبارک علی کو جان بوجھ کر اگنور کرنے کی کوشش کی، مگر مبارک بابا نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا۔ بابا نے تہمینہ کو روکنا چاہا، مگر اس نے نہ ملنا تھا، اس لیے وہ نظر چرا کر بولی۔ ’’مبارک بھائی وہ دراصل بچیاں گھر میں اکیلی ہیں۔ اس لیے مجھے جلدی ہے، میں پھر کبھی آپ سے ملوں گی۔‘‘

مبارک حیران ہو گیا کہ جب اتا پتا ہی معلوم نہیں تو ملنا ملانا کیسا؟‘‘ آخر وہ تہمینہ کو نہ روک سکا اور وہ چلی گئی۔

رات کو بابا نے زوار احمد کو ساری بات بتائی۔ زوار کو بہت دکھ ہوا کہ خالہ کا رویہ سمجھ سے باہر ہے، کم از کم اتنے عرصے ملنے کے بعد خالہ کو پوچھنا تو چاہیے تھا کہ آپ لوگ شہر میں کیسے آئے۔

زوار احمد بس آفس میں معمولی کلرک کے عہدے پر تھا۔ وہاں اس کی ایمانداری اور لگن کا نتیجہ یہ ہوا کہ محض دو سال کے عرصے میں وہ کمپنی کا منیجر بن چکا تھا۔ وہ خدا کا ہر لمحہ شکر ادا کرتا اور اب ہر وقت اس کا من چاہتا کہ نمرہ اسے ملے تاکہ وہ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل جانے پر اس کا شکریہ ادا کر سکے، مگر ایسا نہ ہو سکا۔

ایک روز جب مبارک بابا بہت خوشی سے عید کے لیے شاپنگ کرنے گئے تو بازار میں انہیں تہمینہ اپنی بیٹی فاخرہ کے ساتھ شاپنگ کرتی نظر آ گئی۔ انہوں نے فوراً انہیں جا لیا اور بہت پیار کے ساتھ فاخرہ کو ملے اور ابھی بتانے ہی لگے تھے کہ میں زوار کے لیے کچھ کپڑے خریدنے آیا تھا مگر تہمینہ آگے سے بولنے لگی کہ کچھ دن تک فاخرہ کی شادی ہے اس لیے ہم شاپنگ کرنے آئے

ہیں۔ اس لیے ابھی مصروف ہیں پھر ملیں گے اور ہاں اگر آپ فاخرہ کے سر پر پیار بھرا ہاتھ رکھنے آ سکیں تو ہمیں بہت خوشی ہو گی۔‘‘ مبارک علی غصے اور حیرانگی کے ملے جلے تاثرات سے تہمینہ کی جناب دیکھتے ہوئے بولا۔

’’یہ جانتے ہوئے بھی کہ فاخرہ زوار سے منسوب ہے تم نے پھر بھی کسی اور جگہ اس کا ناتا جوڑ دیا۔ تم نے اچھا نہیں کیا اور فاخرہ بٹی کیا تم نے بھی اپنی ماں کو سمجھایا نہیں۔‘‘

’’دیکھیں مبارک بھائی، میری بچیاں پڑھی لکھی ہیں اور پھر یہ گاؤں میں نہیں رہ سکتیں۔ اس لیے آپ اپنے جیسے کسی رشتے کو ڈھونڈ لیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے تہمینہ اپنی بیٹی کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ مبارک علی نے فاخرہ کی آنکھوں میں واضح نمی محسوس کی تھی۔

’’بابا بہت چپ چپ ہیں۔ کیا کوئی پریشانی ہے آج.....‘‘ بابا کو چپ دیکھ کر زوار نے پوچھا۔

’’ارے نہیں بیٹا.....وہ دراصل بات یہ ہے کہ آج مجھے تہمینہ پھر ملی تھی اور اس کے ساتھ فاخرہ بھی تھی۔ وہ دونوں شادی کی شاپنگ کرنے آئی تھیں۔‘‘

’’شادی کی شاپنگ؟ مگر کس کی بابا؟‘‘

’’بیٹا یہی تو پریشانی کی بات ہے۔ شادی دراصل فاخرہ بٹی کی ہے۔ مگر بیٹا مجھے یہ واضح محسوس ہوا ہے کہ فاخرہ اس بات سے خوش نہیں ہے۔ اور بیٹا انہوں نے ہم سے یہ رشتہ صرف ہماری غربت کی وجہ سے توڑا ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے بیٹا کہ جب تک ہم خود کو دوسروں کے قابل نہ بنا لیں، ہمیں رشتے بنانے کا کوئی حق نہیں اب دیکھو نا..... ہماری غربت کی وجہ سے ہی اپنوں نے رشتوں کی ڈور کو کاٹ دیا۔‘‘ بابا نے انتہائی مغموم لہجے میں کہا۔

’’بابا آپ بالکل پریشان مت ہوں۔ میرے مولا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ زوار نے بڑے اعتماد سے کہا۔

وقت ایک بار پھر آگے بڑھا۔ زوار احمد نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ مبارک علی کو دنیا سے رخصت ہوئے چار سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ زوار کی مالی پوزیشن بہت مضبوط ہو چکی تھی پوری کی پوری کمپنی اس کے کاندھوں پر چل رہی تھی۔

مالک نے ہر طرح کے اختیارات اسے دے رکھے تھے۔ مگر اس نے ہر قسم کی ایمانداری اور لگن سے کمپنی کو

بہت اوپر پہنچا دیا تھا۔

زوار احمد کا بہت دل چاہتا کہ کاش ایک دفعہ اسے نمرہ مل سکے، تاکہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو۔ مگر نہ جانے وہ کہاں غائب ہو چکی تھی۔

پھر ایک روز اسے گاؤں کا ایک آدمی ملا اور اس سے اسے علم ہوا کہ اُن کے گاؤں سے نکلنے کے بعد کچھ ماہ ہی میں ملک مہربان نے نمرہ کا شہر میں کسی سے نکاح کر دیا تھا۔ پھر ایک سال قبل برسات کے موسم میں ایک روز شام کے وقت جب چوہدری اپنے کھیتوں میں سے گزر رہا تھا تو اسے سانپ نے کاٹ لیا۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور پھر ایک دفعہ ہی نمرہ بی بی کو گاڑی میں آتے دیکھا۔ اور اس نے ساری جائیداد میں سے کچھ اپنی ماں اور کچھ ملک صاحب کی دوسری بیوہ کے نام کر دی۔ اور پھر گاؤں میں ایک اسکول کی بنیاد رکھی آج بھی اسکول زیرِ تعمیر ہے مگر نمرہ بی بی اُس کے بعد کبھی گاؤں نہیں آئی۔ زوار احمد ساری بات سُن کر جہاں چوہدری کے مرنے پر خوش ہوا وہاں نمرہ کی شادی کے ذکر سے تھوڑا اپ سیٹ بھی ہوا۔ پھر ایک روز زوار کا من چاہا کہ اُسے گاؤں کا چکر لگانا چاہیے اور جا کر اسکول کا جو منصوبہ نمرہ نے شروع کیا تھا، اسے مکمل کروانا چاہیے۔ پھر اُس نے اس بارے میں مکمل پلان سوچ کر جانے کی تمام منصوبہ بندی مکمل کر لی۔

اگلے روز جس منیجر کی سیٹ پر بیٹھ کر زوار احمد انٹرویوز لے رہا تھا تو جب اس کے اسسٹنٹ نے اگلے امیدوار کو بلایا تو زوار احمد کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی سیٹ پر سے اُچھل پڑا۔ کیونکہ آنے والی کوئی اور نہیں بلکہ اس کی محسن، اس کی ہمدرد اس کی سب کچھ نمرہ تھی۔

زوار احمد نم آنکھوں کے ساتھ فوراً اٹھا اور اپنی سیٹ نمرہ کے لیے پیش کر دی۔ زوار کا اسسٹنٹ سب دیکھ کر حیران ہو کر ایک طرف کھڑا تھا۔

مگر نمرہ کو ذرا حیرانگی نہ ہوئی کیونکہ وہ سب جانتی تھی کہ زوار احمد ضرور آج اس پوزیشن پر ہوگا۔ کیونکہ اس نے جو پودا لگایا تھا وہ آج پھل دینے لگ گیا تھا۔

اور پھر نمرہ نے اُسے مختصراً بتایا کہ جس آدمی سے اس کے باپ نے اس کی شادی کی تھی وہ ایک جواری اور نشئی انسان تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اس کی تمام جائیداد ہڑپ کر لی تھی۔ اُس سے اس کا ایک بیٹا بھی ہے اور پھر شادی کے تیسرے سال وہ ایک روز جوئے کے اڈے پر کسی سے لڑتے ہوئے قتل ہو گیا۔ باقی گاؤں کی ساری صورتِ حال جیسے زوار احمد نے سنی تھی ویسے ہی ہوا تھا۔

اور اب جبکہ وہ اپنے بیٹے کے لیے دودھ تک خریدنے کے قابل نہ رہی تو اس نے نوکری کا اشتہار اخبار میں دیکھ کر یہاں آنے کا سوچا۔

”مگر نمرہ بی بی جب آپ کو میرے بارے میں سب علم تھا تو آپ نے میرے گھر آنے کا کیوں نہ سوچا۔ جبکہ آپ کو اچھی طرح میرا پتا معلوم بھی تھا۔“ زوار نے احسان مندی سے کہا۔

”نہیں زوار میں ایسا چاہ کر بھی نہ کر سکی، کیونکہ اس طرح تم سوچتے کہ شاید میں اپنے کیے احسان کا بدلہ لینا چاہ رہی ہوں۔“ نمرہ نے شرمندگی سے کہا۔

”ارے نہیں نمرہ بی بی، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں زندگی بھر بھی آپ کے احسان نہیں اُتار سکتا۔ آپ پلیز ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ میرے گھر بلکہ اپنے دیے ہوئے آشیانے پر چلیں۔“ اور پھر نمرہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی وہ اسے گھر لے گیا اور راستے میں جاتے ہوئے نمرہ کے بیٹے کو بھی ساتھ لے لیا۔

اگلے روز وہ اپنے منصوبے کے عین مطابق نمرہ کو ساتھ لے کر گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ ابھی وہ لوگ راستے میں ہی تھے کہ انہیں ایک اشارے پر رکشے میں بیٹھے تہمینہ اور فاخرہ نظر آ گئیں۔ زوار احمد نے دیکھا کہ اُن کی حالت بہت خراب تھی۔ کپڑے مانگنے والوں سے بھی بدتر تھے۔ نہ جانے اُن کی یہ حالت کیوں اور کب سے تھی۔ زوار احمد انسانیت کے سب سے مضبوط رشتے کی ڈور کے دوبارہ سے جڑ جانے پر بہت خوش تھا اور خدا کا شکر گزار تھا وہ اب کبھی بھی نمرہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اشارہ کھلنے پر اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

آج میں نمرہ کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار رہا ہوں۔ رشتوں کی ڈور نئے رشتوں نے اس طرح باندھی ہے۔ جو کبھی نہ ٹوٹ پائے گی۔ اب لگتا ہے سارے راستے اور سب راہیں ایک ہو کر میری ہو گئی ہیں۔

☆☆......☆☆

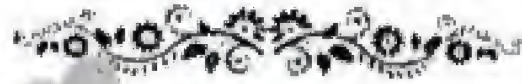
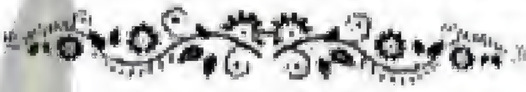
ساتویں سچ بیانی

# بھاگوں والی



جیجل میتلو

لاڑکانہ سے ایک ایسی بھاگ بھری کی کہانی، جو نشانِ عبرت بن گئی تھی

''تُو نہ مجھے دوسرے پوتے کا منہ دکھانا۔ تُو نے تو مجھ سے بیر باندھ لیا ہے، کہ جو میں کہوں وہ بالکل نہ ماننا، چل اب اُٹھ جا۔ زیادہ مکر نہ کر...... نخرے تو ایسے کرتی ہے، جیسے سات سات بیٹے جنے ہوں۔ سارا دن اور ساری رات بس منحوسوں کی طرح سوتی ہی رہنا ہے۔ نہ کام نہ دھام بس کھانا ہے مکھن اور اناج۔'' صبح صبح جو کلثوم کی ساس جو کہ اس کی سگی خالہ بھی تھی، شروع ہوگئی تھی تو وقفے وقفے سے، یہ کل کل جاری تھی اور کلثوم میں تو اُٹھنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ لیکن کون تھا جو کلثوم کے حصے کا کام کرتا۔

عارف کلثوم کے شوہر نے صبح سویرے نہیں بلکہ منہ اندھیرے مویشیوں کو چارا ڈالا اور بیل لے کر کھیتوں کی اور نکل گیا۔ دیہات میں سردی ہو یا گرمی اذان کے ساتھ ہی صبح ہوجاتی ہے۔ عورتیں ہوں یا مرد گھر کے کام کے علاوہ کھیتوں کے کام بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے سب سویرے اٹھتے ہیں۔

کلثوم نے بھی بھینسوں کو دوبارہ چارہ ڈالا کھلی کے ساتھ اس کو بھگویا اور برتن لے کر پانی برتن میں ڈال کر بھینس کے تھن دھونے لگی۔ جب تک تھن دھوئے تب تک ہاتھوں کے لمس لگنے سے تھن دودھ سے بھر گئے اس طرح اس نے دونوں بھینسوں کا دودھ دوھ کر خالہ کے پاس رکھا جو کہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ رخسانہ کلثوم کی بیٹی چولہے میں لکڑیاں اور اُپلے ڈال کر آگ سلگانے کی کوشش کررہی تھی۔

''ارے پھونکنی سے پھونکیں مار...... تب آگ جلے گی۔''

''اچھا، دادی۔'' دس سالہ رخسانہ بولی۔ کلثوم کے تین بچے تھے۔ رخسانہ، ریحانہ اور چھ سالہ راحیل۔ اس کے بعد اس کا ایک حمل ضائع ہوچکا تھا اور اُسی وقت سے کوئی اندرونی خرابی ہوگئی تھی کہ اب کلثوم ماں نہیں بن سکتی تھی۔

یہ بات شہر والی ڈاکٹرنی نے عارف سے کہی تھی۔ عارف کو بھی شوق تھا کہ اس کے بھی دو تین بیٹے تو ہوں۔ اِسی وجہ سے وہ اُسے ڈاکٹرنی کے پاس شہر لے کر گیا تھا اور ڈاکٹرنی نے سختی سے عارف کو منع کردیا تھا کہ اب یہ ماں نہیں بن سکتی اگر کسی دائی کی الٹی سیدھی دوائی کلثوم کو کھلائی یا استعمال کرائی گئی تو یہ مر بھی سکتی ہے اور عارف ڈاکٹرنی کی بات سُن کر ڈر گیا تھا اور اُسے کلثوم سے محبت بھی تھی اور بچے بھی چھوٹے تھے جو کہ اُسے بہت پیارے تھے۔ اُس کا گھر پیارا گھر تھا، جس میں بیٹیاں، بیٹا، پیار کرنے والی بیوی، دعائیں دینے والی ماں تھی۔ اب اور کیا چاہیے تھا اُسے۔ رزق کا ذریعہ اچھی زمین آم اور کھجور کا ایک باغ، وقت سکون اور خوشحالی سے گزر رہا تھا

۔اس لیے وہ صبح سویرے نماز کے بعد کھیتوں میں اپنے بیل لے کر نکل جاتا۔

اس سال عارف کا خیال تھا کہ ایک ٹریکٹر لے لے گا۔ ٹریکٹر تو پچھلے سال ہی لے لیتا لیکن اُس نے سوچا پہلے والدین کو حج کروائے اور یہ سعادت بھی عارف کو حاصل ہوگئی۔ ماں باپ کو حج کروایا اور حج سے واپس آنے کے تین ماہ بعد عارف کا باپ چل بسا تھا۔ عارف کو دکھ تو بہت ہوا۔ بھلا سدا ماں باپ ساتھ تو نہیں ہوتے لیکن ان کی خدمت دل سے کرنی چاہیے اور اُن کی ہر خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ قرآن پاک میں بھی والدین کا حکم ماننے اور خدمت کرنے کا بہت ذکر ہے۔

عارف انٹر پاس تھا اور اُس کے ابا نے اُسے قرآن پاک تفسیر کے ساتھ پڑھایا تھا۔ عارف کا ابا کہتا تھا کہ قرآن پاک صرف عربی میں تلاوت نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُسے دل سے ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھ کر سمجھنا چاہیے۔ اور عارف کو تسلی تھی کہ اُس نے ماں باپ کو خوش کیا تھا اور وہ ایک اچھا صالح بیٹا تھا اور اپنے بیٹے کو بھی وہ ویسا ہی ایک اچھا انسان بنانا چاہتا تھا۔

عارف اور کلثوم کے تینوں بچے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکول میں بھی پڑھ رہے تھے۔

''اے اللہ پاک! تیرے لاکھ شکرانے۔'' اس نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور بیلوں کو ہنکانے لگا۔

☆......☆......☆

''ارے کلثوم تو ابھی تک سو رہی ہے۔ دوپہر ہوگئی ہے۔ عارف کو کھیتوں میں روٹی کون دینے جائے گا، نکمی نہ ہو تو۔'' کلثوم کی ساس نے پھر فضیحتا مچایا۔ اُس کی آواز سُن کر کلثوم ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ رات سے طبیعت خراب تھی لیکن وہ کیا کرسکتی تھی۔ سر پر خالہ روٹی لیے کھڑی تھی۔ کلثوم چکراتے سر کے ساتھ خالہ سے روٹی کا برتن لے کر گھر سے نکلنے لگی پیچھے سے خالہ کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''ایسی بے کار بہو کسی کی نہ ہو جیسی میری ہے۔''

کلثوم جگہ جگہ بیٹھتی، خود کو گھسیٹتی ہوئی کھیت کے قریب پہنچی۔ تو عارف نے اُسے دیکھ کر بیل درخت کے ساتھ باندھے۔ بیلوں سے ہل کھولا تو بیل چارے میں منہ [illegible]نے لگے۔ کلثوم نے عارف کے پاس روٹی، لسی اور



مکھن کا برتن رکھا اور خود بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔

''تیری تو رات طبیعت خراب تھی اب کیسی ہے؟''

اُس نے کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کلثوم کی طرف دیکھا۔ پیلی رنگت، سانسیں چڑھی ہوئی۔

''نہیں آنا تھا نا...... جب طبیعت زیادہ خراب تھی تو۔'' اُس نے فکرمندی سے کلثوم کی کلائی تھامی۔

''میں گھر آ کر کھا لیتا۔''

''ماسی مجھے گھر میں بیٹھنے دے تب نا۔'' کلثوم نے روہانسی ہو کر شکوہ کیا۔

''چل چھوڑ بڑی ہے۔ بڑوں کی باتوں کو دل پر نہیں لیتے۔'' اُس نے مکھن میں گڑ کی مٹھائی (جو آٹے جیسی باریک ہوتی ہے، گنے سے گاؤں میں بنائی جاتی ہے) ملا کر کلثوم کو نوالہ کھلایا۔ کلثوم خوش ہو گئی۔ عارف اُس کی اسی طرح دل جوئی کرتا تھا۔ کلثوم بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ تین بچے ہو گئے تھے لیکن دونوں میاں بیوی کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں نے ساتھ روٹی کھائی، پھر وہ درخت کے نیچے آرام کرنے لگی۔ عارف نے جی بھر کر لسی پی اور برتن باندھ کر کپڑے میں ایک طرف رکھے اور ہل جوتنے لگا۔ کلثوم کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگنے سے نیند آ گئی۔ عارف نے بھی اُسے نہیں جگایا۔ ہل جوتنے کے بعد مویشیوں کے لیے چارا کاٹا اور بیل گاڑی میں رکھ کر بیل گاڑی میں بیل باندھے اور پھر کلثوم کو آہستہ آہستہ جگایا۔ کلثوم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ارے چارا بھی اکیلے ہی کاٹ لیا۔ مجھے بھی جگایا ہوتا تو میں بھی مدد کر دیتی تیری۔'' کلثوم نے عارف سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ تیری طبیعت ناساز تھی تو میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ چل اب بیل گاڑی میں بیٹھ تو گھر چلیں۔ تجھے حکیم کے پاس بھی لے کر چلنا ہے۔'' وہ مویشی والے چارے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ عارف بیل گھر کی طرف ہانکنے لگا۔ وہ محبت سے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ بھاگوں والی کے گھر دو دن بعد چھٹے اور ساتویں بیٹے کا عقیقہ ہے۔ وہ بلاوا دے گئی ہے۔'' ماسی نے عارف اور کلثوم کو سنایا۔

''تجھے پیسے دے دوں گا تُو چلی جانا۔''

''ارے تو تیری اس مہارانی کو کیا ہوا ہے کیا یہ نہیں جا سکتی۔'' ماسی نے جھلا کر کہا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ حکیم نے کمزوری بتائی ہے اور کہا ہے کہ اِسے آرام کرنے دے۔''

''تو میں نے کب اِس کو کولہو میں جوتا ہے۔'' ماسی کی پیشانی پر بل آیا۔

''اور حکیم نے کہا ہے کہ اِسے مکھن، مرغی اور دودھ دے تاکہ یہ تگڑی ہو جائے ورنہ یہ کھاٹ پکڑ لے گی۔''

''ہاں تو سب کچھ تو اِس کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے کب روکا ہے کلثوم کو۔ بڑی گھنی بنتی ہے، تجھے میرے خلاف بھڑکا کر۔ میں سب جانتی ہوں۔''

''اور تُو اِسے دائی کی الٹی سیدھی دوائیں بھی نہ دے۔ نہیں تو یہ کبھی ٹھیک نہ ہو گی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' عارف نے ماں کو سمجھانا چاہا۔

''میں کوئی اِس کی دشمن ہوں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ میرے بھی چھ سات پوتے ہوں۔ مگر اس نے تو ایک پر ہی بس کر دی۔ دو بیٹیاں ہیں تو دو بیٹے بھی تو ہوں۔ لیکن تم میاں بیوی نے میری بات نہ ماننے کی قسم کھالی ہے۔'' وہ پیر پٹختی ہوئی وہاں سے اُٹھ گئی اور کلثوم آنکھیں موندے سوتی بنی سب سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ماسی شادی سے پہلے تُو کتنی اچھی تھی۔ صدقے واری جاتی تھی۔ اب تو سارا دن چڑچڑی رہتی اور سارا غصہ کلثوم پر نکالتی۔

''ہزاروں تو دائیوں کی دوائیں کھا پی چکی ہوں۔ عارف نے کہہ دیا ہے کہ شہر والی ڈاکٹرنی کہتی ہے کہ اب کلثوم ماں نہیں بنے گی کیونکہ چھوٹے کے بعد جو بچہ پیٹ میں مر گیا تھا اور ڈاکٹر نے آپریشن کیا تھا تو اُس نے کہہ دیا تھا کہ اب یہ ماں نہیں بن سکتی۔ وہ ٹھیک تو کہتا تھا۔''

آج جب ماں سے کلثوم نے ساس کی شکایت کی تو ماں نے بھی اُسے ہی سمجھایا کہ تُو مت کبھی ساس کے سامنے ہونا۔ وہ میری بہن ہے اپنوں میں رشتے داریاں اسی لیے تو کرتے ہیں کہ چھوٹے بڑوں کی عزت کریں۔ اس لیے کبھی ماسی سے زبان نہ لڑانا ورنہ میں بھی ناراض ہو جاؤں گی۔ ارے کیا دکھ ہے تجھے۔ عارف تیرا بہت خیال رکھتا ہے، مجھے معلوم ہے۔ باجی گھر کے کام میں تیرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ جب تُو سارا سارا دن کھیت پر کام کرتی

ہے تو یہ تیری ساس ہی تو تیرے بچوں کا روٹی پانی کا خیال کرتی ہے۔ اب اگر تھوڑی زبان کی کڑوی ہے تو کوئی بات نہیں۔ تو صبر کر لے اور مجھے بھی سسرال کی باتیں بتا بتا کر پریشان مت کر۔ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ جب میری کڑوی باتیں سن لیتی ہے تو وہ بھی تیری ماں جیسی ہے۔ ہر گھر میں یہ چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔''
اور واقعی کلثوم کے پاس سوائے چپ رہنے کے کوئی چارا نہ تھا۔

☆......☆......☆

بھاگوں والی کے گھر اس کے دو بیٹوں کا عقیقہ تھا۔ کلثوم بھی ماسی کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ خوشی کے گیت جو کہ بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں گائے جا رہے تھے۔ سارا گھر عورتوں سے بھرا تھا، مویشیوں کے باڑے تک...... بڑا سا صحن تھا کچا جسے پانی کا چھڑکاؤ کر کے جما دیا گیا تھا۔ بیچ میں دری پر میراثنیں ڈھول کی تھاپ پر گیت گا رہی تھیں اور گھنگھرو باندھ کر چھم چھم ناچ رہی تھیں۔ ساتھ بھاگوں والی کی بھابیاں، بھتیجیاں بھی باری باری ناچ گانے میں شریک ہو جاتیں۔ مبارک سلامت کا شور مچا ہوا تھا اور بھاگوں والی خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی اور کلثوم کی ماسی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔
''کتنی خوشی ہے۔ کاش میرے بھی دو تین پوتے ہو جائیں۔'' کلثوم نے سنا ان سنا کر دیا۔ گاؤں والیوں سے باتوں میں مصروف رہی سب کی باتوں کا مرکز بھاگوں والی تھی۔ ''واقعی یہ بھاگوں والی ہے۔ سات بھائی تو تھے ہی اب بیٹے بھی سات ہو گئے ہیں۔'' سکینہ نے یہ کہتے ہوئے ناک پر انگلی ٹکائی۔
سب اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔
''آدھے سے زیادہ گاؤں تو اسی کے خاندان کا ہو جائے گا جب اس نے بیٹوں کی بھی شادیاں کیں تو۔'' ریشماں نے پیش گوئی کی۔
ساری رات خوب محفل جمی صبح سب ناشتا کر کے اپنے گھر روانہ ہوئے۔
گاؤں والوں کو بھاگوں والی پر رشک تھا اور وہ بھی اپنے سات بھائیوں پر ناز کرتی تھی۔ کہتی عید کے دن ساتوں بھائی، سات جوڑے بھیجتے ہیں۔ سارا سال مائیکے کے جوڑے پہنتی ہوں، پھر بھلا کیوں نہ اتراؤں اپنی قسمت پر۔ اب خدا نے مجھے سات بیٹے بھی دے دیے ہیں، میرا بڑھاپا بھی آرام سے گزرے گا۔ سب بہوئیں، پوتیاں میری خدمت کریں گی۔'' ''واقعی سچ تو کہہ رہی ہے۔'' کلثوم نے دل میں سوچا۔

☆......☆......☆

وقت کا کام ہے گزرنا، ماہ و سال گرمی سردی خزاں بہار گزرتے گئے۔ بچے بڑے ہو گئے۔ بڑی کلاسوں اور بڑے اسکول و کالج میں جانے لگے تو بہت سے لوگ گاؤں سے شہر منتقل ہو گئے۔ انہی میں عارف کا گھرانہ بھی شامل تھا۔
بیٹا کالج میں ایم اے پولیٹیکل سائنس میں تھا۔
بڑی بیٹی کی شادی کر دی تھی چھوٹی کی ہونے والی تھی۔
ماسی گاؤں سے ہو کر آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بھاگوں والی نے اپنے چار بیٹوں کی شادی کر دی ہے، بڑی خوش ہے۔'' شہر آنے کے بعد ماسی نے پوتے کی رٹ لگانی چھوڑ دی تھی۔ بس اُسے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پوتا راحیل پیارا تھا۔ ہر وقت اُسے دعائیں دیتی رہتی۔ کلثوم نے بھی سکھ کی سانس لی تھی اور اب اس کی صحت بھی اچھی رہنے لگی تھی۔ ساس کی وہ جی جان سے خدمت کرتی۔ بچے بھی دادی کا بہت خیال رکھتے۔ معمولی سی طبیعت بھی خراب ہوتی تو عارف یا راحیل اُسے موٹر سائیکل پر بیٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔ دودھ، انڈے، فروٹ، اُس کی غذا میں شامل تھے۔
عارف صبح کو دکان پر جاتے ہوئے ماں کے ساتھ ناشتا کرتا۔ اُسے بھی خوب اصرار کر کے کھلاتا، اس درمیان مذاق بھی جاری رہتا۔ کبھی وہ چڑتی اور کبھی مسکراتی رہتی اور خوب دعائیں دیتی۔ رات کو سب مل کر کھانا کھاتے۔ سارے دن کا حال احوال ہوتا ساتھ ساتھ ٹی وی بھی ہلکی آواز میں چلتا رہتا۔

☆......☆......☆

گاؤں سے بلاوا آیا تھا بڑی بیٹی رخسانہ کے بچوں کی سنت و عقیقہ کی دعوت تھی۔
گاؤں میں بہت دھوم دھام سے ایسی دعوتیں ہوتی ہیں۔ پھر یہ تو بیٹی کا معاملہ تھا۔ اس لیے خوب تیاریاں ہوئیں اور سارا گھر گاؤں روانہ ہو گیا۔

کلثوم ریحانہ دو تین دن وہیں رہے۔ بیٹی کی خوشی کی اور بھائی بہنوں کی دعوتیں بھی ہوئیں کیونکہ شہر جانے کی وجہ سے بہت کم گاؤں آنا ہوتا تھا اس لیے رخسانہ نے دونوں ماں بیٹی کو اصرار کر کے روک لیا۔ عارف اور راحیل دوسرے دن لوٹ گئے۔

ماسی کو رخسانہ نے روک لیا کہ اماں کم سے کم پندرہ دن ضرور رہے۔ اور ماسی رُک گئی۔ کلثوم اور ریحانہ ہفتے بعد لوٹ آئیں۔

وقت کچھ سال اور آگے سرک گیا۔ اب جو ماسی گاؤں سے آئی تو بتایا کہ سب خیریت ہے، گاؤں میں لیکن بھاگوں والی بیمار تھی۔ سب بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، سب الگ الگ اپنے بیوی بچوں میں مگن تھے۔ بھاگوں والی کا میاں بھی مر چکا تھا۔ بھاگوں والی کچھ بجھی بجھی سی تھی۔''

''ہاں تو ماسی اُسے اپنے بندے کا دکھ ہوگا۔ تو اُس نے اُداس تو ہونا ہی ہے نا۔'' کلثوم نے کہا۔

''ہاں...... ہاں......'' ماسی جیسے کسی سوچ میں تھی۔ کلثوم اُٹھ کر دوپہر کے لیے سبزی چولہے پر چڑھانے اُٹھ گئی۔

☆......☆......☆

کچھ سال وقت اور آگے نکل گیا۔ ریحانہ کی شادی ہو گئی اور راحیل نوکری پر لگ گیا۔ گھر میں راحیل کی شادی کے چرچے بھی ہو رہے تھے۔ گھر کے سب لوگوں نے یہ ذمہ داری ماسی کو دی تھی اور ماسی ہر دوسرے تیسرے ہفتے گاؤں جانے لگی تھیں۔ اور جب بھی گاؤں جاتیں بھاگوں والی سے ضرور ملتی۔

وہ تو جیسے اُن کی سہیلی بھی تھی اُن سے دوسرے رشتے داری بھی تھی۔ اب بھی وہ گاؤں سے ہو کر آئی تھی تو کلثوم نے باتوں باتوں میں بھاگوں والی کا پوچھا۔

''بس اب وہ پہلے والی بات نہیں ہے۔ سب بیٹے...... اپنے گھروں بچوں میں خوش ہیں۔ بھائی بھابیاں بھی اپنی آل اولاد میں مشغول ہیں۔ اس کا خیال کم ہی رکھتے ہیں۔'' کلثوم بہت حیران ہوئی خیر......

پھر ایک دن جب کلثوم ماسی کے سر میں تیل ڈال رہی تھی تب ماسی نے راحیل کو اور اُسے دعا دیتے ہوئے کہا۔

''اری کلثوم!'' کلثوم ماسی کی طرف دیکھنے لگی۔

''اپنی بہو، تُو خود ہی دیکھ۔ مجھ میں اب دم نہیں یہ ذمہ داری اٹھانے کی اور دیکھ بالکل اپنے جیسی بہو پسند کرنا۔ تُو بہت اچھی ہے۔ تُو نے گھر، بچوں، عارف اور مجھے بھی بہت اچھی طرح سنبھالا ہے۔ اللہ تجھے سکھ دے۔''

اور کلثوم حیرت و خوشی سے ماسی کو دیکھ رہی تھی۔ آج سالوں بعد ماسی اس سے خوش تھی اور اُسے آج اپنی خدمت کا صلہ مل رہا تھا۔

اور دیکھ اپنی بھانجی ہی کو اس گھر میں لانا جیسے میں اپنی بھانجی یعنی تجھے لائی تھی۔'' ماسی کی باتوں میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔ اور کلثوم من ہی من میں اللہ پاک کا شکر ادا کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

کلثوم کی نند کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اس لیے ماسی کو جانا پڑا۔ خبر سنتے ہی جانے کو تیار ہوگئی کہ نہ معلوم میری بیٹی کو کیا ہوا ہے۔ جیسے ہی راحیل آیا اور دادی کو لے کر پھوپو کے گھر روانہ ہوا اور دادی کو چھوڑ کر لوٹ آیا۔

پندرہ دن بعد ماسی لوٹی تو بہت اُداس تھی۔ چپ چپ بھی، کلثوم نے گاؤں والوں عزیز و اقارب کے بارے میں پوچھا۔ گاؤں میں تو سب ٹھیک ہے لیکن بھاگوں والی کے حالات ٹھیک نہیں ہے۔ پھر ماسی نے بتایا اب جب گاؤں گئی۔ شمیم (بیٹی) تو دو تین دن میں ٹھیک ہوگئی بھاگوں والی کا سُن رہی تھی کہ بہت بیمار ہے تو سوچا چل کر دیکھ آؤں۔ رخسانہ کی بیٹی کو ساتھ لیا اور اُن کے ڈیرے میں چلی گئی۔

بھاگوں والی کے ڈیرے میں گئی تو دیکھا ایک کوٹھری کے دروازے کے آگے بچوں کی بھیڑ لگی تھی۔ میں نے پوچھا ایک بچے سے جو ہمیں دیکھ کر ہماری طرف آیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ بھاگوں والی کہاں ہے؟ اس نے بچوں کی بھیڑ کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ......اس طرف...... میں دیکھا اور اس طرف چل دی۔ میں جب وہاں پہنچی تو بچے ایک سرک گئے بیچ میں ایک سامان ڈھونے والی ٹالی آئی۔ جو کہ ہاتھوں سے کھینچی جاتی ہے میں بھاگوں والی پڑی ہوئی ہے۔ کوٹھری کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ ٹالی سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے ہیں، میلی کچیلی سوکھی سی۔ تنومند مرد جیسا تو اُس

کا قد کا ٹھ ہوا کرتا تھا۔ اب کسی آٹھ دس سال کی بچی جیسی دکھ رہی تھی۔ میلی سی رلی پر پڑی تھی۔ پیٹ پر سوکھے ٹکڑے روٹی کے رکھے تھے۔ ساتھ ہی میلی سی کٹوری میں ساگ تھا میں نے دکھ اور غصے سے بچوں سے پوچھا۔ اس کو اس طرح کیوں ٹرالی میں ڈالا ہوا ہے تب ایک بچے نے بتایا کہ آج چاچا دینوں کی گھر والی کی باری تھی اماں بھاگوں والی کو سنبھالنے کی۔ اس لیے پٹھانی چاچی نے صبح جاتے ہوئے اُسے یہاں بٹھا دیا ہے۔ جب سوہنی چاچی آئے گی تو اماں بھاگوں والی کو اُٹھا کر اندر لے جائے گی۔ جب تالا کھلے گا تب یہ اندر جائے گی نا۔ اب دن کے دس بج رہے تھے آدھی دھوپ آدھی چھاؤں نے بھاگوں والی کو بے حال کر دیا تھا۔ ارے سات بیٹوں میں سے کوئی بھی اِسے نہیں رکھ رہا۔ سب نے دن باندھ دیے ہیں۔ آٹھ آٹھ دن سب رکھتے ہیں۔ آج پٹھانی چاچی کے آٹھ دن پورے ہوئے تو سوہنی چاچی کے دروازے پر چھوڑ دیا۔ یہ سب بھاگوں والی کے پوتے پوتیاں تھیں۔ بچے گھروں پر تھے عورتیں اور مرد اپنے کاموں کے لیے کھیتوں کی طرف چلے گئے تھے۔ گندم کی کٹائی جاری تھی۔ میں بھاگوں والی کو ٹرالی سمیت دھکیل دا کر رخسانہ کے گھر لائی۔ اُس کی حالت دیکھ کر سب بہت افسوس کر رہے تھے ایسی اولاد ایسے سات بچے کس کام کے...... ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا ہی اچھا ہے۔ خیر سب سے پہلے میں نے اُسے نہلایا۔ رخسانہ کی مدد سے اپنا دھلا ہوا جوڑا پہنایا اور گاؤں کے کمپاؤنڈر سے طاقت کی سوئیاں لگوائیں اور گلوکوز چڑھوایا۔ صبح شام اچھے چاولوں کی کھیر پتلی کر کے کھلائی۔ بھاگوں والی کی تو جیسے زبان ہی تالو سے چپک گئی تھی۔ دو دن کے بعد اس کا بیٹا آیا کہ میں اماں کو لینے آیا ہوں۔ میں نے خوب ملامتیں کیں اور کہا اب جاؤ۔ میں کچھ دن یہاں ہوں جب جانے لگوں گی تو بتا دوں گی، آ کر لے جانا۔

وہ شرمندہ سا چلا گیا۔ چند دنوں میں ہی وہ ٹھیک ہوگئی بس تھوڑی کمزوری تھی، وہ بھی پھل اور اچھی خوراک کھانے سے کم ہونے لگی۔ بھاگوں جو کہ اُٹھ نہیں پا رہی تھی اب وہ خود چلنے پھرنے لگی تھی۔ صبح و شام دودھ تازہ تازہ اور چوری میں خود اُسے بنا کر کھلاتی تھی۔ وہ رونے لگتی یا پھر میرے ہاتھ چومنے لگتی۔ پندرہ بیس دن میں وہ بالکل بھلی چنگی ہوگئی تھی۔ مجھے بھی تم لوگوں کے روز پیغام آ رہے تھے کہ اب آ جاؤ...... تو میں نے اُس کے بیٹے کو بلایا اور خوب نصیحتیں کر کے بھاگوں والی کو واپس بھیجا۔ وہ بہت دکھی ہو رہی تھی۔ بار بار چھوٹے بچے کی طرح لپٹ لپٹ جاتی۔ میں نے رخسانہ سے کہہ دیا کہ اپنے بچوں کے ہاتھ بھینس کا تازہ دودھ اور چوری بنا کر بھیجا کرنا تمہارے رزق میں برکت ہوگی۔ میں رخسانہ سے یہ بھی کہہ آئی ہوں کہ اب مجھے اس کی بہت فکر رہتی ہے کہ ایسا بھی خدا بڑھاپا نہ کرے۔''

ماسی نے فکر سے کہا۔ کلثوم نے ماسی کو دلاسا دیا اُسے بھی دکھ ہو رہا تھا بھاگوں والی کا۔

''رب سب کا راکھا ہے ماسی۔'' کلثوم نے ماسی کے آگے روٹی رکھی۔ مکھن لسی اور گڑ کی مٹھائی تھی ساتھ ہی ساگ بھی......'' ماسی نے کلثوم کو گلے سے لگا کر بہت سی دعائیں دیں۔ ''تو میری ایک بہو ہے، پر بہت اچھی ہے خدا تجھے بہت سکھ دے۔'' ''آمین۔'' کلثوم نے دل سے کہا۔

☆......☆......☆

ابھی ماسی کو آئے آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ گاؤں سے بھاگوں والی کے فوت ہونے کی خبر آ گئی عارف کلثوم اور ماسی جانے کو تیار ہو گئے آخر رشتے داری تھی۔

گاؤں پہنچے تو کلثوم نے دیکھا۔ واقعی وہ تو کہیں سے بھی بھاگوں والی نہیں لگ رہی تھی۔ عورتیں باتیں کر رہی تھیں کہ اکیلی کوٹھری میں پڑی رہتی تھی۔ نا معلوم کب مرگئی۔ کسی نے آنکھیں تک بند نہیں کی تھیں۔ چالیس پچاس تو کنبے کے لوگ تھے۔ کسی نے بھی اِسے اپنے ساتھ نہ سلایا۔ عبرت لگ رہی ہے مجھے تو۔''

دبی دبی سرگوشیاں تھیں عورتوں کی۔ کلثوم نے بھاگوں والی کی طرف دیکھا۔

''دیکھو مجھے!! سات بھائیوں اور سات بیٹوں کی بہن اور ماں ہوں میں۔'' سوکھی لکڑی جیسی بھاگوں والی کی نظریں جیسے سب سے پوچھ رہی تھیں۔

''کہ بتاؤ...... کہ کیا میں واقعی بھاگوں والی ہوں؟''

اُس کی کھلی آنکھوں میں کلثوم کو یہی سوال نظر آ رہا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

آٹھویں سچ بیانی

# زخم اپنا نشان چھوڑ گیا

غلام عباس سیال

ڈیرہ اسماعیل خان کی بستی ماڑا کے سامنے برپا ہونے والی ماضی
کی ایک لرزہ خیز داستان، آسٹریلیا سے بطور خاص آپ کے لیے



وہ جون کی ایک تپتی دوپہر تھی، شدید گرمی اور حبس کا سماں تھا۔ سورج کسی ظالم اژدہے کی طرح اپنے پیروں میں دھوپ کے گھنگرو باندھے دامان کی پیاسی زمین پر تاک تاک کر آگ کے گولے برسا رہا تھا۔ علاقے کے مکین شدید گرمی اور حبس کے باعث اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے اور وہ اس جھلستی دھوپ میں زبان باہر نکالے ہانپتا ہوا مسلسل دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ پسینہ اس کے ماتھے سے بہہ بہہ کر اس کی خاکی قمیص کو بھگو رہا تھا۔ اکھڑی سانسوں کے ساتھ وہ کبھی کبھار رک کر پیچھے کی طرف دیکھتا اور کسی کو نہ پا کر قدرے ڈھیلا پڑ جاتا مگر جب دوڑتے قدموں کی آوازیں اور لوگوں کا شور اس کے کانوں میں پہنچتا تو وہ ڈر کے مارے پھر سے دوڑ پڑتا۔ وہ خوف کے حصار میں قید ہو چکا تھا۔ اس کے پاؤں دھول مٹی سے اَٹ چکے تھے۔ اس کے جوتے دوڑتے ہوئے راستے میں ہی کہیں اتر گئے تھے اور سیدھے پاؤں کے انگوٹھے سے خون رِس رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے وہ ایک سنسان گلی میں آنکلا تھا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اسے اپنے منہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہتی محسوس ہوئی۔ ہونٹوں پر بے اختیار ہاتھ پھیرا تو دھول مٹی کے ساتھ خون کے چند قطرے بھی اس کی انگلیوں کے ساتھ چپک گئے۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ آوازوں کی دھمک قریب آنے لگی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو بیس پچیس آدمی ہاتھوں میں ڈنڈے لیے دیوانہ وار اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ وہ اپنے منہ اور پاؤں سے رِستے خون کو بھول گیا اور ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ سامنے ہی اسے مسجد پیراں والی نظر آئی، اس نے فوراً مسجد کا سبز رنگی دروازہ پار کیا اور صحن میں بیٹھے قرآن مجید پڑھتے بچوں کی قطار میں راستہ بناتا سیدھا مولوی نور محمد کے سامنے پہنچ کر ڈھیر ہو گیا۔ پسینے میں شرابور اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لہک لہک کے پڑھتے ہوئے بچے ایک دم سے رک گئے اور مسجد میں سکوت طاری ہو گیا تھا۔

جن دو ہاتھوں نے اسے تھام کر اٹھایا، اُن ہاتھوں کی گرفت میں اگرچہ ضعیفی کے باعث کپکپاہٹ تھی مگر اس میں سختی کی بجائے اپنائیت، مہربانی اور شفقت تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا اور صرف اتنا کہہ پایا۔ ’’چاچا نورو! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھے بچالو۔‘‘ یہ کہتے ہی اس کا ذہن ماؤف ہو گیا اور وہ غش کھا کر نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔ رحل پر رکھے قرآنی قاعدے جھوم جھوم کر پڑھتے بچوں پر ایک عجب خاموشی طاری ہو چکی تھی اور وہ اپنے چہروں پر مختلف تاثرات سجائے حافظ نور

محمد کے سامنے پڑے بے ہوش آدمی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔

سفید کھدر کی شلوار قمیص میں ملبوس، درمیانہ قد، مختصر سی سفید داڑھی، پیشانی پر محرابی نشان، سر پر سفید پٹکا باندھے نورانی چہرے والے حافظ نور محمد حالات کی نزاکت بھانپ چکے تھے۔ وہ انتہائی سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھے اور لپک کر مسجد کے داخلی دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھے ہی تھے کہ ملک پرویز کی سربراہی میں فسادی لوگوں کا ایک جتھا مسجد کے دروازے پر آ پہنچا اور وہ سب شور و غوغا کرنے لگے۔ لاٹھیوں، کانگرام کی چھریوں اور چاقوؤں سے لیس ہجوم کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ ''مولوی صاحب! مسجد کا دروازہ کھولیے اور اس مشرک کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔''

''نہیں! یہ شخص سوہنے رب کی پناہ میں آ گیا ہے اور میں ہرگز اسے تم لوگوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ اسے چھوڑ کر چلے جاؤ یہاں سے۔'' جواب میں مولوی صاحب کی گرجدار آواز مسجد کے صحن سے نکل کر پوری گلی میں چکرانے لگی تھی۔

☆......☆......☆

ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے جنوب میں کوئی اکیس بائیس میل کی دوری پر واقع ''ماڑا'' نام کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ بستی کے تقریباً تین سو کچے پکے مکانات بمشکل اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے تھے۔ یہاں کی اکثریتی آبادی مسلمان تھی جن کے بیچوں بیچ کوئی پچاس ساٹھ گھر ہندوؤں کے بھی آباد تھے، جن میں چاؤلہ، ملہوترہ، سچدیوا اور درگن ذات کے ہندو نمایاں تھے۔ ماڑا بستی کے ہندو اپنی امارت کے باعث تمام اہم کاروباری امور میں شریک کار تھے مگر بستی پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم تھا۔ یہاں پر مسلمانوں کے اپنے کھیت تھے، تیل کی گھانیاں اور دیگر چھوٹے موٹے کاروبار تھے۔ چھوٹی سی



بستی کے کچھ گھروں میں زیادہ آسودگی تھی تو کہیں غربت بال کھولے کچے در و دیوار پر ماتم کناں تھی۔ بستی کے کچھ لوگ کھیتوں میں کام کرتے تھے تو کچھ دیہاڑی دار محنت کش مزدور تھے جو صبح سویرے سرفراز کو چوان کے تانگے پر سوار ہو کر شہر چلے جاتے، وہاں دن بھر محنت مزدوری کرتے اور شام کو تھکے ہارے گھروں کو واپس لوٹ آتے تھے۔

ماڑا بستی میں جہاں ہندوؤں کا ایک دھرم شالا، پنڈت بہاری لعل کا مندر اور چوہدری لعل چند کی حویلی تھی وہیں بستی کے ایک بلند مقام پر لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت چکنی مٹی اور گارے کو گوندھ کر مقامی رسم و رواج کے مطابق چوبڑی کی ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کر لی تھی جہاں چٹائی ڈال کر بستی کے لوگ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ مالک کی مہربانی سے اس مسجد کو ایک عدد نیک سیرت مولوی صاحب بھی میسر آ گئے تھے۔ حافظ نور محمد پانچ وقتوں کی اذان دیتے، نمازیں پڑھاتے، فجر اور عصر کی نماز کے بعد بستی کے بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید کا درس دیتے اور ان امور سے فراغت پانے کے بعد بستی کے چوک میں لوگوں کے درمیان آ بیٹھتے، پھر جس کسی نے کوئی دینی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ اس کی رہنمائی کر دیا کرتے تھے۔

کچے پکے گھروں کے مکین بڑے ہی سادہ مزاج اور محبتوں سے گندھے ہوئے تھے۔ مختلف مذہب ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا۔ عید، بقرعید، ہولی، دیوالی، نوراتری اور بیساکھی جیسے مذہبی و موسمی تہواروں کے موقع پر بنائے گئے مخصوص قسم کے کھانوں کا تبادلہ اور ایک دوسرے کی غم خوشی میں شریک ہونا اس علاقے کی ریت تھی۔ چیتر بہار کے موسم میں لگنے والے میلہ بل اوٹ کے موقع پر ہندو مسلمان اکھٹے شرکت کرتے، وہاں پیر شاہ عیسیٰ کے مزار پر حاضری دینے کے ساتھ ساتھ شری گوسائیں کیول رام جی کے تھلے پر منعقد میلے میں بھی شرکت کی جاتی تھی جہاں پر دستور کے مطابق مصری کی ڈلیاں پھینکی جاتی تھیں۔

ماڑا بستی میں انگریز سرکار نے حال ہی میں ایک ڈسپنسری کھولی تھی مگر تعلیم کے معاملے میں اس بستی میں اتنی روشن خیالی نہیں تھی، صرف قریبی قصبے میں ایک اسکول قائم تھا، جہاں پرائمری کی سطح تک تعلیم دی جاتی تھی جس کے بعد شہر کے مشہور مشن ہائی سکول کا رخ کیا جاتا تھا۔ داماں کی دیگر مضافاتی بستیوں کی طرح چونکہ ماڑا بستی بھی ابھی تک بجلی سے محروم چلی آ رہی تھی اسی لیے وہاں سر شام مٹی کے دیے روشن کر دیے جاتے تھے جن کے لیے تیل ٹاؤن کمیٹی ڈیرہ کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا۔ بستی کے عین وسط میں موہن داس چاؤلہ کے نئے گھر کا بڑا شہرہ تھا۔ موہن داس کا خشک میوے اور سوڈا واٹر کا کاروبار موسم کے مطابق بدلتا رہتا تھا۔ موہن چونکہ آرٹ کا دلدادہ تھا، اسی لیے اس نے شہر سے جدید طرز کے مستریوں کو بلوا کر اپنے گھر کی بیرونی دیواروں کو مختلف جانوروں اور پرندوں کی دلکش تصاویر سے مزین کروا چھوڑا تھا۔ موہن داس کے انوکھے گھر کو دیکھنے کے لیے خلقت دور دور سے کھنچی چلی آتی تھی۔ گھر کی بیرونی دیواروں پر منقش جالیوں کے اندر رکھے دیے سر شام جلا دیے جاتے جس سے سرکاری دیوں کی روشنی ماند پڑ جایا کرتی تھی۔ بستی کے لوگ اسے ''دیوں والا گھر'' کہتے تھے۔ خشک میوہ جات کے کاروبار کے علاوہ بستی کے پاس اس کی کچھ زمینیں بھی تھیں جہاں سے سالانہ گندم کی صورت میں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اس کے علاوہ اس نے اپنے گھر کے بیرونی احاطے میں موسمی ترکاریاں بھی اگا رکھی تھیں۔ موہن داس کے محلے داروں سے تعلقات خاصے خوشگوار تھے، خاص کر ہمسائے مولوی نور محمد کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ زمینوں کی گوڈی کرنا، ان میں بیج ڈالنا اور حفاظت کا ذمہ مولوی نور محمد کے سپرد تھا۔ موہن داس کی اراضی کے ایک طرف جہاں نہر تھی تو دوسری طرف یہ ملک پرویز کی زمینوں سے ملی ہوئی تھی۔ ملک پرویز کے والد ملک شبیر نے اس کی شادی کی غرض سے موہن داس کے پاس کچھ زمینیں گروی رکھ کر قرض لیا تھا مگر قرض کی عدم ادائیگی کے سبب زمینوں کے کاغذات موہن داس سے نہ چھڑا سکا تھا اور اسی بات پر دونوں فریقوں کے درمیان دیوانی مقدمہ چلا آ رہا تھا۔

موہن داس کا ایک ہی بیٹا تھا مکیش۔ جو بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ مولوی نور محمد کا بیٹا اقبال

عرف بالو اور مکیش ہم عمر تھے۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا اسی لیے دونوں کی دوستی بے حد گہری تھی۔ مکیش نے جب سائیکل چلانی سیکھی تو نہ صرف بالو کو بھی سکھائی بلکہ اسے بٹھا کر پورا علاقہ بھی گھمایا کرتا تھا۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں چوری چھپے اپنے باپ کی سائیکل نکالتا، بالو کو ساتھ لیتا اور دونوں بستی کے گرد و نواح کی سیر کو نکل جایا کرتے تھے۔

وقت کا دھارا اپنی مخصوص رفتار میں بہتا رہا۔ مکیش اور بالو مثالی دوست تھے۔ وہ ایک ساتھ گاؤں کے درختوں سے لڑھکتے کودتے، آم کے درختوں کو مسکن بناتے، سردیوں میں گنا چوستے، مکئی کے بھٹے کھاتے، ٹیوب ویل پر نہاتے، گرم گرم بالٹیاں، کانچ کی گولیاں کھیلتے، پتنگیں اڑاتے اور گرم دوپہروں میں ڈوروں کو مانجھے لگاتے۔ ان ہی خوبصورتیوں کے درمیان وہ لڑکپن میں آپہنچے تھے۔ بالو کا تیسری جماعت میں ہی پڑھائی سے دل اکتا گیا تو مجبوراً مولوی صاحب نے اسے اپنے چھوٹے بھائی سر فراز کو چوان کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ صبح سویرے چاچے سرفراز کے ہمراہ تانگے پر سوار ہو جاتا اور روزمرہ کاموں میں اس کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ مکیش پرائمری تعلیم کے بعد ابھی ہائی سکول میں پہنچا ہی تھا کہ ایک دن اس کا باپ مقدمے کی پیشی بھگتنے کچہری گیا اور واپسی پر گھات لگائے نامعلوم افراد نے کلہاڑیوں کے کاری وار کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ قاتل مقتول کی لاش کو بیچ سڑک کے چھوڑ کر اس کی سائیکل بھی لے اڑے۔ جب مکیش کے پتا کی لاش گھر لائی گئی تو بستی میں ایک کہرام مچ گیا۔ مکیش جیسا نوجوان جو تعلیم کے میدان میں کافی آگے تک جانے کا خواہشمند تھا اپنے باپو کی اچانک موت کے بعد مجبوراً اسے کاروبار سنبھالنا پڑا۔ کاروبار میں قدم جمانے کے تھوڑے عرصے بعد ہی ماں کی خواہش پر قریبی بستی کے معزز چاؤلہ خاندان کی لڑکی مدھو سے اس کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے دو ماہ بعد مکیش کی ماں بھی اپنے جیون کی مکتی پا گئی، اُسی سال بالو کا چاچا سرفراز بھی ایک ہفتہ سینی ٹوریم میں خون آلود تھوک اگلنے کے بعد چل بسا۔ اب اس کی جگہ بالو تانگے پر سواریاں ڈھونے لگا تھا اور یوں زندگی کا چھکڑا پھر سے چلنے لگا تھا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے باوجود بالو اور مکیش کی یاری جوں کی توں قائم و دائم تھی۔

☆......☆......☆

یہ جاتی سردیوں کی ایک سہانی صبح تھی، سنسان لمبی لمبی راتیں سمٹنے لگی تھیں۔ نئی رت کی آمد نے دامان کے چپے چپے، ذرے ذرے پر اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ سورج پیپل کے درخت پر اپنی اجلی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ چرند پرند اپنا اپنا پیٹ بھرنے اور دانے دنکے کی تلاش میں کلکاریاں مارتے پھر رہے تھے۔ صبح کے کوئی آٹھ بجے کا وقت ہوگا مکیش اپنی دکان کا ''کلاچی دال'' تالہ کھولے دکان کے پٹ ابھی سیدھے بھی نہ کر پایا تھا کہ معاً کسی نے ہلکے سے کھنکھار کر اسے مخاطب کیا۔

''مکیش استاد! میری بات سنو؟'' مکیش اپنی جگہ سے ایک قدم پیچھے ہٹا، دیکھا تو اس کا دوست بالو تانگے کے پائیدان پر قدم جمائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مکیش نے جب سے بالو کو سائیکل چلانا سکھائی تھی اسی دن سے بالو نے اسے اپنا استاد مان لیا تھا۔ مکیش نے دکان سے مُوڑھا باہر نکالا اور بالو کو تانگے سے اتر کر موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بالو کے بیٹھتے ہی مکیش بولا۔ ''حکم کرو بالے؟''

''مکیش تم سے ایک بات کہنی تھی، سوچتا ہوں کہوں کہ نہ کہوں؟''

''بولو یار کیا بات ہے؟'' مکیش نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو بالو اردگرد دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

''کل میرے تانگے پر شہر کے دیوان جگن ناتھ صاحب کا منشی سوار تھا، باتوں باتوں میں اس نے مجھے بتایا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات اپنے عروج پر پہنچ چکے ہیں اور حالات اتنے زیادہ خراب ہو چکے ہیں کہ تقسیم ہو کر رہے گی۔ اندر کی خبر یہ ہے کہ ہماری بستی نئے بننے والے ملک پاکستان کے حصے میں آئے گی بستی کے مسلمان یہیں رہیں گے مگر ہندوؤں کو شاید یہاں سے جانا پڑے گا''۔

بالو کی باتیں سن کر مکیش کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کی ننگی کمر پر چابک کس کر ماری ہو۔ وہ ایک دم سے افسردہ ہو گیا اور بالو کو بغور دیکھتے ہوئے وہ گھبراہٹ

بھرے لہجے میں بولا۔

''ہاں بالو! میں بھی تجھ سے یہی بات کرنے والا تھا۔ اِدھر اُدھر سے کچھ ایسی ہی خبریں مجھے بھی سننے کو مل رہی ہیں۔ کل بی بی سی ریڈیو پر بھی انہی باتوں کا تذکرہ ہو رہا تھا، یار میرا دل تو ڈوبا جا رہا ہے۔ کہیں ہم بچھڑ نہ جائیں''؟

وہ ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ اُسی وقت گلی کی نکڑ سے ملک پرویز نمودار ہوا اور ان دونوں کو غضبناک آنکھوں سے گھورتا ہوا آگے نکل گیا۔

''بالو مجھے ملک کی آنکھوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا''۔

''اوئے تم فکر مت کرو، تمہارا یار ابھی زندہ ہے۔ ہاں یاد آیا یہ بتاؤ کہ شہر کب چلنا ہے؟''

''یار اگلے مہینے کی پانچ تاریخ کو پیشی ہے۔'' مکیش نے جواب دیا

''یار تمہارا اکیلے جانا بالکل مناسب نہیں، میں تمہیں لے چلوں گا۔''

''ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' مکیش نے بالو کی ہاں میں ہاں ملائی اور اسی کے ساتھ ہی بالو اپنے تانگے پر بیٹھ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بالو کے رخصت ہونے کے بعد مکیش نے باجرے کی بوری میں بھمبھو مارا اور دکان سے باہر نکل کر پیپل کے درخت کے نیچے پڑے مٹی کے پیالے میں سارا باجرہ انڈیل دیا۔ صبح سویرے پرندوں کو دانہ ڈالنا اس کا معمول تھا۔

☆......☆......☆

بالو کوچوان شہر کی مشہور پلازہ سینما کے سامنے بنے تانگہ اسٹینڈ پر اپنا تانگہ کھڑا کیے سواری کے انتظار میں تانگے کے اندر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ یکا یک پولیس چوکی سے ایک خالی تانگا سبک رفتاری سے تانگا اسٹینڈ کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ یہ بشیر کوچوان تھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بالو کے دریافت کرنے پر بشیر نے بتایا کہ شہر کے وسط میں بنی عمارت چوگلہ پر کچھ گڑبڑ ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے ہیں اور قریبی دکانوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ یہ سنتے ہی بالو نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے خود وہاں تک جانے کا ارادہ کیا۔ وہ پلازہ سینما سے ہوتا ہوا کینٹ روڈ کے کونے پر بنے تنیش داس پمپ تک پہنچا اور پھر وہاں سے بائیں کروٹ لیتا تو پانوالہ دروازے کو پار کر کے بازار کے اندر گھس گیا۔ محلہ جوگیانوالہ سے رام بازار کے فرنٹیئر بینک تک ساری دکانیں بند تھیں۔ وہ رام لیلا کے سامنے بنے دھرم شالا سے ہوتا ہوا گھاس منڈی تک پہنچا۔ رام لیلا کی عمارت سے غلہ منڈی، چھوٹا بازار اور پھر وہاں سے بڑے بازار تک اِکا دُکا لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ غلہ منڈی کے قریب اسے آسمان کی طرف دھوئیں کی دبیز لہر اٹھتی دکھائی دی۔ بازار میں جگہ جگہ جلی ہوئی اشیاء کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں پتھروں اور ٹوٹی ہوئی کانچ کی بوتلوں کا کچرا جا بجا بکھرا پڑا تھا تو کہیں کپڑے کی تین چار دکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

پونگراں والی گلی کے قریب پولیس کی کھڑی گاڑی سے تھوڑا پہلے اس نے اپنا تانگہ روک لیا۔ گلی کی نکڑ پر لوگ دو دو چار چار کے گروہ میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ کیا باتیں کر رہے تھے اس کے تو کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ دکان کے تھڑے پر کھڑے جان پہچان والے ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ کسی نے فساد کی غرض سے چوگلہ کے عین وسط میں گائے ذبح کرنے کی کوشش کی تھی، جس سے معاملہ طول پکڑ گیا تھا اور تکرار اتنی بڑھی کہ معاملہ ہاتھا پائی تک جا پہنچا تھا۔ راہگیر سہم کر تتر بتر ہو گئے تھے، دکاندار اپنی دکانوں میں گھس گئے تھے اور سیٹھاں والے بازار کی جانب سے دیکھتے ہی دیکھتے نوجوانوں کا ایک مشتعل ہجوم امڈ آیا تھا جنہوں نے ایک ہندو پنسار کو دکان سے اتار کر اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔ اس واقعے کے بعد معاملہ مزید بگڑ گیا تھا جس کے ردعمل میں غلہ منڈی کے قریب سیوا سمتی بھون میں بیٹھے کچھ ہندو نوجوان بھی مشتعل ہو کر مخالف گروپ پر پتھراؤ کرنے لگے تھے۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر کشیدہ صورت حال پر قابو پالیا تھا۔ دو ہندو دکانداروں کے قتل کی رپورٹ درج کرنے کے بعد شہر کے کچھ بااثر اور معتبر افراد ملک خدا بخش، سیٹھ اشرف، سیٹھ بگائی اور نواب ڈیرہ کے بیچ میں

آنے کے بعد معاملہ وقتی طور پر رفع دفع ہو گیا تھا، لیکن فضا میں ابھی تک خوف کی چادر تنی ہوئی تھی۔ بڑا بازار، رام بازار، مسگراں بازار، سیٹھاں والا بازار، بھابیہ بازار اور باکھڑی بازار میں ہو کا عالم تھا اور تقریباً ساری دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اگرچہ اس غیر معمولی واقعے سے بالو کا کچھ لینا دینا نہ تھا مگر پتہ نہیں ایک عجیب سی بے چینی اس کے اندر سما گئی تھی۔ بالو کو لگا کہ اس کا وہاں رکنا عقلمندی کی بات نہیں ہے، پولیس اسے پہلے ہی مشتبہ نظروں سے گھور رہی تھی چنانچہ وہ ہجوم کے اندر سے باہر کھسک آیا اور گھاس منڈی سے ہوتا ہوا امامیہ دروازے کے راستے سرکلر روڈ پر نکل آیا۔ نظام خان گیٹ کے قریب اُسے ٹانگہ اڈے کی دو سواریاں بھی مل گئیں۔ اس نے کرایہ طے کیا اور گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ سواریوں کو اتارنے کے بعد خوش قسمتی سے اُسے نون نواب کی کچھ سواریاں مل گئیں۔ نون نواب پہنچنے کے بعد اس نے گھوڑے کا رخ ماڑا بستی کی طرف پھیر دیا، وہ جلد از جلد بستی پہنچ کر مکیش کو شہر کے ہنگاموں کی اطلاع دینا چاہتا تھا۔

دکان کے سامنے سینہ تانے کھڑے پیپل کے درخت کے ساتھ اپنا گھوڑا باندھ کر وہ مکیش کی طرف چل دیا۔ بالو کو اپنی دکان کی طرف آتا دیکھ کر مکیش نے جلدی سے انتظار میں کھڑے دو گاہکوں میں سے ایک کو برف دے کر رخصت کیا اور دوسرے گاہک کو لیمن سوڈا واٹر کی دو بوتلیں دے کر اس کا کھاتہ تختی پر چڑھایا اور پھر برف کی پیٹی سے ٹھنڈی یخ لیمن سوڈے کی ایک بوتل نکال کر بالو کو پیش کر دی۔ بالو کے بتانے سے پہلے ہی شہر کے ہنگاموں کی خبر مکیش تک شیرو برف والے کی زبانی پہنچ چکی تھی اور وہ اس خبر کو لے کر کافی فکر مند تھا۔ شہر کے جو مناظر بالو نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے وہ مکیش کو من و عن بیان کر دیے، جسے سن کر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

''بالو پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ نفرت کا ایک بگولہ تیزی سے ہماری بستی کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ نہ جانے کب وہ ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے؟ بستی میں بھی میٹنگیں جاری ہیں۔ جلسے جلوس نکالنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے اور نفرت بھری باتیں پھیلائی جا رہی ہیں، ملک پرویز ان کاموں میں پیش پیش ہے۔''

''مکیش استاد! تم چنتا نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' مکیش کو حوصلہ دینے کے بعد بالو نے ٹھنڈی بوتل کے تین چار گھونٹ بھرے اور اٹھ کر چل دیا۔ پیپل کا درخت بھی آج چپ چاپ سر نیہوڑائے اداس کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کے ڈھلتے سورج کی پیلی پڑتی دھوپ گھروں کی منڈیروں پر اتر آئی تھی۔ سرسوں کے تیل میں لہسن کے بگھار کی اشتہا انگیز خوشبو چکراتی پھرتی تھی۔ گلی میں بچوں کے کھیلنے کا شور اور درختوں پر بیٹھی چڑیوں، لالیوں کا شور مل کر ایک مصروف دن کے خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ گھروں کے آنگن سے اٹھتا دھواں مرغولوں کی شکل میں اوپر کی جانب سفر کرتا فضا میں کہیں تحلیل ہو رہا تھا۔ نیلی باریک کناری والی سفید ململ کی ساڑی اوڑھے چولہے کے سامنے رکھی چوکی پر بیٹھی مکیش کی بیوی مدھو دیوی رات کے کھانے کے لیے مسور کی دال تیار کرنے میں مگن تھی۔ وہ شیشے کے مرتبان سے دال کی بڑیاں گن گن کر نکال رہی تھی۔ شام کے کھانے کے لیے آلو بڑیاں بنانے کا ارادہ تھا۔ ارہر کی کھٹی دال اور چاولوں کا خشکہ اس نے صبح ہی تیار کر لیا تھا۔ کام کرتے ہوئے اسے دروازے پر جانی پہچانی دستک کی آواز سنائی دی۔ آج مکیش اتنی جلدی آ گیا، رام بھلی کرے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ اپنی ساڑھی کے پلو سے گیلے ہاتھ پونچھتی دروازے تک پہنچی، کنڈی کھولی تو سامنے مکیش کھڑا تھا۔

''خیر ہے... آج آپ اتنی جلدی آ گئے؟''

''ہاں بس پتہ نہیں آج کل دکان پر بالکل من نہیں لگ رہا۔'' مکیش نے اندر آتے ہوئے کہا۔ مدھو نے دیوار سے ٹکی چارپائی کو اٹھا کر صحن میں بچھا دیا۔ مکیش چارپائی پر بیٹھا تو وہ لپک کر گھڑونچی کے پاس پہنچی اور گھڑے سے ٹھنڈے پانی کا پیالہ بھر کر اسے پیش کر دیا۔ مکیش نے پیالہ لبوں کو لگایا تو مدھو اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے سامنے دستی پنکھا جھلنے لگی۔ مکیش جب شام کو چائے پینے کے لیے آتا تو اپنے ساتھ ہمیشہ موتیا کے

پھول لے کر آتا تھا، جس میں سے آدھے وہ خود پہن لیتی اور باقی گھڑے کی گردن کے گرد لپیٹ دیا کرتی تھی۔ آج مکیش خالی ہاتھ لوٹا تھا۔ ''کیا کوئی پریشانی ہے آپ کو؟'' مدھو کے لہجے میں تشویش تھی۔

''مدھو...! حالات دن بدن خراب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سنا ہے آج شہر میں دنگا فساد ہوا ہے اور چوگلے کے قریب دکانوں کو بھی آگ لگا دی گئی، دو ہندو بھی اس ہنگامے میں جل کر مر گئے ہیں۔ مدھو مجھے لگتا ہے کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے، مگر بالو کہتا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا ہے کیونکہ یہ ہماری پرکھوں کی سرزمین ہے، یہ ہماری مٹی ہے۔ ہماری سات پشتیں یہاں پر رہ رہی ہیں، ہمارا سب کام دھندا یہاں پر جما ہوا ہے۔ مدھو ہم کہیں نہیں جائیں گے۔'' مکیش ایک ہی سانس میں سب کچھ بول کر چپ ہو گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے خاموشی کا راج رہا۔ مدھو کے پنکھا جھلتے ہاتھ ساکت ہو چکے تھے اور وہ مکیش کو فکر مندی سے دیکھے جا رہی تھی۔ مدھو اپنے اندر کی ساری طاقت کو یکجا کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر دوسری طرف میرے بہن بھائی گھر کا سامان باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی سیٹھ رگانی کی لاری آئے گی وہ پہلی فرصت میں بستی سے نکل چلیں گے''۔ کیا ہم بھی ان کے ساتھ چلے جائیں؟

''کیوں...؟'' مکیش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیونکہ یہ بستی اب ہمارے لیے محفوظ نہیں رہی۔''

مدھو نے مدہم سے لہجے میں اپنے اندر کا خوف اُگل دیا تھا۔ تپتی ہوا کا ایک گرم جھونکا زرد پتوں کو درختوں کی ٹہنیوں سے جدا کر کے بڑی دور لے گیا تھا اور گھڑے کی گردن کے گرد لپٹے چنبیلی کے مرجھائے ہوئے پھول اپنے اوپر پڑتے زرد پتوں کے بوجھ سے دب گئے تھے۔ بستی چھوڑنے کا سوچ کر مکیش کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ یہ وہی بستی تھی جہاں اس نے کچی گندم کے سبز خوشوں جیسی نوخیز جوانی کے دن گزارے تھے۔ جہاں پیروں تلے آنے والی مٹی نرم زرخیز اور خوشبودار تھی۔ جہاں چڑیوں کے غول کے غول گھنے درختوں سے اڑتے اور ان کی چہکاریں فضا میں شور بھر دیتی تھیں۔

دھوپ آنگن میں رکھے تلسی کے پودے کو چومتی ہوئی دیواروں سے ڈھلنے لگی تھی۔ مکیش اس شام کھانا کھائے بغیر چارپائی پر ایسا لیٹا کہ نیند کی دیوی نے آلیا۔ اس نے سوتے ہوئے ایک بھیانک خواب دیکھا کہ ساری بستی جل رہی ہے۔ تیس چالیس انجان لوگوں کا ایک ٹولہ ہے جو اشتعال انگیز نعرے مارتا آگے بڑھ رہا ہے۔ کسی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں تو کسی کے پاس کانگرام کی چھریاں، کسی نے مٹی کے تیل کے کنستر اٹھا رکھے ہیں تو کوئی ہاتھوں میں چاقو چھریاں لیے باؤلا بنا پھر رہا ہے۔ ٹولے کے کچھ لوگ بستی کے مخصوص گھروں میں گھستے ہیں اور وہاں کے مکینوں کو نکال کر انہیں چاقو چھریوں سے زخمی کرتے ہوئے دہکتی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ دکانوں میں گھس کر لوٹ مار بھی کر رہے ہیں۔ اس ٹولے میں اچانک اسے ملک پرویز دکھائی دیا جس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

''جلا ڈالو اس کافر، مشرک، کراڑ کو اور جلا ڈالو اس کی دکان کو بھی۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر چیختا ہے اور مشتعل لوگوں کا ہجوم دہلا دینے والے خوفناک نعرے لگاتا اس کی طرف بڑھنے لگتا ہے کہ اچانک ایک بے ساختہ چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے حواس قابو میں کیے، دیکھا تو مدھو فکر مندی سے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹا ٹھنڈے پسینوں میں نہایا ہوا تھا اور باوجود لاکھ کوشش کے وہ اس رات ٹھیک طرح سے سو نہ پایا تھا۔

☆......☆......☆

دن مایوسی اور بے چینی میں گزر رہے تھے، آج کل اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر پیپل کے درخت کے سامنے چڑیوں کو دانہ ڈالنے کے بعد چپ چاپ کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا اور دکان پر بیٹھنے کی بجائے بستی کے گلی کوچوں میں چکر لگانا شروع کر دیا کرتا تھا۔ آج عدالت میں اس کی پیشی تھی اور وہ بالو کے ساتھ کچہری آیا ہوا تھا لیکن وہاں پر بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت ہو چلا تھا، دیواروں پر اونگھتی دھوپ پیلی پڑنے لگی تھی۔ گرمی اور دھوپ کی تمازت سے درختوں کے پتے زمین کی طرف سرپٹ اڑے ہوئے تھے

۔پیشی سے فارغ ہونے کے بعد وہ بالو کے تانگے پر آبیٹھا
۔ یار آج گھر جانے کو بالکل من نہیں کر رہا، بس تم کوئی سواری نہ اٹھاؤ اور مجھے دریا پر لے چلو، آج مجھے سارا شہر دیکھنا ہے۔ مکیش کی فرمائش پر بالو اپنے گھوڑے کی رفتار دھیمی کیے اسے شہر کے گلی کوچوں میں پھرانے لگا تھا۔ کمپنی باغ سے شہر کے مشرقی جانب بہتے سندھ دریا تک اور پھر وہاں سے پولو گراؤنڈ تک لہلہاتے سرسبز و شاداب کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سرکلر روڈ پر کالی دیوی کے مندر کے سامنے پہنچتے ہی اس نے تانگا رکوالیا۔ بالو مکیش کے اندر لکھی تحریر پڑھ چکا تھا اسی لیے بغیر کچھ کہے اس کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ مندر سے واپسی پر وہ دوبارہ تانگے پر آبیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں مسلسل اردگرد کے ماحول پر جمی ہوئی تھیں۔ مٹھائی، حلوہ پوری، چائے، پان اور دودھ دہی کی دکانیں۔ مکانوں اور دکانوں پر ایک گہری نگاہ ڈالنے کے بعد وہ بالو کو بتانے لگا۔

''یار... مدھو نے اپنے بھائیوں کے ساتھ بستی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیہ سے ٹرین لاہور جا رہی ہے جس میں بیٹھ کر وہ لوگ دہلی نکل جائیں گے۔ تین چار ماہ کی بات ہے جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو یہ لوگ واپس اپنے وطن لوٹ آئیں گے۔ مگر میں نے مدھو سے کہہ دیا ہے کہ تم جانی ہو تو جاؤ مگر یہاں سے جانے کو میرا من نہیں چاہ رہا۔ مگر یار بالو لگتا ہے کہ جیسے اب یہاں سے میرا دانہ پانی اٹھ گیا ہے'' مکیش نے قدرے پریشانی سے سب کچھ بالو کے گوش گزار کر دیا تھا۔

''یار چنتا نہ کر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' بالو نے مکیش کو تسلی دیتے ہوئے تانگے کا رخ چھوٹے بازار کی طرف موڑ دیا تھا۔ چھوٹے بازار کے خالصہ دھرم شالے سے گاؤ شالا، وی بی سکول اور پھر فقیرنی دروازے سے باہر نکل کر ٹاؤن ہال کی طرف سے ٹھٹھاراں والے دروازے میں داخل ہو کر جیسا رام ہسپتال کے نزدیک گوپی ناتھ گلی میں بنے مندر کے پاس اپنی ماسی رُچی دیوی کے گھر میں پندرہ بیس منٹ گزارنے کے بعد وہ دوبارہ تانگے کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

ایک گرم اور اداس دن اپنے اختتام کو پہنچنے والا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ جلتے تانبے کے تھال کی مانند سلگتا سورج جلد از جلد نظروں سے اوجھل ہو کر اپنی سرخ لالی سے نجات پانا چاہتا تھا۔ مکیش نے رُچی ماسی کے گھر سے نکلتے سے ایک نظر مندر کی عمارت کے اوپر پھسلتی دھوپ پر ڈالی اور بالو کے تانگے پر پھر سے سوار ہو گیا۔ گمان کے تمام پنچھی اس کے سر پر لحمہ اڑان بھرتے پھر رہے تھے۔

☆......☆......☆

سارے ملک میں فساد کی خبریں تھیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے آس پاس کی ساری بستیاں اور علاقے بھی جل رہے تھے۔ ہر جگہ ایک جیسے مناظر اور واقعات سننے کو مل رہے تھے۔ ماڑا بستی سے ہندو نقل مکانی کرنے کے لیے اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ کچھ آنے والے طوفان کی بو سونگھ کر پہلے سے محفوظ مقامات پر منتقل ہو چکے تھے۔ کچھ دریا پار مشرقی علاقوں کا رخ کر گئے تھے جبکہ بچے کھچے افراد بستی کی سب سے بااثر شخصیت پنوں رام کے گھر میں رہ رہے تھے، جہاں حفاظت کی غرض سے مورچے بنائے گئے تھے۔ ماڑا بستی پر ایک پر ہول سناٹا طاری تھا۔ بستی کے ہر مکین کا چہرہ تنا ہوا تھا اور ان تنے ہوئے چہروں پر کسی پشیمانی کے تاثرات نہ تھے۔ ملک پرویز جیسے لوگوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور وہ ایک ایک لمحے کا جشن منا رہے تھے۔ ملک اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بستی کی چوک میں کھڑا لوگوں کو ورغلا رہا تھا۔ کئی چہرے اجنبی تھے جنہیں باہر سے لایا گیا تھا، بستی کے چند گنے چنے افراد ملک پرویز کے ساتھ تھے ۔مولوی نور محمد جیسے لوگوں کو سختی سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کسی معاملے میں اپنی زبان نہ کھولیں۔ بستی کے ہندو خوفزدہ تھے اور وہ پنوں رام کے گھر میں دبک کر رہنے میں ہی عافیت محسوس کر رہے تھے۔ حالات کی نزاکت کا ادراک کرتے ہوئے چوہدری پنوں رام نے فنانس منسٹر دیوان بھنجو رام اور نواب ڈیرہ اللہ نواز خان سے مدد کی اپیل کی تھی تاکہ ماڑا، ہکڑا اور پروا کے قصبات سمیت گردونواح میں بسنے والے ہندوؤں کو بحفاظت محفوظ مقام پر منتقل کیا جا سکے۔

☆......☆......☆

جال کی گھنی شاخوں پر نیلے، پیلے، سرخ اور کاسنی

رنگوں کے ننھے منے پیلو لٹک رہے تھے، جن کے اندر چھپی بیٹھی کوئل کی کوک سنسان دوپہر کا سینہ چھیدنے لگی تھی۔ ہوا کے ایک گرم جھونکے سے چند پکے پیلو زمین پر گرنے لگے تھے۔اس موسم میں نہ جانے کتنے پیلو اسی طرح ضائع ہو جاتے مگر پھر بھی ''دیے والے گھر'' میں جال کا درخت میٹھے پیلوؤں سے لد جایا کرتا تھا۔گھر کی دیواروں پر جابجا پھیلی سرخ و نارنجی پھولوں والی بیلیں اور تلسی کے پودے کی مخصوص مہک پورے گھر میں اڑتی پھرتی تھی۔

مدھو نے سر اٹھا کر حسرت سے بیری اور جال کے درختوں کی طرف دیکھا اور صندوق میں پڑی ساڑھیاں، سونے اور چاندی کے زیورات نکال کر انہیں ایک چھوٹے ٹرنک میں ترتیب سے رکھنے لگی۔

ڈپٹی کمشنر دیوان شیو سارن نے نواب صاحب کی خصوصی ہدایت پر ڈی ایس پی ایشر داس کی سربراہی میں پچیس سنتریوں سمیت آٹھ لاریاں پرو آ، مکڑ اور ماڑا بستی کے ہندوؤں کو لینے کے لیے روانہ کر دی تھیں ۔دوپہر ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ساری لاریاں پہنچ گئیں جس کے پیچھے سیٹھ بگائی کی ٹرانسپورٹ گاڑیاں بھی آ گئیں۔سنتریوں کی مدد سے قریبی دیہاتوں کے ہندو اپنے ساز و سامان کے ساتھ ایک مقام پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

گرمیوں کی کڑکتی دھوپ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔لو سے بچنے کے لیے چرند پرند بھی جیسے کہیں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ہر سو ایک عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ سرسبز کھیتوں کے درمیان اینٹوں سے بنے ''دیوں والے گھر'' کے مکینوں تک لاریوں کی آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔مکیش نے سامان سے بھرا ٹرنک سر پر اٹھایا اور مدھو کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔مکینوں نے آخری نگاہ اپنے مکان پر ڈالی اور وہ بستی سے باہر کھڑی لاریوں کی طرف چل دیے۔مکیش نے مدھو کو اس کے بھائیوں کے ساتھ لاری میں سوار کیا، سامان کو بس کی چھت پر لادا اور لاری سے اتر کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

مدھو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جلنے لگی تھیں اور چہرہ نمکین قطروں کی حدت سے سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔مگر اس سے کہیں زیادہ اس کا دل جل رہا تھا۔فرنٹ سیٹ پر اپنی ہی تڑپ میں تڑپتی اس بے بس و لاچار عورت کی حالت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑے شخص پر کیا بیت رہی ہو گی؟۔

مکیش اپنی زندگی کے سب سے مشکل ترین موڑ پر آن کھڑا تھا۔وہ اپنے دل کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا تھا۔وہ نہ خود میں جی پا رہا تھا، نہ خود سے جدا ہو رہا تھا۔اسے اپنی ذات پہلے سے بھی زیادہ ہلکی، بے وقعت اور ادھوری لگنے لگی تھی۔نامہربان آسمان کے نیچے آزمائشوں کی تپتی زمین پر حالات کی گرد میں سر سے پاؤں تک اٹا، کسی چیونٹی کی طرح حقیر، کسی مکوڑے کی طرح بے توقیر چپ سادھے کھڑا وہ مدھو کو دیکھے جا رہا تھا۔وسوسے اور سوچیں اس کے دماغ میں اٹھتی تھیں اور اسے پچھاڑ ڈالتی تھیں۔اسے اس وقت دنیا میں اپنے آپ سے زیادہ تنہا کوئی دوسرا شخص نظر نہ آتا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے اپنے ہونے پر دکھ محسوس ہوا تھا۔

دوپہر کی دھوپ لاری کے پائیدان پر پاؤں دھرے، کھڑکی سے ناک چپکائے اندر بیٹھے مسافروں کو الوداع کہہ رہی تھی۔لاریاں بھرتے ہی قافلوں کو کوچ کرنے کا اذن ملا۔قافلے نے بمشکل دو میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ درختوں کی اوٹ میں چھپے شرپسندوں نے لاریوں کے قافلے پر فائر کھول دیا۔سب سے اگلی لاری کا ٹائر پھٹ گیا اور اس کے پیچھے آنے والی لاری کی چھت پر بیٹھے سنتری کے سینے پر گولی جا لگی، مگر پہلی لاری کا تجربہ کار ڈرائیور پنکچر حالت میں اسے کنٹرول کر کے بھگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔نائیویلہ پل پار کرنے کے بعد لاری کا ٹائر بدلا گیا۔جب لاریوں کا قافلہ ڈیرہ شہر کے اندر پہنچا تو پتہ چلا کہ راستے میں ہونے والی فائرنگ سے دس بندے مر چکے تھے اور بارہ کے قریب شدید زخمی تھے۔ماڑا بستی کے پناہ گزینوں میں سے کچھ نے خالصہ دھرم شالہ میں پناہ لی اور کچھ کو سیٹھ گنیش داس بھاٹیہ کے گھر میں رکھا گیا۔یہاں سے ان لوگوں نے قافلے کی صورت میں پگواڑہ (پنجاب) کے علاقے ''ہری دوار'' کی طرف نکل جانا تھا۔

☆......☆......☆

مدھو کے جاتے ہی مکیش کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مٹھی خالی رہ گئی ہے۔ مٹھی کے خالی رہ جانے کا خوف اس کے دل و دماغ میں یکبارگی سا گیا تھا۔ یہ خوف اس کے چہرے اور آنکھوں میں سمندر کی بکھرتی لہروں کی طرح پھیلتا چلا جارہا تھا۔ مدھو کو رخصت کرنے کے بعد وہ بستی میں داخل ہوا تو اسے لوگوں کا ایک جتھا نعرے مارتا دکھائی دیا۔ وہ جلدی سے کوئلوں کی دکان کی اوٹ میں ہو گیا، جتھا جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔

''دکانیں لوٹ لو اور آگ لگا دو۔'' پرویز کی چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی جسے وہ فوراً ہی پہچان گیا تھا۔ وہ بلوائیوں کی قیادت کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوٹ مار مچ گئی۔ ہر طرف چیزوں کے گرنے، ٹوٹنے اور توڑ پھوڑ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ دکان کو لوٹنے کے بعد وہ آگے نکل گئے تھے۔ جب مکمل خاموشی چھا گئی تو وہ ڈرتے ڈرتے کوئلوں کی دکان سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی دکان بھی شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ مگر اس پر ایسا خوف طاری تھا کہ وہ ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ یکا یک بلوائیوں کی نظریں اس پر پڑ گئیں اور وہ چیختے چلاتے اس کے پیچھے لپک پڑے۔ ایک عجیب منظر تھا کہ ایک انسان جان بچانے کے لیے بھاگا جارہا تھا اور بہت سارے لوگ چاقو چھریاں ہاتھوں میں لیے اس کی جان کے درپے اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

☆☆......☆

''ہرگز نہیں! یہ شخص رب کی پناہ میں آ گیا ہے اور میں اسے تم لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔'' مولوی نور محمد کی آواز کی گونج مسجد کے صحن سے نکل کر پوری گلی میں چکراتی پھرتی تھی۔ یکا یک چار افراد مسجد کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے۔ دو بندوں نے مولوی صاحب کو قابو کیا، باقی دو صحن میں پڑے نیم بیہوش مکیش کو اٹھا کر دروازے کی سمت گھسیٹ کر لے گئے اور اندر سے کنڈی کھول کر دروازے کے پٹ وا کر دیے۔ توانا ہاتھوں کی گرفت میں پھنسے مولوی نور محمد یہ منظر دیکھ کر چیخ اٹھے۔

''یہ ظلم ہے۔ کیا تم اس بے گناہ کو قتل کر کے گناہ کے مرتکب ہونا چاہتے ہو؟ خدارا چھوڑ دو اِسے۔ بالو کدھر ہے؟ کوئی جا کر بالو کو اطلاع دے آئے۔'' مولوی نور محمد کی کانپتی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی مگر اس کی آواز پر کان دھرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بستی کے لوگ خاموشی سے بت بنے تماشا دیکھ رہے تھے۔

شام پوری طرح درختوں پر جھک آئی تھی۔ نیلے آکاش پر ڈوبتے سورج کی لالی سے ایسا گمان ہوتا تھا جیسے آسمان نے کسی کے ارمانوں کا خون اپنے اوپر پھیلا لیا ہو۔ تمام پنکھ پکھیرو ٹولیوں کی صورت میں قطار در قطار اپنے آشیانوں کی طرف اڑانیں بھرتے اڑے چلے جا رہے تھے۔ فضا میں پھیلے سناٹے کو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے چیر کر رکھ دیا تھا جو کچی سڑک پر اونچے نیچے راستوں پر تیزی سے دوڑتا اپنے پیچھے دھول مٹی کا ایک طوفان چھوڑے آگے کی طرف سرکتا چلا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے تانگہ بان کو کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔

ملک پرویز کے قدموں میں پڑے مکیش نے سر اٹھا کر سسکاری لی اور پوری طاقت جمع کرتے ہوئے بمشکل بولا۔

''میرا قصور؟''۔ ملک پرویز نے اپنے قدموں میں گرے مکیش کو ایک حقارت بھری نگاہ سے دیکھا اور کمانی دار چاقو سے اس کی گردن پر بھرپور وار کیا، جس سے خون کا ایک فوارہ ابل پڑا۔ اس کی کربناک اور دل دوز چیخیں آسمان کا سینہ پھاڑ رہی تھیں اور مسجد کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔ چاقو کے دو تین وار سہنے کے بعد خون میں لت پت وہ آخری بار تڑپا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ اسی اثناء میں مجمع میں کھڑا ایک شخص آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں میں اٹھائے مٹی کے تیل کی بوتل کو سامنے پڑی لاش پر چھڑک دیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز پیراں والی مسجد تک پہنچنے سے پہلے آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ بالو کے وہاں پہنچنے تک سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ بچا کچھ بھی نہ تھا۔

سورج نے زمین سے اپنی شعاعیں سمیٹنی شروع کیں تو شام کے سایوں نے اپنا قد باہر نکالا۔ رات کی آنکھ کا کاجل دھیرے دھیرے پھیلنے لگا، ہر سُو سیاہی کی چادر تن گئی اور پھر ایک خوفناک تاریکی نے سارا بستی کے مکینوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

☆☆......☆☆☆

نویں سچ بیانی

# اور تماشا تمام ہوا



نبیل جاوید

سرگودھا سے اپنوں پر سے اعتبار کھوتی ایک ماموں کی درندگی کا شکار بھانجی کا نوحہ

میرا نام سائرہ ہے اور میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ ایک بھائی مجھ سے بڑا ہے۔ اور دو بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں غربت اور ماں باپ کی لڑائی ہی دیکھی۔ اس لڑائی کی وجہ سے میرا بڑا بھائی اپنے ماموں کے پاس بھیج دیا گیا۔ لڑائی کی سب سے بڑی وجہ میرے ابو کی بدزبانی اور کوئی کام نہ کرنا تھی۔ امی سارا دن سلائی مشین پر محلے کی عورتوں کے کپڑے سلائی کر کے ہماری روٹی کا بندوبست کرتی تھیں۔ امی ابو کی روز روز کی لڑائی کی وجہ سے میں صرف پرائمری تک ہی پڑھ سکی۔ مجھ سے چھوٹا بھائی بھی صرف 4 سال اسکول گیا اور بڑی مشکل سے چوتھی تک پڑھ سکا۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ میں نے مکینک کا کام سیکھنا ہے۔ اور آج کل وہ مکینک کا کام سیکھ رہا ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی جس کی عمر 10 سال ہے وہ پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ وقت کا کام ہے گزرنا۔ لہٰذا وہ گزرتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا۔

سیانے لوگ کہتے ہیں کہ جوانی مستانی ہوتی ہے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ وہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ میری امی کا ایک کزن جو سعودیہ میں جاب کرتا تھا۔ اس کا نام ریاض تھا اور پیار سے اُسے رجو کہتے تھے اور میں اُسے رجو ماموں کہتی تھی امی ابو کی لڑائی کی وجہ سے مجھے بھی بددعائیں ملتی تھیں۔

''امی کہتی تھیں جب سے تم پیدا ہوئی ہو ہمارے گھر میں بدنصیبی آئی ہے اور ہمارے گھر کے حالات ایسے ہیں تنہائی میں بیٹھ کر روتی اور اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دعا کرتی کہ یا اللہ میرے امی ابو کو اتفاق دے۔ غربت تو پہلے ہی ہے کم از کم ان کی لڑائی تو نہ ہو۔''

پہلی بار جب ماموں ریاض ہمارے گھر آئے تو اس وقت میری عمر 10 سال تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو امی نے کہا کہ سائرہ جاؤ دیکھو کون آیا ہے۔'' میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ماموں ریاض موٹر سائیکل لیے کھڑے تھے۔ میں نے دروازہ کھول دیا تو ماموں موٹر سائیکل لے کر اندر آ گئے۔

امی نے مجھے کہا کہ جاؤ چائے بنا کے لے آؤ۔''

میرے ابو کے رویے کی وجہ سے ہمارے گھر میں رشتہ دار کم ہی آتے تھے۔ ماموں رجو بھی تقریباً 5 سال بعد آئے تھے۔ میں نے پوچھا ماموں سعودیہ سے کب آئے ہیں تو بولے چار دن ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ باجی کوثر کو مل آؤں۔''

"ماموں میرے لیے کیا لائے ہو۔" میرے اس سوال پر وہ بولے۔
"میں جو آ گیا ہوں، یہ کم ہے کیا۔"
اُس وقت تو مجھے اُن کی یہ باتیں سمجھ نہ آتی تھیں۔ ایک دن ہمارے ساتھ رہے پھر چلے گئے۔ جاتے وقت مجھے 500 روپے دے گئے اور ہمارے گھر کا موبائل نمبر لے گئے کہ سعودیہ جاکر آپ لوگوں کو فون کروں گا۔
وقت امی ابو کی لڑائی میں گزرتا گیا دو تین ماہ بعد بھائی آتا۔ ایک دن بڑی مشکل سے رہتا اور پھر چلا جاتا۔
امی بڑے بھائی کو کہتی کہ تم نے ہی میرے دکھ ختم کرنے ہیں۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں تمہارے ابو کی باتیں سُن سُن کر۔ دل لگا کر پڑھائی کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے آمین۔"
☆......☆......☆
جب میں 12 سال کی ہوئی تو امی نے میرا محلے میں آنا جانا بند کرا دیا کہ اب میں بقول ان کے بہت بڑی ہو گئی تھی۔
اسی دوران میری آنٹی شازیہ کی اچانک وفات ہو گئی۔ ہم سب لوگ وہاں پہنچ گئے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہاں ہم تین دن رہے۔ وہاں بھی ماموں رجو آئے ہوئے تھے۔ تین دن میں وہ زیادہ تر ہمارے ساتھ ہی رہے۔ حالانکہ وفات کا موقع تھا۔ اُن کو باہر مردوں میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ وہ ہر وقت میرے آگے پیچھے ہی رہے۔ باتوں باتوں میں ماموں نے میرے ہاتھ چوم لیے اور کہا کہ تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں۔ مجھے ان چیزوں کا پتا نہیں تھا۔ ہم لوگ واپس آنے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو ماموں رجو کمرے میں آ گئے اور کہا کہ میں کل آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ لوگوں سے ملنے کے لیے۔"
"امی نے کہا کہ آج ہی آ جاؤ۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔"



تو ماموں رجو بولے کہ نہیں میں نے کل آپ کے علاقے میں کسی کام سے آنا ہے تو آپ کے گھر چکر لگاؤں گا۔"

ایک ضروری بات تو میں بتانا ہی بھول گئی کہ ماموں رجو سعودیہ سے مسلسل دو یا تین گھنٹے فون پر باتیں کرتے۔ امی سے بمشکل دس منٹ بات کرتے۔ باقی ساری باتیں مجھ سے کرتے۔ مثلاً مجھے کہتے کہ یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ پاکستان بہت یاد آتا ہے۔" کبھی اپنی بیوی کے بارے میں بتاتے کہ اُس نے یہ کہا ہے یا وہ یہ باتیں کر رہی ہے۔" میں بڑا حیران ہوتی کہ ماموں یہ باتیں مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ پھر ساتھ میں یہ بھی کہتے کہ یہ باتیں امی کو نہ بتانا۔ میں عمر کے جس حصے میں تھی اُس حصے میں اکثر لڑکیوں سے ایسی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح 9 بجے ہی ماموں ہمارے گھر آ گئے۔ ابھی ہم ناشتا ہی کر رہے تھے۔ ماموں کافی ساری چیزیں میرے لیے بھی لائے۔ پونی' کلپ، کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے کمرے میں لے گئے اور تمام چیزیں مجھے دیں اور پیار سے میرے ہاتھ چوم لیے۔ اس کے بعد امی نے آواز دی تو ہم باہر آ گئے۔

باتوں باتوں میں امی نے کہا کہ رجو اب سائرہ بڑی ہو گئی ہے۔ اس کا رشتہ تلاش کرو۔"

تو وہ مسکرا کر بولے کہ اب میری چھٹی پوری ہو گئی ہے۔ اگلی دفعہ آؤں گا تو تلاش کروں گا۔"

"ماموں تقریباً دو سال بعد پاکستان آتے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ سائرہ کو ہمارے پاس بھیج دو۔ دو تین دن بعد چھوڑ جائیں گے۔"

"امی نے کہا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ اس دفعہ رہنے دو اگلی دفعہ لے جانا۔"

☆......☆......☆

"وقت گزرتا گیا اور میں ماموں رجو کی باتوں میں آتی گئی۔ جب بھی فون آتا ماموں کہتے اندر کمرے میں جا کر بات کرو۔ تو میں جلدی سے کمرے میں چلی جاتی۔ اکثر امی ابو کی لڑائی ہو رہی ہوتی تو ماموں کہتے کہ یار تمہارے امی ابو ہر وقت لڑتے ہی رہتے ہیں۔ ان کو کچھ سمجھاؤ۔"

تو میں دل ہی دل میں کہتی کہ جن کو خود احساس ہی نہیں یا جو مجھے بد دعائیں دیتے ہیں وہ میری بات کیسے مان سکتے ہیں۔"

"امی ابو کی لڑائی عروج پر تھی اور ہم بہن بھائی خاص کر میں اُن کے نشانے پر تھی۔ ابو کہتے کہ سائرہ بڑی ہو گئی ہے اس کا خیال رکھا کرو۔"

تو امی کہتی کہ تم جو گھر پر رہتے ہو۔ تم ہی خیال رکھ لیا کرو۔"

یہ باتیں سُن کر مجھے بڑا دکھ ہوتا کہ یہ کیسی ماں ہے۔ جسے پتا ہی نہیں کہ اس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے یا پھر اسے کچھ اچھا برا بتانا ہے۔ بس امی تو جب بھی ابو کے پاس بیٹھتیں تو یہی گلہ کرتیں کہ یہ صبح 10 بجے تک سوئی رہتی ہے۔ گھر کے کام نہیں کرتی۔ سلائی مشین پر نہیں بیٹھتی۔" کچھ باتیں اپنے پاس سے بنا کر کہتیں تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔

☆......☆......☆

دو سال اور گزر گئے۔ ماموں ایک بار پھر پاکستان چھٹی پر آ گئے۔ ایک ہفتے بعد ہمارے گھر آئے تو اپنی بیگم کو بھی ساتھ لائے۔

رسمی دُعا سلام کے بعد ماموں نماز پڑھنے چلے گئے۔ اُن دونوں کے رویے سے نہیں لگتا تھا کہ اُن کی نہیں بنتی۔ یا جو ماموں مجھے اپنی بیگم کے بارے میں کہتے ہیں وہ سچ ہے۔ بہر حال اُن کی بیگم مجھے کافی اچھی لگیں۔ ایک دن ہمارے پاس رہے اور دوسرے دن صبح کا ناشتا کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے مجھے کہا تیار رہنا ہم آپ کو لینے آئیں گے۔"

امی نے اجازت دے دی۔

☆......☆......☆

14 سال کی عمر کو پہنچی تو ہر کسی کا دھیان میری طرف ہو گیا۔ محلے میں دھوم مچ گئی کہ مستری اقبال کی بیٹی ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ محلے کی جو بھی عورت آتی۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ پتلی کمر، باریک ہونٹ، ناگن سی زلفیں، محلے کی لڑکیاں کہتیں یار تمہیں تو کسی امیر کے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ گوڑا چٹا رنگ، باریک نین نقوش۔

موبائل کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ امی سلائی مشین پر بیٹھ کر کام کر رہی تھیں اور میں کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ امی نے آواز دی کہ سائرہ دیکھو فون کس کا آ رہا ہے۔ میں نے کہا اچھا دیکھتی ہوں۔

موبائل اسکرین پر نظر پڑی تو ماموں رجو کا نمبر سامنے تھا۔ امی کے پاس موبائل لے کر گئی امی نے کال ریسو کی اور کچھ دیر باتیں کرتی رہیں پھر مجھے آواز دی کہ آ کر بات کرلو۔

''رسمی دعا سلام کے بعد ماموں نے کہا کہ ہم آج آرہے ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ تم نے 3 دن ہمارے پاس رہنا ہے۔''

''میں نے کہا کہ ٹھیک ہے ماموں نے ہنستے ہوئے کال کاٹ دی۔

میں نے الماری سے ریڈ کلر کا ریشمی سوٹ نکالا۔ واش روم سے نہا کر نکلی تو آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ ابھی میں تیار ہی ہو رہی تھی کہ دروازے پر ہارن کی آواز آئی۔ امی نے کہا کہ جاؤ دروازہ کھولو۔'' میں دوڑ کر گئی۔ دروازہ کھولا تو ماموں رجو اور اُن کی بیگم سامنے کھڑے تھے۔

ماموں رجو نے آتے ہی کہا کہ سائرہ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ موسم خراب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ راستے میں ہی بارش ہو جائے۔''

میں نے کہا۔'' ٹھیک ہے۔'' جلدی جلدی تیار ہوئی۔ ہلکا سا میک اپ کیا۔ امی کو گلے لگا کر ملی، ابو کو ملی چھوٹے بھائی گھر میں نہیں تھے ان سے نہ مل سکی۔ ماموں نے کہا کہ تین دن میں واپس چھوڑ جاؤں گا۔''

امی نے کہا۔'' ٹھیک ہے۔''

پھر ہم لوگ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ماموں رجو کے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک جگہ بریک لگائی اور ماموں رجو نے ہمیں فروٹ چاٹ لے کر دی۔ ہم نے خوب مزے سے فروٹ چاٹ کھائی۔ شام تقریباً 4 بجے ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر مجھے اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ تو ماموں رجو نے کہا کہ پریشان نہ ہو۔ ہم تمہیں جلد تمہارے گھر چھوڑ آئیں گے۔''

☆......☆......☆

رات کا کھانا ہم سب نے اکٹھے کھایا۔ میں نے بھی نہ چاہتے ہوئے دو تین نوالے کھائے۔ کھانا کھانے کے دوران ماموں رجو نے کہا کہ آج میں نے کہیں کام سے جانا ہے۔ اس لیے رات کو شاید میں گھر واپس نہ آسکوں۔ سائرہ تم اپنی ممانی کے پاس سو جانا۔''

## عید مبارک

عید کا چاند دیکھنے والو
جب دعا کو اُٹھاؤ ہاتھ ذرا
بس ہمیں یاد تھوڑا کر لینا
اِک غریب وطن ہے رہتا یہاں
جس کے ہے پاس ہنر ایک فقط
جس سے مل لے اُسے محبت دے
جس سے مل لے اُسے عقیدت دے
عید کا چاند دیکھنے والو
اِس غریب وطن کی ایک دعا
بس ذرا چاند دیکھ کر سب ہی
اپنی ملت کی خیر مانگیں سبھی
یا خدا ملک میرا
روز بس عید ہی مناتا رہے
کوئی بھی غم یہاں آ نہ سکے
عید مبارک

شاعر: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

میں نے کہا ٹھیک ہے ماموں جیسے آپ کہتے ہیں۔''

تھوڑی دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد میں ماموں کے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہی ممانی سے کہا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے، مجھے کمبل دیں۔ ممانی نے کہ اکہ ایک ہی کمبل میں سو جاتے ہیں۔'' میں نے کمبل اوڑھا اور نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

رات 11 بجے کا ٹائم ہوگا کہ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرے بالوں پر کوئی ہاتھ پھیر رہا ہے۔ میں جھٹ سے اُٹھ بیٹھی۔ ابھی اُٹھی ہی تھی کہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔

جب میں نے آنکھ کھولی تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی۔ سامنے کوئی اور نہیں میرے ماموں رجو موجود تھے۔ میں حیران پریشان ماموں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بڑی مشکل سے اپنے منہ سے ماموں کا ہاتھ ہٹایا اور کہا کہ ماموں یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' انہوں نے شیطانی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور کچھ نہ بولے۔

میں نے آس پاس نظر دوڑائی تو اِن کی بیگم کمرے میں نہیں تھی۔ اس وقت اپنے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی۔ ماموں کو خدا رسول کے واسطے دیے۔ اُن کے آگے ہاتھ جوڑے قرآن کا واسطہ دیا کہ ماموں یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ کیوں میری زندگی برباد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ماموں نے میری ایک نہ سنی۔ اُن کے جسم کا دباؤ میری جان نکالتا رہا اور میری چیخیں کمبل کے اندر ہی جانے کہاں کھو گئیں۔ ماموں نے میرے جسم کو بری طرح زخم زخم کر دیا تھا۔ میں بے بسی سے ہاتھ پیر چلاتی بے ہوش ہو گئی۔ ہوس کا کھیل ماموں نے کئی بار ایمانداری سے کھیلا تھا۔

☆......☆......☆

صبح دس بجے میری آنکھ کھلی تو کمرے میں سب کچھ اپنی جگہ پر سلامت تھا۔ سوائے میری عزت کے۔ تھوڑی دیر بعد ممانی کمرے میں ناشتا لے کر آئی اور مجھے کہا کہ جاؤ واش روم میں ہو کے آؤ۔'' واش روم گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر لاکھ لاکھ بددعائیں ماموں کو دیں اور اللہ تعالیٰ سے ایک ہی درخواست کی کہ یا اللہ مجھ معصوم کا کیا قصور ہے جو مجھے اتنی سخت سزا ملی ہے۔''

واش روم سے باہر آئی بخار کا کہہ کر پھر سے سو گئی۔ تین راتیں اور دو دن میں ماموں اور ممانی کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی۔ ماموں رجو کا جب جی چاہتا میری روح کو قتل کر کے میرے جسم کی ہر ہر عضو کو زخم لگا دیتے اور اپنے من کی پیاس بجھاتے۔

تیسرے دن ماموں نے کہا کہ تیار ہو جاؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں میں لٹی عزت لیے تیار ہو گئی۔

☆......☆......☆

سارے راستے کوئی بات نہ ہوئی۔ دروازہ امی نے کھولا تو میں دوڑ کر امی سے لپٹ گئی اور جی بھر کر روئی اتنا روئی کہ امی نے کہا سائرہ اب گھر آ گئی ہو۔ کیوں رو رہی ہو۔'' میں امی کو کیسے بتاتی کہ تمہاری بیٹی گھر تو آ گئی ہے پر تمہارے بھائی نے وحشی درندہ بن کر اُن کی بیٹی کی عزت کا موتی پیروں تلے روند دیا ہے۔ اور تمہارے کزن نے تمہاری بیٹی کا وہ حشر کیا ہے کہ اس طرح تو کوئی بازاری عورت کے ساتھ بھی نہیں کرتا ہوگا۔

واپس آتے ہوئے ماموں نے مجھے پہلے ہی ڈراتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے اپنی امی یا ابو کو کچھ بتایا تو تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی خیر نہیں۔''

ماموں مجھے چھوڑ کر فوراً واپس چلے گئے۔ امی نے پوچھا کہ کیسے وقت گزرا۔ میں نے دل میں تو کہا کہ امی تمہاری بددعائیں قبول ہو گئی ہیں۔'' لیکن دل کی بات زبان پر نہ لا سکی کہا تو بس یہی کہ امی بہت اچھا وقت گزرا ہے۔''

اس کے بعد ماموں رجو جب بھی فون کرتے تو مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ مجھے اپنی بربادی کا رونا روتے روتے تقریباً 2 سال گزر گئے۔

☆......☆......☆

اتوار کا دن تھا۔ موبائل پر کال آئی امی نے سنی کال کرنے والا امی کا چھوٹا کزن یعنی رجو کا چھوٹا بھائی تھا۔ ''اس نے بتایا کہ رجو کو پاکستان آئے ہوئے تقریباً دو ماہ ہو گئے تھے اور وہ آج کیری ڈبہ میں واپس جا رہا تھا کہ موٹر وے پر اچانک گاڑی کا ٹائر پھٹا اور گاڑی کو آگ لگ گئی۔ رجو کے جسم کو ایسی آگ لگی کہ وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ باجی! آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ تین بجے اس کا جنازہ ہے۔''

میں نے امی سے پوچھا کہ کس کا فون تھا تو امی بولیں کہ رجو کی گاڑی کو آگ لگ گئی ہے اور وہ زندہ جل گیا ہے۔'' فوراً ہی میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں دوڑ کر کمرے میں گئی۔ اللہ کے پاک کلام کو سینے سے لگایا اور کہا کہ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تُو نے دنیا ہی میں مجھے انصاف دے دیا ہے۔''

امی نے پوچھا کہ تجھے ماموں کی وفات کا دکھ نہیں ہوا۔'' میں نے کہا کہ امی بہت زیادہ دکھ ہوا ہے۔

وہاں جا کر لاش دیکھی تو اللہ یاد آ رہا تھا۔ چھ فٹ کا جوان جل کر راکھ بن چکا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہ آخری وقت میں چیخ چیخ کر معافی مانگ رہا تھا۔ لیکن میرے خیال سے اُس نے جو میرے ساتھ کیا۔ میری ماں کے بھروسے کا خون کیا۔ کیا اُس کے ساتھ ایسا ہونا قدرت کا انصاف نہ تھا۔ ایسے گناہ کی کوئی معافی نہیں ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

☆......☆......☆

# خود اپنے ہاتھوں...



راوی: راحت // تحریر: عبدالغفار عابد

اس دوشیزہ کی دلخراش کتھا، جو سب کچھ اپنے ہاتھوں بھسم کر کے بھی خود کو معصوم سمجھتی ہے

میرا نام راحت ہے۔ میں سرگودھا میں رہتی ہوں ہم تین بہنیں پانچ بھائی ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ مجھے زندگی میں دکھ کے سوا کچھ نہیں ملا۔ میں تیسری جماعت میں تھی، بہت لائق تھی۔ میرے ماموں سے میرے ابو کا زمینوں کا جھگڑا تھا۔ وہ آم لے کر آئے جب میں نے وہ کھائے تو میں بیمار ہوگئی۔ میں ہر وقت روتی رہتی، پاگلوں کی طرح گلیوں میں گھومتی۔ کھانا نہ کھاتی اپنے آپ کو چاقو مارتی۔ ایک بار میں نے اپنی کلائی پر ہی چاقو مار لیا۔

میری بڑی بہن ہمیشہ مجھے بچاتی، باقی گھر والے مجھ سے نفرت کرتے کہ شور کرتی ہے، مر جائے تو اچھا ہے۔ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیم پاگل ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ میں کبھی کبھی کپڑے بھی اُتار کر پھینک دیتی اور پھر 12 سال کی عمر تک میں ایسی ہی رہی۔

ایک نورانی بزرگ نے تعویذ دیا اور پھر میں ٹھیک ہوگئی۔ لیکن میرا تمام وقت برباد ہو چکا تھا۔ میں تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے میٹرک کی جعلی سند بنوالی تھی۔ ہوتے ہوتے میں پندرہ سال کی ہوگئی۔

ایک بات بتانا بھول گئی کہ جب میں چودہ سال کی تھی تو ابو وفات پا گئے۔ وفات سے قبل انہوں نے زمین بھی خرید لی تھی۔ لیکن ابو کے فوت ہونے کے بعد میرے گھر والوں نے خصوصاً میری ماں نے بھی رنگ بدل لیا۔ میرے بڑے بھائی کی تایا کی بیٹی سے شادی ہوگئی تھی۔ میری بڑی بہن کے وٹے میں اُس وقت ابو زندہ تھے۔

آہ! آپی کی یاد کے ساتھ ہی میرا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں گھومتا جا رہا ہے۔ میری کہانی سے پہلے تھوڑا سا میں آپ کو اپنی آپی کا زندگی نامہ سنا دوں۔

اس وقت میرے بھائیوں نے میری امی ابو کے ساتھ مل کر آپی کا گھر برباد کر دیا۔ میرے بہنوئی چکوال میں مل میں کام کرتے تھے۔ میری آپی کی شادی بھی مجبوری میں ہوئی کیونکہ امی ابو نے حج پر جانا تھا۔ فرض تو ادا کرنا تھا۔ جب حج سے واپس آئے تو امی ابو نے آپی کی طلاق کا مطالبہ کر دیا یہ کہہ کر کہ وہ پینڈو ہے۔ اس کے پاس اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ میری بہن کو شہر میں رکھتا۔ میری بڑی آپی کے ساتھ میرے گھر والوں نے بہت زیادتی کی۔ وہ غریب ایک دن بھی سکون کا نہ دیکھ سکی۔

امی کو صرف ایک نوکرانی چاہیے تھی۔ آپی ایک بھائی سے چھوٹی، باقی سب سے بڑی تھیں۔ گھر کا کام کرتی رہتیں۔ گھر میں بھینس بھی رکھی ہوئی تھی، بھینس کا سارا کام، سلائی کڑھائی، سب کے کپڑے سینا، دھونا، ہانڈی روٹی اور سب بہن بھائیوں کو تیار کرنا تھا۔ بس یہی آپی کا کام تھا۔ جو ہماری ماں نہیں کر سکتی تھی۔

آپی نو سال کی عمر سے گھر کی ذمہ داریاں نبھا رہی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بھائی کے وٹے سٹے میں آپی کی شادی ہوگئی اور چار ماہ بعد گھر والوں نے انہیں طلاق دلوا دی اور میری آپی آج پورے چالیس سال کی ہیں۔ گھر والوں نے اُن کی شادی نہیں کروائی اور اب وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ سب پر بوجھ ہیں۔ اب گھر والے کہتے ہیں کہیں شادی کر لو۔ ہماری جان چھوڑو۔ لیکن اب آپی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ گردوں، کمر اور پسلیوں کے مرض میں مبتلا ہیں اور جس کے وٹے سٹے میں شادی ہوئی تھی، اس کے چار بچے ہیں دو بیٹیاں دو بیٹے۔ بڑا بیٹا چوبیس سال کا اور بیٹی پندرہ سال کی ہے۔ وہ میٹرک کر رہی ہے اور چھوٹے بھی پڑھ رہے ہیں۔ بھائی ابو کی جگہ بنک میں ملازم ہے اور شادی کے کچھ سال بعد ہی علیحدہ ہوگئے۔

یوں آپی کی زندگی برباد ہوگئی۔ لیکن اس کا احساس کسی کو بھی نہیں۔ جاننے والوں کو دکھ ہوتا ہے لیکن گھر میں کسی کو بھی نہیں اور باقی چاروں بھائیوں نے میٹرک ہی کیا ہے اور مجھ سے بڑی نے ایم اے کیا ہے ایک ماہ پہلے اس کی شادی ہوئی ہے۔ اب میں اپنی کہانی اسٹارٹ کرتی ہوں۔

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو میرے لیے ایک رشتہ آیا۔ اس کے امی ابو پسند کر کے چلے گئے، پھر انہوں نے کہا کہ لڑکا بھی دیکھنا چاہتا ہے پھر لڑکا آیا۔ مجھے پہلی نظر میں بہت اچھا لگا کسی بڑی کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ میٹرک تک تعلیم تھی اُس کی۔ اور اس کی جو بہن تھیں وہ خوشاب میں رہتی تھیں۔ جہاں اُن کا گاؤں تھا۔ پھر یہ لوگ یہاں آ گئے سرگودھا۔ ان کی بہنیں وہاں بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ رشتہ پکا کرنے آئے تو دوسرے چوتھے نمبر والے بھائی نے نیا ڈرامہ کیا۔ ان کو کہا کہ آپ پانچ لاکھ اور پانچ تولے سونا لکھ کر دو۔ وہ لوگ چلے گئے کیونکہ وہ ناراض ہوگئے تھے اور اس لڑکے سے میری بات بھی ہوتی تھی۔ مجھے اس نے کال پر کہا کہ وہ نہیں مانیں گے۔ اب میں رونے لگی۔ پھر میں اکثر کال پر روتی۔ اس نے کہا کہ گھر والوں کو کہو کہ کوئی ڈیمانڈ نہ کریں۔ میں ابو کو منا لوں گا۔"

اس لڑکے کا نام اکرم تھا میں نے کیسے گھر والوں کو منایا خدا جانتا ہے اور پھر 20 فروری 2011ء کو ہمارا نکاح ہوا اور اس مدت میں اسے مجھ سے اور مجھے اس سے پیار ہوگیا۔ وہ ساری رات کال پر پیار بھری باتیں کرتا۔ وہ اسمارٹ اور خوبصورت بھی بہت تھا اور اس کی آواز بھی

بہت پیاری تھی۔ اس کی تربیت بھی بہت اچھی ہوئی تھی۔ تمیز سے بولتا۔ نکاح پر میں بہت خوش تھی۔

میرے گھر والے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتے تھے۔ مگر وہ اکرم مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔

میں نے اُن کو اپنی تعلیم میٹرک بتائی تھی۔ اس کے بعد اس کی ملاقاتوں کا دورانیہ بڑھ گیا۔

وہ ایک دن چھوڑ کر آتا، چار پانچ گھنٹے بیٹھ کر چلا جاتا۔ اُس کے گھر والے رخصتی کا کہتے تو میری امی یا بھائی بولتے کہ ابھی راحت چھوٹی ہے۔'' میرے گھر والوں نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے میک اپ میں رہا کرو۔ ہاف بازو پہنو۔ ہائے میں گھر والوں کی مانتی رہی۔ اس حلیے میں ان لوگوں کو میں اچھی نہ لگتی۔ میرے سسرال کا ماحول مذہبی تھا۔ اور میں نادان کس طرح گھر والوں کی باتوں میں آ گئی۔ اکرم سے میری محبت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ گھر آتا تو گویا میں خوشی سے جھوم جاتی۔

میری محبت، میری خوشی سے میری امی بھائی اور مجھ سے بڑی بہن جلنے لگے تھے اور ان کی باتوں میں آ کر میرے فیشن میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اکرم کے گھر والے مجھے سمجھاتے تو میں کہتی کہ میری اپنی زندگی ہے جسے مرضی گزاروں۔''

اکرم بھی اب مجھے ٹوکنے لگے تھے۔ جب میں یہ بات اپنے گھر والوں کو بتاتی تو وہ مجھے کہتے کہ تم اکرم کو باتیں سناؤ۔ اور میں اکرم کو گالیاں دینے لگ گئی۔ میں نے اپنے پیار کو ہی غلط سمجھنا شروع کر دیا کیونکہ امی اور بہنیں مجھے روز بھڑکاتے۔ ایک دو بار اکرم نے مجھے کہا کہ راحت تم مجھے کھونے کے بعد بہت پچھتاؤ گی۔ گھر والوں کی باتوں میں آ گئی ہو۔'' جب وہ میرے گھر آتا تو میرے گھر والوں کا رویہ تبدیل ہو جاتا۔ کوئی اُس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔

اِس دوران ایک بار ہم کلر کہار بھی گئے۔ جھولے جھولے، پہاڑ پر چڑھے، جھیل والی کشتی پر جھولا لیا۔ اس سیر میں اکیلے نہیں تھے بلکہ میری بہنیں اور ایک بھائی اور بھتیجا اور بھتیجی بھی ساتھ گئے تھے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں دشمنوں کے ساتھ آئی ہوں۔ بھائی کے بچے تو ہمارا پیار دیکھ کر جلے ہی تھے لیکن میری بہن بھی جلتی تھی کیونکہ جب میرا نکاح ہوا تھا تو اس نے اکرم کو اپنی محبت میں پھنسانا چاہا تھا۔ جب بھی وہ مجھ سے بات کرتا میری بہن فون لے لیتی اور علیحدگی میں اس کے ساتھ باتیں کرتی۔ وہ بڑی تھی۔ اس کا کام تھا مجھے سمجھانا لیکن وہ چار چار گھنٹے اکرم سے باتیں کرتی۔ جب میں اکرم کے ساتھ بدتمیزی کرتی تو وہ بھی آپی کے گن گاتا۔

کاش کہ میں نادان نہ ہوتی۔ اے کاش لفظ کاش ہی نہ ہوتا۔ اس دوران آپی نے مجھے بیوٹی پارلر میں داخلہ دلوا دیا۔ میں وہاں جانے لگی سیکھنے کے لیے لیکن اکرم کا مجھ سے ملنا برقرار رہا۔ وہ بات بھی ساری رات کرتا۔ اس دوران کئی بار میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اس کے گھر میں بھی گئی۔

جب میری قسمت میں ہار لکھ ہی دی گئی تھی تو میں کیسے جیت پاتی۔ میں ان کے گھر گئی۔ اس کی سوتیلی امی نے کہا کہ کھانا لگاؤ۔'' مجھے میرے بھائی نے بلایا اور کہا کہ ان سے کہو کہ میں نوکر نہیں مہمان ہوں۔'' میں نے جا کر یہی کہہ دیا۔

خیر وہ لوگ بہت اچھے تھے۔ ان کی امی نے بُرا نا مانا۔

''اکرم کے ابو نے کہا کہ راحت بیٹا میک اپ نہ کیا کرو۔ کیا تم یہ آٹا تھوپ لیتی ہو۔'' میں نے غصے میں کہا کہ میں تو کروں گی آپ کو کیا تکلیف ہے۔''

خیر وہ تو چپ کر گئے لیکن اکرم سے برداشت نہ ہوا۔ جیسے ہی میں واپس گھر آئی اس نے کہا کہ یا تو انسان بن جاؤ یا طلاق لے لو۔'' میں نے کہا OK۔'' پھر میں نے اپنے گھر والوں کو یہ بات بتائی تو ان کا جواب یہ تھا کہ اس کو کہو کہ میں تمہاری خادمہ نہیں ہوں۔ دے دو طلاق۔''

میں بچی تھی، نا سمجھ تھی، نادان تھی یا بے وقوف تھی۔ اپنا پیار ایک طرف رکھ کر میں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

ان حالات میں گھر والے بہت خوش تھے۔ اکرم ایک دو بار آئے گھر والوں سے کہا کہ راحت کی اب رخصتی کر دیں۔''

گھر والوں نے انکار کر دیا کہ وہ ابھی بچی ہے۔''

اور یہ بات سن کر وہ اور بھی تپ گیا۔

اکرم پیر پٹختا وہاں سے چلا گیا۔ اب گھر والوں نے کہا کہ اکرم کی کال آئے تو اس کے ماں باپ کو گالیاں دینا۔''

جب کال آئی تو میں نے کہا کہ اپنے باپ کے ہو تو طلاق دو۔'' بس وہ اینڈ تھا ہماری محبت کا۔ اس نے میرے بھائیوں کو کال کر کے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہو۔ طلاق ہی چاہتے ہو تو دے دوں گا۔ میں کل آ رہا ہوں تم لوگ سوچ لو۔''

جب اکرم آیا تو انہوں نے کہا کہ ہم طلاق چاہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے بھی منہ سے اس کو طلاق دینے کا کہا۔ ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا۔

میں نے اس کی کزن کو کال کر کے کہا کہ میں تو برباد ہو گئی ہوں۔ یہ طلاق ہی نہیں دیتا اور اپنے پاس سے باتیں بھی کیں۔ ان کے خاندان میں بے عزتی ہو گئی۔ پھر ایک دن میں نے آٹو کروایا اور ان کے گھر گئی۔ پہلی دفعہ اُن سب کا موڈ آف تھا۔ میں نے کہا کہ پلیز تم مجھے طلاق نہ دو۔ اس نے کہا کہ جب تمہارے گھر والے یہ چاہتے ہیں تو میں کیوں نہ دوں۔" اِدھر گھر والوں کی کالیں آنے لگیں کہ کہاں دفع ہو گئی ہو۔ اکرم نے آخری بار یہ کہا کہ میں جتنا پیار کرتا تھا اتنا کوئی اور کر گیا تو کہنا۔ وقت ہے سمجھ جاؤ۔ یہاں سے نہ جاؤ اگر جانے کا دل ہے تو ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ۔ ہمارا نکاح پہلے ہی ہو چکا ہے۔" اِدھر سے آپی کی کال آئی کہ میری طبیعت خراب ہے۔ دل میں درد ہے۔ جلد آؤ ورنہ ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔"

میں نے اسی وقت اس کو کہا کہ میں جا رہی ہوں۔" میں واپس آئی۔ پھر ٹھیک چار دن بعد طلاق کے پیپرز آ گئے۔ پتا نہیں کیوں اُس دن میں دل کھول کر روئی۔ ایک دم سے گھنے پیڑ سے تپتی دھوپ میں آ گئی تھی۔ لیکن گھر والے بہت خوش ہوئے۔ سب نے مبارک باد دی کہ جان چھوٹی اور پہلی دفعہ میں نے سب کو کہا کہ میں غم سے مر رہی ہوں۔ تم کو خوشی کی سوجھی ہے۔"

وقت کا کام گزرنا ہے گزرتا ہی چلا جاتا ہے کہ یوں ایک سال نکاح رہا، طلاق ہو گئی۔ اس کا دیا ہوا پیار میں نہ بھول سکی۔ وہ بچوں کی طرح مجھے خوش کرتا تھا۔ جب 2010ء میں بات چلی تو میں ہر کسی کو تم کہتی تھی۔ اس نے مجھے 'آپ' کہنا سکھایا۔ مجھے اچھا برا سکھایا اور اتنی بار وہ آیا، میں اُس کے ساتھ گئی۔ کتنی ہی بار ہم اکیلے تھے لیکن اس نے مجھے کنوارا ہی رہنے دیا کہ آپ میری عزت ہو۔ بے شک میرے نکاح میں ہو۔ پھر اس نے یہ بھی کہا کہ تمہارے گھر والوں کا رویہ بھی نہیں ٹھیک۔ میں کیوں کسی کی زندگی برباد کروں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں دنیا میں۔ اُس نے طلاق کے بعد بھی کال پر رابطہ رکھا کہ کہیں میں بھٹک نہ جاؤں کیونکہ میں نے ماڈلنگ کی بات کی تھی۔ وہ کال پر بات کرتا ہنستا اور کہتا کہ نئی زندگی اسٹارٹ کرو۔ اس طرح 2012ء گزر گیا۔

2013ء کے اپریل میں میرا ایک رشتہ آیا۔ اکرم نے کہا کہ کرلو وہ PAF میں تھا۔ ہم نے نکاح کا نہ بتایا۔ پھر شادی ہو گئی۔ گھر والوں نے جب دیکھا کہ اب پھر سے شادی ہو گئی ہے تو انہوں نے اس لڑکے کے بہنوئی کو کہا کہ تمہاری بیوی بدچلن ہے۔ اس کی بھی ان دنوں شادی ہوئی تھی۔ اس کے بہنوئی نے میرے شوہر کو بتا دیا اور میرے شوہر نے بھائی کو کہا کہ آپ کیوں میری بہن پر الزام لگا رہے ہو۔ تو میرا بھائی کھل کر سامنے آ گیا۔

میرے شوہر نے خوب ہنگامہ کیا۔ گالیاں دیں مجھے۔ اور میرے گھر والوں کو اور پھر مجھے بھائی کے سامنے لے آیا بھائی نے لوہا گرم دیکھ کر اُس سے میری طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ یوں اس نے میری ایک نہ سنی اور مجھے طلاق دے دی کہ جب تمہارے بھائی تمہارا گھر اجاڑنا چاہتے ہیں تو میں طلاق دوں گا۔"

میں تو پہلے ٹوٹ گئی تھی، سو اب مکمل طور پر ٹوٹ گئی۔ میں اس شادی تک حالات کے ہاتھوں سمجھدار تو ہو گئی تھی۔ لیکن یہاں بھی ان لوگوں نے مجھے توڑ دیا۔ اس شادی پر بھی میرا دل گھبراتا تھا۔ مجھے اکرم نے ہی راضی کیا تھا۔ حوصلہ تھا اس کا۔ اپنا پیار اپنے ہاتھوں سے کسی اور کے ہاتھوں میں دیا۔

میں نے اکرم سے کہا کہ مجھ سے شادی کر لو لیکن اس کے والدین کے دل میں میرے لیے نفرت بھر گئی تھی۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ میں نے اُن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اُس کی پاداش میں جو ہوتا کم تھا۔ اور ویسے بھی اکرم کی منگنی ہو گئی تھی۔ تین نومبر 2013ء کو اکرم کی شادی تھی۔ میں اُس وقت جانے کیسے انتقام میں مکمل طور پر اندھی ہو چکی تھی۔ میں نے بھائی کے دوست سے مشورہ کر کے اس کی آنکھوں کو اندھا کروا دیا کیونکہ مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا۔ اسی لیے میں نے نفرت میں تیزاب سے اس کو نابینا کروا دیا ہمیشہ کے لیے۔

اکرم کو ایک این جی او امریکہ لے گئی اور اس کا علاج کروایا۔ وہ اب ٹھیک ہے اور میں اس کی یاد میں تڑپتی ہوں۔ مجھے کسی پل چین نہیں آتا۔ خدا کے لیے میرے سکون کے لیے دعا کریں۔ مگر میرے جیسی انتقام کی اندھی کی بھلا کہاں بخشش ہو سکتی ہے۔ محبت کو اپنے ہاتھوں پیروں تلے روندنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

☆☆......☆☆

# بیاہی عورت



ارم ناز

معاشرے میں پھیلی جہالت، ہر دوسرے گھر میں یہی کہانی دہراتی ہے



کیسی بے فکری کے دن تھے۔ نہ آٹے کی فکر نہ دال کی گھی سے چپڑی روٹی کھائی، پیالے میں چائے پی اور اسکول چلے گئے۔ اسکول بھی وہی غریبوں والا پیلا اسکول۔ ہاف ٹائم میں لڑکیاں کچوری سموسے کھاتی پھرتیں، ہمیں کسی سہیلی نے کھلا دیا تو ٹھیک ورنہ کوئی غم نہیں۔ اسکول سے آکر بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل اور بغیر کھلونوں کے صرف کھیل...... نہ گڑیا، نہ برتن نہ وڈیو گیمز سال کے سال عید میں بننے والا ایک جوڑا جو جی جان سے پیارا ہوتا تھا۔

محلے کی ہر شادی میں وہی پہنا کبھی یہ سوچا ہی نہیں ایک جوڑا بار بار پہننے پر کوئی کیا کہے گا۔ سال گرہ جیسے چونچلے ہوتے نہیں تھے۔ اماں کو تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ میں کس دن پیدا ہوئی۔ مہینے میں ایک مرتبہ آلو گوشت نصیب ہوتا آلو گوشت بھی لمبا پانی، ایک بوٹی دو آلو۔ ورنہ تو روز ہی پتلی ارہر کی دال اور موٹے چاول کھا کر خوش ہو گئے۔ بچپن گزر گیا جوانی آئی تو شروع ہوئی اماں کی روک ٹوک اری او جنم جلی شیشے کے آگے اتنی دیر مت کھڑی رہا کر اور یہ تو نے سیدھی مانگ کیوں نکالی۔ یہ تو بیاہی عورتیں نکالتی ہیں۔ چل آڑھی مانگ نکال کر دو چٹیاں گوندھ۔ میں تو نہاتی بھی اپنی مرضی

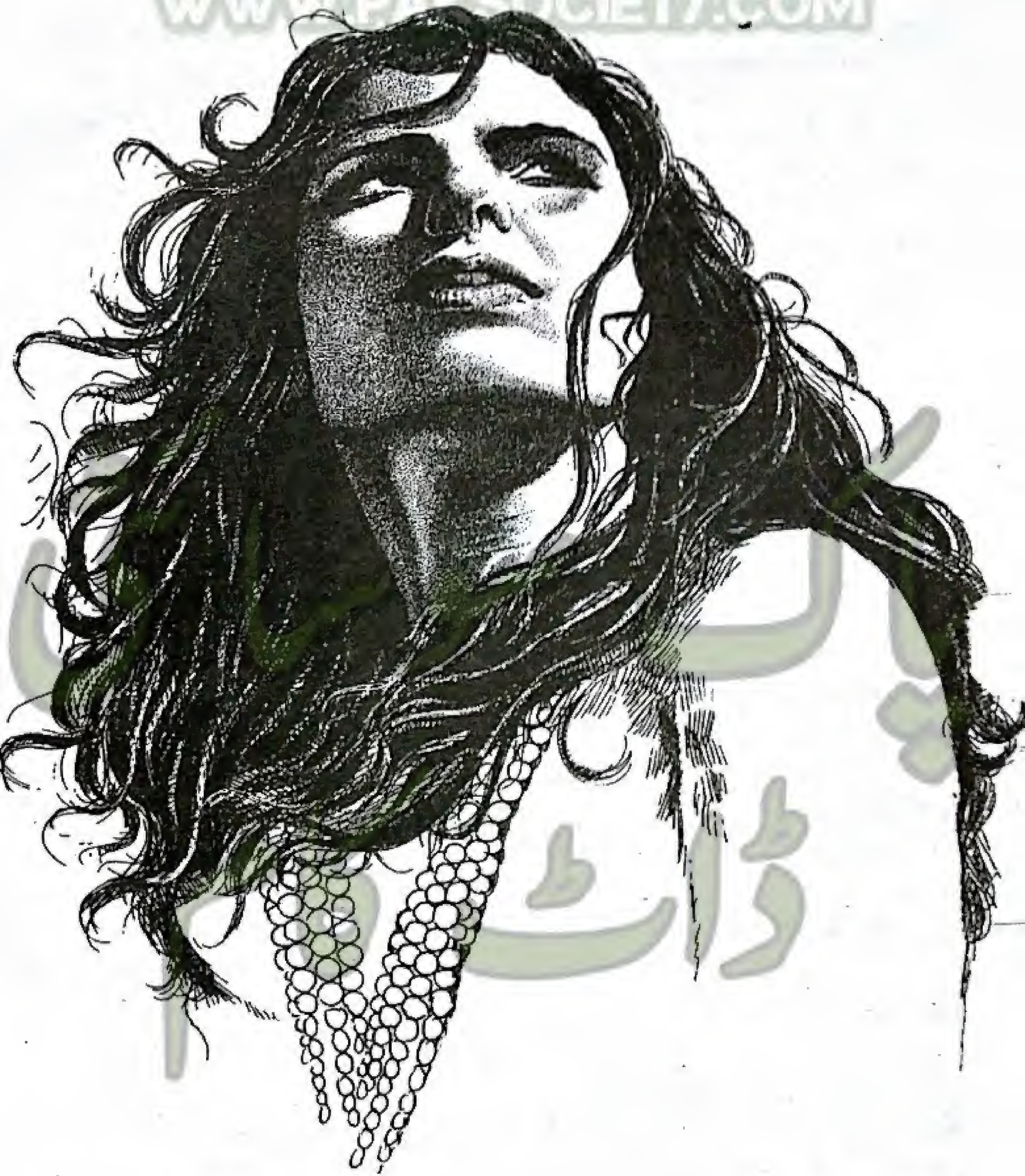
سے نہ تھی۔ اماں کی تلقین تھی کہ مغرب کے وقت سے پہلے ہفتے میں ایک بار نہاؤ اور بال سوکھتے ہی تیل ڈالو لو۔ میرے بالوں میں اماں کو تیل ڈالنے کی اتنی جلدی ہوتی کہ ایک مرتبہ تو اماں نے میرے بالوں میں مشین کا تیل ہی ڈال دیا۔ اگر کبھی ہفتے میں دو بار نہا لوں تو شامت......

کیا بیاہی عورتوں کی طرح روز روز نہاتی ہے۔ سیدھی ہو کر بیٹھ، کمر جھک جائے گی اور یہ سر پر دونوں ہاتھ کیوں باندھ رکھے ہیں۔ یتیم ہو گئی ہے کیا۔ کھانا کھا کر اینٹھ کیوں رہی ہے۔ سارا کھانا کتے کے پیٹ میں چلا جائے گا۔“

اور اس طرح کی کئی باتیں مگر اماں کی بات پر کبھی رونا نہیں آتا تھا۔ اماں نے جو کہا خاموشی سے سن لیا۔

اماں نے کبھی حلوہ پوری نہ کھانے دی۔ اُن کی نظر میں یہ بیاہی عورتوں کی غذا تھی۔ میں سوچتی کتنی اچھی ہوتی ہیں یہ بیاہی عورتیں، شیشہ دیکھتی ہیں، میک اپ کرتی ہیں۔ سیدھی مانگ نکالتی ہیں۔

حلوہ پوری کھاتی ہیں اور تو اور روز نہاتی بھی ہیں۔ کاش میری بھی جلدی سے شادی ہو جائے۔ اماں کی



چخ چخ سے تو جان چھوٹے۔
شادی کے بعد ساڑی باندھوں گی، گجرے پہنوں گی، گھوموں گی پھروں گی۔

اور پھر میں خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی۔
میں چاول دھوتے ہوئے خواب دیکھتی تو نل کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں چاول دھوتی اور کپڑے کھنگالتے ہوئے

خواب دیکھتی تو ہاتھ میں پکڑے کپڑے پر ڈھیروں پانی بہاتی...... پیچھے سے اماں کی آواز خوابوں کا تسلسل توڑ دیتی۔

''جنم جلی قیامت کے روز ایک ایک قطرے کا حساب دینا ہوگا۔'' پھر تو اماں مجھے قیامت سے اتنا ڈراتی مجھے لگتا ابھی دروازہ بجے گا اور قیامت اندر گھس آئے گی۔

آٹھ جماعت پاس، گھرداری کرنے والی لڑکی میں کتنی عقل ہوتی ہے۔ نام تو میرا فاطمہ تھا مگر اب تو مجھے اپنا نام بھی یاد نہ تھا کیونکہ اماں تو مجھے جنم جلی پکارتی تھی۔ میرے بعد بھائی بہنوں کی لمبی قطار تھی۔

ابا کپڑے کی مل میں کام کرتا تھا۔ مل مزدور کے اتنے بچے......

ہمارے طبقے میں وسائل کم اور بچے زیادہ ایک عام بات تھی۔ محلہ بہبود آبادی ابا جیسے لوگوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا بہن بھائیوں کو پالتی آئی تھی۔ میرے گھر یہ ہر سال کی کہانی تھی۔ رات سوتی صبح اٹھتی تو نیا بہن یا بھائی موجود ہوتا۔

''اماں کہتی پری آئی تھی ٹوکری میں تمہارا بھائی رکھ کر دے گئی۔''

''اماں تم پری کو کہتی کیوں نہیں کہ اس گھر میں بہت بچے ہیں۔ اپنی ٹوکری کہیں اور لے جائے'' ہر سال اماں کا چلہ کرواتے کرواتے میں تنگ آ گئی تھی۔ بڑی پی تلی زندگی تھی۔

کراچی میں رہتے ہوئے میں نے کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ کیسی حسرت تھی سمندر دیکھنے کی، گھومنے پھرنے کی اور یہ سب شادی کے بعد ہی ممکن تھا، ورنہ اماں کی نظر میں تو کنواری لڑکی گلاب جامن ہوتی ہے، جسے کوئی بھی نگل سکتا ہے۔

شادی کی فکر اماں کو تو نہ تھی اب مجھے ہی کچھ کرنا تھا کس کے ساتھ معاشقے لڑا کر شادی کروں...... میں آس پاس نظر دوڑانے لگی اور پھر میری نظر برابر والی شہناز خالہ کے کلو بھانجے پر ٹھہر گئی۔

کیسی محبت سے دیکھتا تھا مجھے...... میں نے بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے دیا پھر تو شہناز خالہ کا کلو بھانجا مجھے سلو (سلمان خان) جیسا لگنے لگا۔ جب وہ پیار سے مجھے 'فرو' پکارتا تو کیسا شہد گھل جاتا میرے کانوں میں۔ اس کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دیتی۔

شہناز خالہ کی اور ہماری چھت ساتھ تھی پہلے تو ان کا بھانجا اسلم ان کے گھر آتا جاتا تھا مگر جب سے ہمارا چکر چلا تھا وہ اِدھر ہی دھرا رہتا تھا۔

جب موقع ملتا بندر کی طرح چھت پر چڑھ جاتا۔ اس کا سیاہ رنگ دھوپ میں کیسے لشکارے مارتا۔ وہ میرے درجن بھر بہن بھائیوں کو دکان سے چیز دلاتا اور ان ہی کے ہاتھ میرے لیے کلن پان والے کی دکان سے سونف خوشبو کا پان بھیجتا۔

میں کیسی خوش ہوتی پان کھا کے۔ بار بار آئینے میں زبان باہر نکال کر دیکھتی کہ کیسا لال ہوا ہے منہ۔ کتنی محبت کرتا ہے مجھ سے، جبھی تو پان سے منہ لال ہو گیا ہے۔ اپنی چوڑی دوپٹے کے پلو میں باندھ کر توڑتی، پھر پلو کھول کر دیکھتی۔ جتنے زیادہ ٹکڑے ہوتے محبت اتنی ہی زیادہ ہوتی۔

اس کے نام کی مہندی لگاتی۔ مہندی رچ کر ہاتھوں کو گلال کر دیتی...... کیسے کیسے طریقے تھے محبت کو ناپنے کے، جو مجھ جیسی پاگل لڑکیاں اختیار کرتیں۔ حقیقت سے بے خبر اپنی بنائی خوابوں کی دنیا میں ہنستی مسکراتی۔

''کیسی کی محبت تھی اسلم کی کہ اس نے اپنی اماں کو رشتہ لے کے بھیج دیا تھا۔ اس کی اماں بات ڈال گئی تھیں۔

''اماں نے کہا کہ اپنے آدمی سے پوچھ کر جواب دوں گی۔''

اسلم کی ماں کے جاتے ہی میں اماں کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

''اماں کان کھول کر سن لے۔ شادی کروں گی تو صرف اسلم سے۔ اگر تو نے انکار کیا تو گھر سے بھاگ جاؤں گی۔'' میری اس بے باکی پر اماں آنکھیں اور منہ کھولے حیرت سے مجھے تکتی رہ گئی۔

میرے اندر یہ بے باکی محبت کی وجہ سے نہ تھی یہ تو ماحول سے فرار تھا۔ جسے میں محبت سمجھ رہی تھی۔ پھر راتوں رات اماں نے ابا کو خدا جانے کیا پٹی پڑھائی

کہ ابا نے سادگی سے میرا نکاح اسلم سے پڑھوا کر مجھے رخصت کر دیا۔ جہیز نام کی کوئی چیز مجھے دینے کو گھر میں نہ تھی۔

اماں نے بس وقتِ رخصت میرے کان میں صرف اتنا کہا۔

''اب یہاں کبھی نہ آنا''

☆......☆......☆

میں خوشی خوشی اسلم کے گھر آ گئی۔ صبح ناشتے میں حلوہ پوری کھا کر میں کیسی خوش ہوئی۔ شام میں گلابی ساٹن کا جوڑا پہن کر بجی سنوری اور مسہری پر بیٹھ گئی۔ محلے کی کنواری لڑکیاں کیسی حسرت سے مجھے تک رہی تھیں۔ میں بھی خود کو کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھ رہی تھی۔ کیسے حسین دن تھے جو پلک جھپکتے گزر گئے۔

حقیقت کی دنیا اس دن دکھائی دی جس دن اسلم نے مجھے ایک گندی گالی دی اور خوابوں کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے چائے میں چینی کم ڈالی تھی۔ پھر تو گالیوں کا سلسلہ چل نکلا۔

ایجاد کرنے والوں نے ہر گالی عورت کے نام ایجاد کی۔ مردوں کے نام کتنی کم گالیاں ہیں۔ اور میرا یہ جرم ہے کہ میں عورت ہوں۔ ٹیڑھی پسلی سے پیدا آدم کو جنت سے دربدر کروانے والی۔ اسی بات کا بدلہ اسلم مجھ سے لینے لگا۔

''آہستہ چل کیسی زمین پر ایڑیاں مار کے چلتی ہے۔''

''آٹا گوندھتے میں ہلتی کیوں ہے۔''

''کچھ کہہ دو تو جاہل عورتوں کی طرح رونے بیٹھ جاتی ہے۔ خود کو مظلوم اور مجھے ظالم سمجھتی ہے۔ دفع ہو جا میرے سامنے سے۔ تیری منحوس شکل دیکھ کر نکلو تو کوئی کام صحیح نہیں ہوتا۔ گلے پڑ گئی میرے۔ غرق بھی نہیں ہوتی۔

سالی چڑیل کی طرح چمٹ گئی ہے۔ اماں باوا نے تو میرے پلے باندھ کے جان چھڑا لی۔''

یہ تھی میری روز کی کہانی سوچ سوچ کر جی کڑھتا مگر یہ راستہ تو میں نے خود چنا تھا۔ اب فرار ہو کر کہاں جاتی۔ اکیلی جان تو نا تھی، ساتھ میں تین بچے بھی تھے۔

**وجہ تسمیہ**

پولیس: ''تم نے ایک ہی دکان میں تین دن چوری کیوں کی؟''

چور: ''میں نے صرف ایک دن اپنی بیوی کے لیے سوٹ چوری کیا تھا۔''

''اگلے دو دن تو میں کلر بدلنے گیا تھا۔''

☆☆☆☆

**پاکستان زندہ باد**

ایک انگریز پر بجلی کی تار گر گئی۔ وہ تڑپ تڑپ کر مرنے ہی والا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔

انگریز اُٹھ کر بھاگا اور بولا۔

''پاکستان زندہ باد''

مرسلہ: غزالہ ملک۔ بحرین

جی جان سے اسلم کی خدمت کرتی کہ شاید اس کا دل میری محبت میں پلٹ جائے۔ مگر حالات تو بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے اماں کا گھر یاد آتا۔

کیسے مزے تھے۔ بے فکری کے، پتلی دال اور گھٹلا چاول، اِن فاقوں سے اچھے تھے۔ اماں کی جھڑکیاں اسلم کی گالیوں سے بہتر تھیں۔

شکوہ صرف اماں سے تھا۔ اماں تُو تو تجربہ کار تھی۔ تُو نے تو زمانہ دیکھا تھا۔ میں تو بچی تھی مکر و فریب نہیں جانتی تھی۔ معصوم تھی۔ تُو نے مجھے کیوں نہ روکا۔ جنم جلی کہہ کر دو تھپڑ منہ پر لگاتی، مجھے کیوں بیاہ دیا۔

اماں میں ہنسنا بھول گئی۔ میری آنکھوں کے گوشے ہر وقت نم رہتے ہیں۔

اماں میں ہنسنے والی بات پر بھی رو پڑتی ہوں۔ ہائے میری اماں! میرے ساتھ کیسا ظلم کیا تُو نے۔

جیتے جی جہنم میں بھیج دیا۔ روز جیتی ہوں روز مرتی ہوں پل پل ذلیل ہوتی ہوں۔ بنا قصور گالیاں کھاتی ہوں۔

اماں بیاہی عورتوں کے کیا یہی عیش ہوتے ہیں۔

☆☆......☆☆

بارہویں سچ بیانی

# لہو کے چراغ



محمد اقبال زمان

آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے اُس شیر دل D.S.P کی شہادت

کا المناک واقعہ، جس سے ملک دشمن عناصر کانپ جایا کرتے تھے

گھر سے نکلنے سے اپنی گاڑی تک پہنچنے کا عرصہ تھا۔ بس فائروں کی برسات ہوئی اور...... گھات لگائے دشمنوں کا داؤ چل گیا۔ اور اس دن وہ بہادر سپوت یوں گرا کہ کربلا کی یاد تازہ کر گیا۔ صفِ ماتم بچھ چکی تھی۔ علاقہ سوگ میں ڈوب چکا تھا۔ آخر یہ کون گیا جہان چھوڑ کر کہ آسمان تک رونے لگا۔

9 جون کی صبح جام شہادت نوش کرنے والا یہ قوم کا بہادر بیٹا تھا DSP مجید عباس۔ جس کی دہشت اس کی ایمان داری تھی۔ اور جس کے پاس ایمان داری کا ہتھیار ہو بھلا اس کی مخالف دنیا کیوں نہ ہوگی۔

آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے DSP مجید عباس کراچی پولیس کی شان تھے۔ 9 جون کی صبح 10 بجے اپنے گھر ظفر ٹاؤن، قائد آباد سے اپنے دفتر سائٹ تھانے جانے کے لیے نکلے ہی تھے کہ گلی کے موڑ پر پہلے سے گھات لگائے موٹر سائیکل سوار دہشت گردوں نے ان پر فائرنگ کر دی۔

مجید عباس نے گاڑی بھگانے کی کوشش کی لیکن آگے زیر تعمیر گھر کی بجری پڑی ہونے کی وجہ سے وہ گاڑی بھگا نہ سکے اور دہشت گردوں نے چاروں طرف سے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔



شہید ڈی ایس پی مجید عباس کی زندگی کی ایک یادگار تصویر

جس کے نتیجے میں وہ شدید زخمی ہوئے۔ محلے والوں نے گھر نزدیک ہونے کی وجہ سے فوراً ان کے گھر پر اطلاع دی۔ ان کے صاحب زادے نے فوراً اُن کو ایمبولینس کے ذریعے جناح ہسپتال منتقل کرنے کی کوشش کی تاہم زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ راستے میں ہی شہید ہو گئے۔

☆......☆......☆

D.S.P مجید عباس سندھ پولیس کے ان چند

ایمان دار پولیس افسران میں شمار ہوتے تھے جو رشوت کو اپنے پیر کی جوتی سمجھتے تھے۔ D.S.P مجید عباس سندھ پولیس میں بطور A.S.I تعینات ہوئے اور اپنی محنت لگن اور فرض شناسی کی بنا پر D.S.P کے عہدے تک پہنچے۔

☆......☆......☆

مجید عباس اپنے اچھے حسنِ اخلاق کی وجہ سے



شہید ڈی ایس پی مجید عباس کی نماز جنازہ ادا کی جارہی ہے، دوسری جانب مرحوم کا آخری دیدار

پولیس میں ہی نہیں بلکہ اپنے خاندان اور محلے میں بھی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کے جانے سے ان کے خاندان اور دوستوں کے سر پر سے بھی سایہ چلا گیا۔ مجید عباس کراچی میں دہشت گردی کے شکار جن علاقوں میں کئی جگہ تعینات ہوئے تھے۔ جس میں الفلاح، لانڈھی، شاہراہِ فیصل، اورنگی، ڈیفنس وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ شہید D.S.P مجید عباس کے بھائیوں سے بات چیت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ گذشتہ چھ ماہ سے پریشان تھے۔ اور شہید ہونے سے 15 روز قبل تک انہوں نے اپنی سرگرمیاں بھی محدود کر دی تھیں۔ جناح اسپتال منتقل کر دیا۔ جناح میں یہ

زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جانبر نہ ہو سکے۔

ان کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد ان کی نمازِ جنازہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ادا کی گئی، جہاں سے ان کی میت کراچی میں موجود رہائش گاہ ظفر ٹاؤن پہنچا دی گئی۔ جس وقت مجید عباس کی میت اور وسائرن بجاتی ایمبولینس ان کے گھر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ ہر طرف ایک سوگ کا عالم تھا۔ میں نے جس شخص کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کسی کو کیا پتا تھا کہ جس شخص سے رات کو بات ہو رہی ہے اس شخص سے صبح ملاقات بھی ہو سکے گی کہ نہیں۔

کراچی پولیس کے اعلیٰ افسران نے ان کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لیے الگ الگ کمیٹیاں بنا دی ہیں۔ موقع پر موجود ڈی آئی جی منیر شیخ، اور ایڈیشنل آئی جی کراچی غلام قادر تھیبو کا کہنا تھا کہ ملزمان نے کافی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا اور حملہ کرنے کے بعد گولیوں کے خول بھی اپنے ساتھ لے گئے لیکن جلد ہی ملزمان گرفتار کر لیں گے۔ D.S.P مجید عباس سانحہ بلدیہ ٹاؤن کیس کی تفتیش ٹیم میں شامل تھے۔ ذرائع نے بتایا کہ کراچی میں شدت

> مجید عباس اپنے اچھے حسن اخلاق کی وجہ سے پولیس میں ہی نہیں بلکہ اپنے خاندان اور محلے میں بھی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے جانے سے ان کے خاندان اور دوستوں کے سر پر سے بھی سایہ چلا گیا

پسندوں اور جرائم پیشہ عناصر کے خلاف آپریشن تیز ہوتے ہی گذشتہ چند ہفتوں میں سیکیورٹی اہلکاروں پر حملوں میں اضافہ ہوا۔ رواں برس D.S.P مجید عباس سمیت 45 پولیس افسران اور اہلکاروں کی ٹارگٹ کلنگ کی گئی۔ وزیر اعظم نواز شریف اور وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ نے بھی D.S.P مجید عباس کی ہلاکت کا نوٹس لیتے ہوئے رپورٹ طلب کر لی۔ مگر اب تک کئی دن گزر جانے کے بعد بھی کسی بھی پولیس اہلکار، افسران کے قاتل بھی گرفتار نہ ہو سکے۔ جو کہ کراچی کی سیکیورٹی ایجنسیوں پر ایک سوالیہ نشان ہے۔"

جاتا ہے۔ دہشت گرد جن کا نام سن کر گھبرانے لگتے ہیں۔ اجرتی قاتلوں، ٹارگٹ کلرز کی نیندیں اڑ جاتی تھیں۔

D.S.P مجید عباس وہی نام تھا جسے سن کر جرم کانپ جاتا تھا۔ ملک پاکستان وہ خوش قسمت دھرتی ہے۔ جو دھرتی کی ناموس کے لیے D.S.P مجید عباس جیسے سپوت پیدا کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی صرف نام بدلیں گے لیکن ان عظیم سپوتوں کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ ان بہادروں کے لہو کے نذرانے ہمیشہ پاکستان کی عزت، توقیر اور شان کے چراغ بن کر پوری


ڈی ایس پی مجید عباس کا جسد خاکی ان کے آبائی شہر آزاد کشمیر روانہ کیا جا رہا ہے محمد اقبال زمان بھی نمایاں ہیں

وہ شیر تھا، دلیر تھا، بہادر تھا، غازی تھا۔
سارے لقب اسی کے لیے تھے۔
اور اپنی جان کا نذرانہ دے کر اب ''شہید'' کا لقب بھی وہ حاصل کر گیا۔ مجید عباس کی شیر جیسی زندگی اور دلیرانہ شہادت کو سلام۔

☆......☆......☆

کہنے کو تو بس اک چراغ گل ہوا ہے۔ لیکن ذرا ان درندہ صفت لوگوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ کب تک اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے ملک عزیز ان سپوتوں، ان قوم کے بیٹوں کو صفحہ ہستی سے مٹاتے رہو گے جن کے دم سے بے راہ رو معاشرے میں کچھ تو خوف بیٹھ

دنیا میں اپنی روشنی پھیلاتے رہیں گے۔ پڑھنے والے تمام قارئین سے استدعا ہے کہ D.S.P مجید عباس کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کیجیے۔ کہ ہمارے یہی محبت کے تحفے جانے والوں کے لیے ان کی لازوال قربانی کا خراج تحسین ہیں۔ شاید شاعر سے بھی ان ہی سپوتوں کے لیے یہ شعر تخلیق ہوا ہوگا۔

کرو نہ غم جو ضرورت پڑی تو ہم دیں گے
لہو کا تیل چراغوں میں روشنی کے لیے

جب تک پاکستان کا نام رہے گا قوم اپنے ان بہادر سپوتوں پر ناز کرتی رہے گی۔

☆☆......☆☆

# ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، سنسنی خیز سلسلے کی دسویں کڑی

## خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہم شکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کرلیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رُکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہم شکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے۔ جس کی



خاموشی سے گاڑی میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ گاڑی کا سفر ختم ہوگیا، جس جگہ اسے اتارا گیا، وہ اندازے سے کوئی فوجی چھاؤنی معلوم ہوتی تھی، ایک طرف وسیع وعریض سرخ پتھروں کی عمارت بھی تھی، شاہ زیب کو پیدل وہاں تک لے جایا گیا۔ پیچھے چند فوجی انتہائی مہلک ہتھیار لیے چل رہے تھے، پھر شاہ زیب کو ایک کمرے میں لے جاکر بند کر دیا گیا جس کے دروازے پر موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، شاہ زیب کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر کھردرے فرش پر لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

صبر وسکون سے اس نے وہاں کافی وقت گزار دیا تھا، غالباً اندازے سے کوئی اٹھارہ گھنٹے ہو چکے ہوں گے کہ اس کی طرف توجہ دی گئی۔ ان اٹھارہ گھنٹوں میں شاہ زیب کو کھانا اور چائے البتہ ضرور پیش کی گئی تھی۔ بالآخر چار افراد اس کے پاس آئے۔ چاروں فوجی تھے انہوں نے شاہ زیب کے ہاتھوں میں لوہے کی ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں پشت پر باندھ دیا اور پھر ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا

''تمہیں اپنی زندگی بچانے کے لیے احتیاط کرنا ہوگی، تمہاری ذراسی غلط جنبش تمہیں موت سے ہمکنار کرسکتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں، تم لوگ اطمینان رکھو، میں تم سے مکمل تعاون کروں گا۔'' شاہ زیب نے جواب دیا اور انہوں نے شاہ زیب سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سفر کا اختتام ایک کمرے میں ہوا، تین افراد باہر ہی رہ گئے تھے، صرف ایک آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ کمرے میں قدم رکھ کر اس نے ایڑیاں بجائیں اور پھر گردن خم کر کے واپس پلٹ گیا، جاتے ہوئے اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔ اب جو شاہ زیب نے کمرے کے ماحول پر نگاہ دوڑائی تو ایک لمحے کے لیے اس پر اچھا خاصا رعب طاری ہوگیا۔

وسیع وعریض کمرہ تھا، جس میں نیم دائرہ نما بہت بڑی میز لگی ہوئی تھی جس کے عقبی حصے میں چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے، تمام اعلیٰ فوجی افسر تھے، دائرے کے دوسرے حصے میں صرف ایک کرسی تھی، شاہ زیب کو آگے آنے کا اشارہ کیا گیا۔ ایک آدمی نے اٹھ کر جیب سے چابی نکالی اور اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ اس کے بعد اس نے شاہ زیب کو نہایت احترام سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا، شاہ زیب نے اس سلسلے میں تکلف نہیں کیا۔

فوراً ہی دو سمتوں سے تیز روشنیاں جلیں اور انہوں نے شاہ زیب کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ خاصی تیز روشنیاں تھیں وہ جانتا تھا کہ ایسی روشنیاں پوچھ گچھ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں حالانکہ ان کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاید یہ چہرے کے تاثرات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے ان روشنیوں کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی۔

وہ چند لمحے خاموش رہے پھر روشنیاں بجھ گئیں اور مدھم لائٹیں اس کے گرد احاطہ کرنے لگیں۔ شاہ زیب نے سکون کی گہری سانس لی ان روشنیوں کی وجہ سے اس کی طبیعت میں کچھ بے چینی سی پیدا ہوگئی تھی۔ تب درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

''مسٹر تمہیں ایئر پورٹ کے ممنوعہ علاقے سے گرفتار کیا گیا ہے۔ تمہارے قبضے سے ایک ٹیلی اسکوپک رائفل برآمد ہوئی ہے۔ جس سے اس وقت فائر کیا گیا جب ایئر پورٹ پر ہمارے ایک معزز مہمان لینڈ کرنے والے تھے، ہر چند کہ اس معزز مہمان کو نشانہ نہیں بنایا گیا تھا اور ایک دوسرا شخص نشانہ بنا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تم نے ایئر پورٹ کے احاطے میں ایک شخص کو ہلاک کیا ہے، وجہ بتانا پسند کرو گے، جواب نہ ملے تو تم جانتے ہو کہ بحالت مجبوری ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو بہر طور گھٹیا اور فرسودہ ہے لیکن بدقسمتی سے کارگر ہو جاتا ہے۔''

شاہ زیب ان الفاظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شاہ زیب نے کہا۔

''معزز آفیسرز، میں جو کچھ بھی آپ کو بتاؤں گا ممکن ہے وہ آپ کے لیے ناقابل یقین ہو، لیکن اگر آپ کو میرے جوابات جھوٹے محسوس ہوں تو آپ مجھ سے یہ نہ کہیں کہ اس کے بعد میں سچ بولوں، بلکہ بہتر یہی ہے کہ میرے لیے وہ طریقہ کار منتخب کرلیں جو آپ کے ذہن میں موجود ہو، یعنی آپ کے ہر سوال کا جواب میرے پاس آخری ہوگا، اذیتیں

دیں گے تب بھی وہی جواب ملے گا، یقین کرلیں گے تو وہی حقیقت ہوگی، اس میں کوئی شک نہیں کہ میں رائفل کے ساتھ خفیہ طور پر گٹر لائن کے ذریعے ایئرپورٹ کے احاطے کے اندر پہنچا لیکن میرا مقصد قتل کا ہرگز تھا ہی نہیں۔''

''لیکن ایئرپورٹ ایریا میں داخل ہونے کے بعد اس شخص کو نشانہ بنانے کا کیا جواز ہے؟'' اس نے شاہ زیب سے سوال کیا۔

''نشانہ وہ شخص نہیں تھا، بلکہ نشانہ آپ کا معزز مہمان ہی تھا، لیکن یہ صرف میں ہوں جس نے اس معزز مہمان کو قتل نہ کرنے کا فیصلہ کرکے اس شخص کو قتل کردیا جس نے مجھے اس قتل کے لیے آمادہ کیا تھا۔''

شاہ زیب کی اس بات پر چاروں چونک پڑے تھے، ان کی تیز نگاہیں شاہ زیب کے چہرے کا طواف کررہی تھیں، پھر اسی شخص نے کہا''اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ پہلے تم سے تمہارا نام پوچھا جائے۔''

''انہوں نے مجھے ایک فرضی نام دیا تھا کہ میں اپنی شناخت رانا پرتھوی راج کی حیثیت سے کراؤں جبکہ میرا اصل نام شاہ زیب ہے، یہ حقیقت ہے کہ میں ایک آوارہ گرد ہوں، جب میں یہاں پہنچا تو کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا، وہ چاہتے تھے کہ میں ایئرپورٹ کے علاقے میں داخل ہوکر آپ کے اس معزز مہمان کو قتل کردوں ورنہ مجھے سرلا نامی لڑکی اور بعض دوسرے افراد کے قتل کے الزام میں پولیس کے حوالے کردیا جائے گا، میں جانتا تھا کہ وہ لوگ ایسا کرسکتے ہیں اور چونکہ پولیس ان لوگوں سے تعاون کررہی ہے اس لیے میری آواز بے اثر ہوجائے گی چنانچہ میں نے آمادگی کا اظہار کردیا، یہاں تک پہنچنے کے راستے انہوں نے دریافت کیے تھے، رائفل انہوں نے ہی دی تھی اور گٹر لائن کے ذریعے وہاں تک پہنچنے کے نقشے بھی انہوں نے فراہم کیے تھے، لیکن میں اپنے ذہن میں کچھ اور ہی منصوبہ بنا چکا تھا، مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم تھا جو ایئرپورٹ کے سامنے اس عمارت پر اس تمام حادثے کی فلم اتارنے والا تھا اور شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ مسٹر گرینڈی ہی کم از کم اس پروگرام کا سربراہ تھا۔''

''مسٹر گرینڈی۔'' ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں جو شخص میری رائفل کا نشانہ بنا ہے اسے آپ مسٹر گرینڈی کے نام سے پکار سکتے ہیں، وہ شخص اسی نام سے مشہور تھا۔''

''اوہ....اور یہ تمام باتیں تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' شاہ زیب نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے کی چنگی پر وہ لوگ سوچ میں ڈوب گئے، پھر وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کے انداز میں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ بالآخر وہی شخص شاہ زیب سے مخاطب ہوا جو شروع ہی سے اس سے باتیں کررہا تھا

''آپ کا تعلق کہاں سے ہے مسٹر شاہ زیب؟''

''میں برطانوی شہری ہوں، سیاحت کے لیے نکلا تھا لیکن سازشوں کا شکار ہوگیا، میرا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات بھی غائب کردیے گئے میری پوزیشن حد درجے مشکوک بنادی گئی اور مجھے رانا پرتھوی راج کا نام دے دیا گیا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر شاہ زیب! جب تک آپ کے ان الفاظ کی تصدیق نہ ہوجائے آپ کی حیثیت ہمارے یہاں قیدی کی سی رہے گی، لیکن ایک معزز قیدی کی حیثیت جسے آپ باآسانی محسوس کرلیں گے۔''

ملٹری آفیسر کا لہجہ نرم تھا، شاہ زیب نے دل میں نعرہ لگایا کہ وہ مارا۔ اس کے بعد وہ لوگ اٹھ گئے اور شاہ زیب کو واپس اس کی کوٹھڑی پہنچادیا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس آفیسر کے اس قول کی تصدیق ہوگئی کیونکہ اس کوٹھڑی میں ایک بہت ہی نفیس بستر اور ضروریات زندگی کی چند چیزوں کا فوری اضافہ کردیا گیا تھا، شاہ زیب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ تھوڑی سی ذہانت سے حالات پر قابو پانے کی کوشش کارگر رہی ہے، لیکن بہرطور ابھی اسے آخری قدم قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

☆......☆......☆

کھانا آیا تو شاہ زیب اس پر ٹوٹ پڑا۔ پیٹ میں کھانا پہنچا تو طبیعت پر سہولت طاری ہو گئی اور شاہ زیب اس آرام دہ نفیس بستر پر لیٹ گیا جو بہت دنوں کے بعد نصیب ہوا تھا، لیکن بستر پر لیٹنے کے بعد گزرے ہوئے واقعات اس کے ذہن پر چسپاں ہو گئے اور وہ ان واقعات کی گہرائیوں میں کھو گیا۔

کس طرح وہ مسٹر گرینڈی کے چکر میں پھنسنے جا رہا تھا اس کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ مسٹر گرینڈی اس عمارت کی چھت پر سے اس کارنامے کی فلم بنا رہے ہیں، وہ اپنے کیمرے سمیت نیچے آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی جولیانا یاد آئی اور وہ بہت سے لمحات، ارے باپ رے، ایک بار پھر اس کے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ مسٹر گرینڈی کے قتل کے بعد تو وہ تمام لوگ اس کے بدترین دشمن بن گئے ہوں گے، اب اگر وہ ان کے قبضے میں چلا گیا تو اس کا کیا ہو گا۔ انہی تمام سوچوں کے ساتھ تھوڑی دیر کے بعد وہ اتنا غافل ہو چکا تھا۔

پھر نجانے کتنا وقت گزر گیا اور شاہ زیب اپنے اس قید خانے میں آنے والے واقعات کا انتظار کرتا رہا۔ پھر وہ وقت آ ہی گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ ایک بار پھر قید خانے سے نکال کر اسے اسی ہال میں پہنچا دیا گیا۔ وہی لوگ بیٹھے ہوئے تھے جنہیں وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ البتہ ایک کرسی کا اضافہ تھا جس پر بیٹھی ہوئی شخصیت کو شاہ زیب ایک ہی نگاہ میں پہچان گیا۔ یہ وہی معزز مہمان تھے جو شاہ زیب کا نشانہ بننے والے تھے، لیکن بس شاہ زیب کا ذہن پلٹ گیا تھا اور اس نے شدید طیش کے عالم میں مسٹر گرینڈی پر فائر جھونک دیا تھا۔ مسٹر گرینڈی تو اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے لیکن وہ معزز مہمان زندہ تھا۔

''مسٹر شاہ زیب۔'' ایک فوجی افسر نے کہا، لیکن وہ مہمان شاہ زیب کو دیکھ کر بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت کے شدید آثار تھے۔ وہ شاہ زیب کے نزدیک آ گئے اور انہوں نے شاہ زیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ... تم... تم... مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا میرے دوست...''

''ہیلو۔'' شاہ زیب نے مسکراتی نگاہوں سے اس دیکھا۔

''آہ میرے دوست آہ... یہ تم ہی ہو، یہ تم ہی ہو نا مسٹر آئزن...'' مہمان کے لہجے سے بے اختیاری ٹپک رہی تھی۔

''اوہ آفیسر۔ آپ نہیں جان سکتے یقیناً یہ شخص میرے لیے جان کی بازی لگا سکتا ہے۔''

''مسٹر شیمر وک، کیا آپ پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ کے شناسا ہیں؟'' ایک فوجی آفیسر نے جواباً دریافت کیا۔

''آپ وثوق کی بات کرتے ہیں یہ وہ واحد شخص ہے جو بچپن سے میرا دوست ہے، لیکن کافی عرصہ پہلے... اوہ میں کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا ڈیئر آئزن... میں سمجھ رہا تھا کہ تم اپنی مہم پر نکل گئے ہو، لیکن مجھے حیرت تھی۔''

''حیرت کی بات ہی ہے، ظاہر ہے تمہیں بتائے بغیر میں اپنی مہم پر کیسے نکل سکتا تھا ڈیئر شیمر وک''

''ویری گڈ... تمہارا مل جانا، مگر تم غائب کہاں ہو گئے تھے اور میرا خیال ہے ہمیں اس جگہ یہ باتیں نہیں کرنی چاہیے ہیں۔''

فوجی افسر بیچارے اپنی کھوپڑیاں سہلا رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں، یقیناً شاہ زیب کے بارے میں انہیں معلوم ہوا ہو گا کہ شاہ زیب نامی کوئی شخص برطانوی شہریت نہیں رکھتا اور نہ ہی برطانیہ سے آیا ہے۔ مسٹر شیمر وک نے فوجی افسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈیئر آفیسر! آپ یہ سمجھ لیں کہ میں اس شخص کی ہر طرح سے ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں اور پھر یہ تو میرا محسن ہے، بقول آپ کے اس نے میری جان بچائی ہے، کیا آپ لوگ اس بات کا یقین کریں گے کہ میری جان بچانے کے لیے اگر اسے اپنی جان کی بازی بھی لگانا پڑتی تو یہ اس سے دریغ نہ کرتا، ان لوگوں کی یہ بدقسمتی تھی کہ انہوں نے میرے قتل کے

لیے میرے ہی دوست کا سہارا لیا، ویسے جس شخص مسٹر گرینڈی جو قتل کیا گیا ہے میں اسے جانتا ہوں کہ وہ میرے قتل کے لیے کیوں آمادہ ہوئے، خیر میں اس سلسلے میں آپ کے اعلیٰ افسران سے بھی بات کرلوں گا۔"

فوجی افسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک افسر اٹھ کر باہر نکل گیا، مسٹر شیمروک شاہ زیب سے بات چیت کرنے لگے۔

"ڈیئر آئزن! تم اس دوران کہاں کہاں رہے؟"

"ظاہر ہے میرا یہ سفر اتنا مختصر نہیں ہے کہ میں چند الفاظ میں تمہیں اپنے بارے میں بتادوں لیکن میری کہانی اتنی دلدوز ہے کہ سنو گے تو تمہاری آنکھوں سے آنسو نکل آئیں گے۔"

"تم بچپن ہی سے مصیبتوں کا شکار رہے ہو میرے دوست، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مصیبتیں تمہاری اپنی مول لی ہوئی ہیں۔"

"ہرگز نہیں، میں کوئی چیز مول نہیں خریدتا، لیکن اب جو کچھ بھی ہو، اسے تم میری تقدیر کی خرابی کہہ سکتے ہو۔"

"آؤ یہاں سے چلیں... آفیسر... کیا آپ انہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دیں گے؟"

"آپ مکمل طور پر ذمہ داریاں لے چکے ہیں، چنانچہ ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟" فوجی آفیسر نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ آفیسر بھی آ گیا جو باہر چلا گیا تھا اور اس کے بعد مسٹر شیمروک شاہ زیب کو ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ باہر ایک اعلیٰ درجے کی کار کھڑی تھی جو بلٹ پروف تھی اور بند تھی۔ ان دونوں کو اس میں بٹھایا گیا اور فوجی نگرانی میں سرکاری مہمان خانے میں پہنچ گئے جہاں مسٹر شیمروک رہائش پذیر تھے غالباً شیمروک اور آئزن کے درمیان بہت ہی بے تکلفی کا رشتہ تھا۔ انہوں نے بہت محبت بھرے انداز کہا۔

"تم نے مجھے چھوڑ دیا آئزن، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میرے دوست۔"

"کہانی بہت طویل ہے شیمروک، بس تم یوں سمجھ لو کہ یہ سب کچھ میں نے خود نہیں کیا تھا بلکہ کچھ پراسرار قوتوں نے مجھے اغواء کرلیا تھا۔"

"اغواء..." ان کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش نظر آئے "ارے... کون لوگ تھے وہ؟"

"خدا ہی جانے... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا ہوں، کون کونسی مصیبتیں اٹھائی ہیں میں نے اور اس کے بعد یہاں پہنچا تھا کہ یہاں وہ کمبخت پرنسز، مسٹر گرینڈی اور جولیا نامل گئے اور انہوں نے مجھے تمہارے قتل پر مامور کردیا۔ جب میرے علم میں یہ بات آئی کہ تم ہو وہ شخصیت جسے مجھے قتل کرنا ہے تو میں نے دل میں سوچ لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا اور اس کے بعد میں نے کم از کم اس شخص کو تو قتل کر ہی دیا جو اس بلڈنگ کی چھت پر چڑھا فلم بنا رہا تھا، غالباً وہ اس فلم کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا، لیکن میں نے اسے اس کے کیمرے سمیت جہنم رسید کردیا۔"

مسٹر شیمروک اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے آگے بڑھ کر شاہ زیب کو گلے سے لگالیا "اگر تمہاری جگہ کوئی اور قاتل ہوتا تو کیا وہ مجھے چھوڑ دیتا۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ان لوگوں نے جس طرح مجھ سے معاہدہ کیا تھا اس کے تحت لاکھوں ڈالر مجھے ملنے والے تھے۔ بھلا کسی اور شخص کو ان لاکھوں ڈالرز کی پیشکش کی جاتی تو وہ بھلا باز رہتا اس سے؟"

"اور تم نے میرے لیے یہ سب کچھ ٹھکرا دیا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو میرے دوست، تمہارے لیے تو میں یہ دنیا ٹھکرا سکتا ہوں تم دولت کی بات کررہے ہو اور پھر میرا دوست میرے ہاتھوں قتل ہو کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہے، جتنی دوستی میرے اور تمہارے درمیان ہے اتنی دوستی کے بعد بھلا کوئی دوست دوسرے دوست کو قتل کرسکتا ہے۔"

شاہ زیب کی بات سن کر مسٹر شیمروک اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے شاہ زیب کو گلے سے لگا لیا۔ لیکن شاہ زیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہڈیاں کسی نے ایک جگہ سمیٹ دی ہوں۔ چنانچہ اس نے فوراً دل میں فیصلہ کیا کہ آئندہ کوئی ایسی بات نہ کہے جس سے وہ جذباتی ہو جائیں ورنہ اپنی ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کا خطرہ کون مول لیتا۔ ہوسکتا ہے ایک دو پسلیاں ہی ٹوٹ جائیں، ان کے سوالات کے جوابات شاہ زیب نے انتہائی ذہانت سے دیئے تھے بہت سے ایسے نام اس کے سامنے لیے گئے جن کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ، لیکن شاہ زیب نے ان سے اس طرح واقفیت کا اظہار کیا جیسے وہ ان کے پورے شجرۂ نسب سے واقف ہے۔ مقصد یہی تھا کہ شاہ زیب کسی طرح سے یہاں سے نکل جائے اور اپنی زندگی بچائے، بعد میں مسٹر شیمروک کو تمام صورتحال بتا دے گا اور اس کے بعد ان سے مدد طلب کرے گا کہ وہ شاہ زیب کو بھی زندگی گزارنے کے لیے صحیح موقع عنایت کریں کیونکہ شاہ زیب نے ان کی زندگی بچائی ہے۔

اب مقامی حکام اور سیکورٹی ان کے سلسلے میں کافی مستعد تھی چنانچہ انہیں نہایت خفیہ طریقے سے یہاں سے روانہ کیا گیا بعد میں پتا چلا کہ جس طیارے سے مسٹر شیمروک کی روانگی کا اعلان کیا گیا تھا اس کی پرواز ہی روک دی گئی اور یہ لوگ ایک دن پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو گئے تھے، یہ صرف حفاظتی اقدام کے طور پر کیا گیا تھا۔ اس طیارے تک کو فضا میں بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لیا گیا تھا جس سے مسٹر شیمروک کی روانگی کا اعلان کیا گیا تھا۔

طیارے نے ہندوستان کی سرزمین چھوڑ دی اور شاہ زیب ایک بار پھر کسی نامعلوم منزل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ شاہ زیب اب تک یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا کہ خود ان کا تعلق کون سے ملک سے ہے لیکن فی الوقت یہ مرحلہ آیا بھی نہیں تھا۔



بالآخر یہ طویل سفر ختم ہوا اور طیارہ کسی سرزمین پر اتر گیا۔ شاہ زیب کو ابھی تک یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کونسی سرزمین ہے، لیکن شیمروک کو دیکھتے ہوئے یہی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی افریقی ریاست سے ہوگا۔ جس رن وے پر ان لوگوں کو اتارا گیا وہاں چاروں طرف سناٹا تھا اطراف میں بھوری پہاڑیاں تھیں۔ شام کا جھٹپٹا فضا پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ رن وے کے آخری سروں پر مسلح فوجی ہتھیار سنبھالے کھڑے ہوئے تھے، شیمروک کو خوش آمدید کہنے کے لیے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ جو یقیناً ان کے اہل خانہ معلوم ہوتے تھے، ان میں بعض شکلیں بے حد پرکشش تھیں، مثلاً وہ نوجوان اور خوبصورت لڑکی جس کا تعلق تو سیاہ نسل ہی سے تھا لیکن رنگ گندمی اور نقوش اتنے حسین تھے کہ ایک نگاہ دیکھنے کے بعد دوسری نگاہ کی حسرت ہی رہ جائے، بلکہ نگاہیں اس پر سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیں۔

ان سب نے آگے بڑھ کر مسٹر شیمروک کا استقبال کیا۔ وہ لڑکی تو ان سے لپٹ ہی گئی۔ شیمروک کے ساتھ باقی لوگ بھی رن وے پر کھڑی گاڑیوں میں جا بیٹھے، شاہ زیب شیمروک کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اگلی سیٹ پر وہ لڑکی تھی جبکہ باقی افراد دوسری گاڑی میں جا بیٹھے تھے۔ پھر کئی سنسان راہوں سے گزار کر ان کی گاڑی کو ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ شاہ زیب ظاہر ہے مسٹر شیمروک کا مہمان تھا چنانچہ شاہ زیب کی بھی پذیرائی ہو رہی تھی۔ ابھی تک البتہ ان لوگوں سے تعارف نہیں ہوا تھا۔

شیمروک بھی دوران سفر شاہ زیب سے اس طرح لاتعلق ہو گیا تھا جیسے وہ شاہ زیب کے وجود ہی کو نظر انداز کر بیٹھا ہو۔ گاڑی سے اتر کر مسٹر شیمروک شاہ زیب سے مخاطب ہوئے بغیر اس لڑکی اور ایک معمر خاتون کے ساتھ آگے بڑھ گئے جس کے نقوش میں لڑکی کے نقوش کی جھلک پائی جاتی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اب یہ جھلک کافی مدہم پڑ گئی تھی۔ ایک دراز قامت شخص نے شاہ زیب کو مخاطب کر کے کہا۔

''آیئے جناب! آپ کے لیے مہمان خانے میں بندوبست کر دیا گیا ہے، ویسے براہ کرم آپ اپنا تعارف کرا دیجیے۔''

''کیا تم مجھے نہیں جانتے؟''

''معافی چاہتا ہوں بہر طور تشریف لائیے۔'' اس نے معذرت کی اور شاہ زیب کو عمارت کے مہمان خانے میں لے گیا۔ ایک شخص کو اس کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ مقامی آدمی تھا، نام ایرک تھا۔ پتا نہیں نسلاً کیا تھا، لیکن روبوٹ معلوم ہوتا تھا کمبخت، مشینی انداز میں بولتا تھا، ضرورت پوچھتا اور خاموشی سے باہر نکل جاتا، بہر حال شاہ زیب کے سامنے تو ایک ہی سوال تھا کہ کس طرح بحیثیت آئزن ہاور کب تک وہ اپنے آپ کو برقرار رکھ سکے گا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح ایرک نے ناشتا شاہ زیب کے کمرے ہی میں سرو کر دیا تھا، ابھی تک کسی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ یہ بات ذرا دل کو کھٹکتی تھی کہ مسٹر شیر وک جہاز میں قدم رکھتے ہی شاہ زیب سے بیگانے ہو گئے تھے، جس انداز میں انہوں نے جذباتیت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے تو یہی لگتا تھا کہ ان کا شاہ زیب سے عشق انتہائی گہرا ہے، لیکن اچانک ہی یہ عشق ہوا ہو گیا تھا۔ پتا نہیں انہیں شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی یا پھر ان کی مصروفیات نے انہیں جکڑ لیا تھا، دن آہستہ آہستہ بیت رہا تھا، شاہ زیب نے ایرک سے پوچھنے کی کوشش کی کہ یہ کون سی جگہ ہے، لیکن ایرک احمقوں کی طرح شاہ زیب کی صورت دیکھتا رہا۔ شاید مقامی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتا تھا، شاہ زیب خاموش ہو گیا۔

دوپہر ہو گئی، کھانا شاہ زیب کے کمرے ہی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ شاہ زیب صرف یہ سوچ کر اب تک کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ جب تک میزبان اس سے ملاقات کر کے اس کی اجازت نہ دے اپنے طور پر بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے، لیکن مسلسل بے اعتنائی الجھن کا باعث بن رہی تھی، تقریباً تین بجے شاہ زیب اپنے کمرے سے باہر نکلا تو ایرک جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے، کیا تو میرا پہرے دار ہے؟'' شاہ زیب نے تیکھے انداز میں کہا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا، پتا نہیں کیا سمجھا تھا وہ۔

شاہ زیب وہاں سے آگے بڑھ گیا، زیادہ فاصلہ نہیں طے کرنا پڑا تھا، سامنے ہی ایک خوبصورت لان نظر آ رہا تھا جہاں وہ لڑکی بھی موجود تھی جسے دیکھ کر شاہ زیب نے یہ سوچا تھا کہ رنگ سانولا ضرور ہے لیکن نقوش قیامت کے ہیں۔ لڑکی نے بھی شاہ زیب کو دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ آئی۔

''ہیلو...'' لڑکی نے شاہ زیب کو مخاطب کیا۔

''ہیلو'' شاہ زیب نے بھی جواب دیا۔

''سوری مسٹر! آپ سے تفصیلی ملاقات ہو ہی نہیں سکی۔''

''اگر کوئی مجھ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا بھی ہو سکتی تھی، مسٹر شیر وک تو مجھے یہاں لا کر بھول ہی گئے اور مجھ سے ایک بار بھی ملاقات نہیں کی، میرا خیال ہے ان حالات میں مجھے یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔''

''اوہ.. نہیں نہیں.. اب ایسا بھی نہیں ہے، دراصل آپ سے مکمل تعارف نہیں ہو سکا اور میں اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ ڈیڈی آپ سے تعارف کرا دیں تو آپ کے ساتھ بے تکلفی کے لمحات شروع ہوں، لیکن شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ یہاں آتے ہی ڈیڈی کو تھوڑی دیر کے بعد محکمہ خارجہ میں طلب کر لیا گیا ہے اور وہاں وہ اب تک مصروف ہیں، سوری مسٹر، کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔''

''آئزن ہاور۔'' شاہ زیب نے جواب دیا۔

''اگر میں آپ کو صرف ہاور کہہ کر مخاطب کروں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے۔''

''یہاں کم از کم اس ملک میں برا ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ویسے کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی، معاف کیجیے گا آپ کا نام بھی تو مجھے ابھی تک نہیں معلوم ہو سکا۔''

''لیزا شیمر وک۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے پاپا مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں۔''

''آپ چاہے جانے کی چیز ہیں۔'' شاہ زیب نے کہا اور پھر دانتوں تلے زبان دبالی، لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''شکریہ۔''

''ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ آپ سے میڈم لیزا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟''

''کیا مطلب، آپ اس جگہ کے بارے میں نہیں جانتے؟''

''نہیں...''

''کیوں؟'' اس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

''کاش آپ کے ڈیڈی مجھے یہ بات بتا دیتے۔''

''یہ سان بوتو ہے؟'' لیزا نے جواب دیا، شاہ زیب زیرلب یہ نام دہرانے لگا۔ کوئی غیر معروف سی جگہ تھی، لیکن یہ اندازہ ہوتا تھا کہ افریقہ ہی کا کوئی حصہ ہے'' ویسے مسٹر آئزن آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟''

''آہ اس سلسلے میں مسٹر شیمر وک نے مجھے منع کر دیا ہے ان کی خواہش ہے کہ میں اپنے بارے میں کسی کو بھی نہ بتاؤں۔''

''اوہ یہ اچھی بات ہے کہ وعدے کی پابندی کی جائے، لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ پاپا دنیا کی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتے۔''

''یقیناً۔ آپ سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔'' شاہ زیب پھر بے اختیار بول اٹھا اور وہ ہنسنے لگی۔

''آپ دلچسپ آدمی ہیں۔''

''اس کا بے حد شکریہ۔'' شاہ زیب نے نیازمندی سے سرخم کر کے کہا، پھر لیزا شاہ زیب سے اپنے پاپا کے بارے میں بات کرنے لگی، لیکن یہ ساری باتیں گھریلو انداز کی تھیں، وہ ایک ایسی بیٹی تھی جو اپنے باپ کو بہت زیادہ چاہتی تھی، خیر اس کی چاہتوں کا جو سلسلہ بھی ہو لیکن وہ واقعی سر سے پاؤں تک چاہے جانے کے قابل نظر آئی اور شاہ زیب اسے جی بھر کے دیکھتا رہا۔

وہ بے تکان بولتی رہی اور شاہ زیب جواب دیتا رہا، کئی دفعہ اسے رکنا پڑا اور شاہ زیب کو بھی، کیونکہ اس طرح بات شاہ زیب تک آجاتی تھی۔ لیزا اب خود اس بات سے گریز کر رہی تھی کہ شاہ زیب کے بارے میں زیادہ کھوج کرے۔ دو تین گھنٹے پر لگا کر اڑ گئے۔ اس نے وقت دیکھ کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ پاپا کے آنے میں دیر نہیں ہوگی، اب مجھے ذرا کچھ مصروفیت ہے تاہم جب تک تم یہاں ہو تمہارے ساتھ وقت گزارنے میں لطف آئے گا۔''

''تھینک یو۔'' شاہ زیب نے گردن خم کر کے جواب دیا اور وہ چلی گئی۔ شاہ زیب احمقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اس سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ کم از کم مسٹر شیمر وک نے شاہ زیب پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی، لیکن اب وہ تھوڑی سی اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

شام کے کھانے پر لیزا نے شاہ زیب کو بھی طلب کر لیا۔ مسٹر شیمر وک بھی کھانے کی میز پر موجود تھے۔ شاہ زیب کو دیکھ کر انہوں نے کوئی تاثر نہیں دیا، خاموشی سے کھانا کھایا گیا اس کے بعد مسٹر شیمر وک نے شاہ زیب سے کہا۔

''مسٹر آئزن، آپ میرے کمرے میں آیئے، لیزا تم بھی۔'' یہ کہہ کر مسٹر شیمر وک اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے، لیزا اور شاہ زیب بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے آئے تھے۔ کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے لیزا کو دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا اور پھر شاہ زیب سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں تو مسٹر آئزن، میرا دورۂ ہندوستان میری مرضی کے مطابق نہیں تھا اور یہ دیکھیے اتفاق یہ ہوا کہ وہاں بھی میرے دشمن مل گئے، جب آپ سے میرا سامنا ہوا تو مجھے اپنے ایک دوست آئزن ہاور کی یاد آ گئی، میں نے وہاں آپ کی پوزیشن مشکوک دیکھی اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ لوگ آپ کو نہیں چھوڑیں گے، پھر میں نے آپ کی کہانی سنی جس میں آپ نے کہا تھا کہ کس طرح آپ نے اس گروہ کے لیڈر کو ہی قتل کر دیا جس نے مجھے قتل کرنے کے لیے آپ کو منتخب کیا تھا۔ بس میں نے اپنی پوزیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں جھوٹ بولا اور آپ نے بھی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے جھوٹ کو بخوبی نبھایا، اب آپ میرے گھر میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ جب تک دل چاہے یہاں گزاریں، اگر جانا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، بس لیزا یہ ہے ان کہ کہانی، اور ان کا اصل نام شاہ زیب ہے.. کیوں مسٹر...''

شاہ زیب ان کے الفاظ پر بری طرح چونکا تھا اور اب وہ اپنی کیفیت کافی بہتر محسوس کر رہا تھا، اس کا مطلب ہے کہ مسٹر شیمر وک نے شاہ زیب کو اس مشکوک پوزیشن سے نکالنے کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔ بہرحال شاہ زیب نے کہا۔

''مسٹر شیمر وک، آپ نے واقعی مجھے ایک نئی زندگی دی ہے اور اس کے لیے میں آپ کا بے حد احسان مند رہوں گا، لیکن اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی ہوٹل میں میرے لیے بندوبست کر دیں، میں ویسے بھی آوارہ گرد ہوں گھومنے پھرنے کا شوقین، اب اس جگہ کو بھی میں آزادانہ طور پر دیکھنا چاہتا ہوں، اس لیے مجھے اجازت دیجیے۔''

''ٹھیک ہے مسٹر شاہ زیب! لیزا انہیں اپنے ہوٹل میں ٹھہرا دیا جائے، مسٹر شاہ زیب یہاں میرا اپنا ہوٹل بھی ہے، ظاہر ہے آپ کے لیے وہاں کے اخراجات کوئی نہیں ہیں، گھومنے پھرنے کے لیے بھی ایک گاڑی مخصوص کر دی جائے گی، لیزا آپ کو ہوٹل تک پہنچا دے گی او کے اب اجازت...'' مسٹر شیمر وک نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور شاہ زیب اور لیزا بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گئے تھے۔ پھر لیزا شاہ زیب کو ایک گاڑی میں لے کر چل پڑی۔

راستے میں وہ شاہ زیب سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ہوٹل پہنچ کر لیزا منیجر کے پاس پہنچ گئی، وہ ایک مقامی نوجوان تھا انتہائی چوڑے شانوں والا چہرہ مقامی لوگوں کی طرح بدنما تھا لیکن آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں، لیزا اس سے باتیں کرتی رہی، اس نے گردن خم کی پھر ایک شخص کو بلایا اور اسے کچھ ہدایات دیں، اس شخص نے کاؤنٹر سے ایک چابی حاصل کی اور اس کے بعد ان دونوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ لفٹ نے ان دونوں کو پانچویں منزل پر اتار دیا۔ پانچویں منزل کا ایک کمرے شاہ زیب کے لیے منتخب کر دیا گیا تھا چنانچہ شاہ زیب اس میں مقیم ہو گیا۔ کمرہ کافی کشادہ اور بہت خوبصورت تھا، لیزا نے عقبی کھڑکی کھولی اور گہری سانسیں لینے لگی، تب اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کمرہ آپ کو پسند آئے گا، لیکن براہ کرم یہاں سے جانے کی کوشش نہ کیجیے گا، میرا آپ سے رابطہ رہے گا۔''

''بہت بہت شکریہ مس لیزا۔''

لیزا نے عجیب سی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور آگے بڑھی، شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ کر اسے بوسہ دیا اور تیزی سے باہر کی طرف مڑتی ہوئی بولی ''اس امانت کو اپنے پاس محفوظ رکھیے گا مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو کسی لیزا شیمر وک کی یاد دلاتی رہے گی اور آپ اسے چھوڑ کر بھاگنا پسند نہیں کریں گے۔''

بڑا خوبصورت انداز تھا کسی کو رجھانے کا، شاہ زیب اپنے ہاتھ پر اس کے ہونٹوں کے سرخ نشانات دیکھتا رہا جو لپ اسٹک سے بن گئے تھے، پھر اس نے شانے ہلائے اور پھر واپس آ کر کمرے کے وسط میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ گزرے ہوئے واقعات بے حد دلچسپ تھے، اس بار واسطہ انتہائی جرائم پیشہ لوگوں سے پڑ گیا تھا جو بے حد خطرناک تھے اور اس کے بعد وہ اتفاقیہ طور پر ہی یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اور اب یہ ہوٹل۔ بہرحال کمرے کے آرام دہ بستر پر دراز

ہو گیا اور پھر کسی نہ کسی طرح نیند آ ہی گئی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرا دن بھی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا، ذہن پر ایک بوجھ سا تھا جو ہمیشہ ہی طاری رہتا اور شاہ زیب اپنی ذات اور اپنے مستقبل کے وسوسوں میں گھرا رہتا تھا، فی الوقت یہی فیصلہ کیا تھا کہ لیزا شیمر وک جب تک سیاس گزاری کر رہی ہے کرنے دی جائے، جب وہ اکتا جائے تو پھر آگے کے بارے میں سوچنا مناسب ہے، شاہ زیب لیزا کا انتظار کرتا رہا، دوپہر تک وہ نہ آئی تو وہ خود ہوٹل سے باہر نکل آیا اور سان بوتو کے گلی کوچوں میں گردش کرنے لگا۔ افریقہ کی روایتی زندگی یہاں نظر نہیں آ رہی تھی، شہر گلیاں اور بازار اعلیٰ درجے کی عمارتوں سے مرصع تھے، البتہ اب کے درمیان گھومنے پھرنے والے لوگ بہت زیادہ مہذب نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاہ زیب ٹہلتا ہوا ایک ایسے علاقے کی جانب جا نکلا جو عام شہر کی نسبت ذرا ہلکی طرز پر بنا ہوا تھا۔ یہاں پہلی بار روایتی افریقی رقص نظر آیا۔ غالباً کوئی تقریب تھی لوگوں نے بانس کھڑے کر کے ان میں رنگ برنگی جھنڈیاں لٹکائی ہوئی تھیں اور ان کے آس پاس بہت سے لوگ ایک دائرہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔

شاہ زیب نے اس تقریب میں چند غیر ملکیوں کو بھی دیکھا جو پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے، پتا نہیں وہ ان کے درمیان باقاعدہ طور پر مدعو تھے یا پھر یہ صرف اتفاق ہی تھا، شاہ زیب خود بھی ان کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ وہ ننگ دھڑنگ نوجوان جنہوں نے کسی جانور کی کھال سے جسم کے نچلے حصے کی ستر پوشی کی ہوئی تھی اور ان کے عقب میں جانور کی کھال کی دم لٹک رہی تھی، وحشیانہ رقص کر رہے تھے، رقص میں عورتیں شامل نہیں تھیں، ان لوگوں کے لرزیدہ بدن بالکل مشینی انداز میں رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ڈھول کی آواز پر وہ چار چار فٹ اونچی چھلانگ لگا کر اپنے بدن کو تحریک دے رہے تھے۔ رقص میں بہت مزہ آیا اور شاہ زیب کافی دیر تک ان کے درمیان شامل رہا پھر رقص ختم ہو گیا اور شاہ زیب وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

پھر وہ مزید کچھ دیر گھومتا رہا پھر واپس اپنے ہوٹل میں آ گیا، لیکن کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ شاہ زیب متحیرانہ انداز میں اندر داخل ہوا تو لیزا کو صوفے پر دراز پایا، وہ کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا

''کہاں چلے گئے تھے؟''

''بس... ایسے ہی تمہارا سان بوتو دیکھ رہا تھا۔''

''سان بوتو کی شہری زندگی تو تمہاری دنیا سے مختلف نہیں، دیکھنا ہے تو یہاں کی دیہی زندگی دیکھو، ویسے میں تمہیں آج رات کے کھانے پر مدعو کرنے آئی ہوں۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے، میں تو آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ سے اجازت لے کر اپنے طور پر کچھ کروں۔''

''جی نہیں اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ بتائیے آپ آ رہے ہیں یا نہیں۔''

''اگر میں منع کر دوں تو...''

''تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گی۔'' لیزا نے کسی قدر برا مناتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے مس لیزا، آپ کہتی ہیں تو ضرور چلوں گا، ان تمام باتوں کو چھوڑ کر مجھے اپنے بارے میں بتائیے۔''

''کیا بتاؤں اپنے بارے میں؟''

''کیا کرتی ہیں آپ؟''

''بوریت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، بہت کم دوست بنانے کی عادی ہوں، دوستوں کو پرکھتی ہوں اور اس کے بعد اپنے قریب آنے دیتی ہوں، لیکن دنیا سے بہت زیادہ خوش نہیں ہوں۔''

''اوہ.... افریقہ کی زندگی میں آپ کیسا محسوس کرتی ہیں؟''
''دراصل مجھے جدید زندگی بالکل پسند نہیں ہے، ہاں افریقہ کے اندرونی علاقے میرے لیے باعث دلکشی ہیں۔ وہاں کے لوگ عقل سے عاری ہیں، لیکن انسانی محبت سے مالا مال ہیں، وہ نفرت کرتے ہیں تو اس کا اظہار بھی کرتے ہیں اور محبت کرتے ہیں تو ان کی محبت میں بھی کوئی کھوٹ نہیں ہوتا، میں نے تو اپنے دل میں سوچا تھا کہ آپ کو افریقہ کی زندگی دکھاؤں، سان بوتو کا یہ شہر جدید شہر ہے، لیکن اس سے آگے کی زندگی ان سادہ لوح لوگوں کے جذبات کی آئینہ دار ہے جو یہاں کے باشندے ہیں۔''
''میں ایک آوارہ گرد ہوں اور بہت کچھ دیکھ چکا ہوں، لیکن آپ کے ساتھ افریقہ کی زندگی دیکھ کر مجھے واقعی لطف آئے گا۔''
لیزا مسکرانے لگی اس نے اپنی حسین آنکھوں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا ''پہلے آپ نے عجیب رویہ کیوں اپنایا تھا، سارا موڈ خراب کر دیا۔''
''چلو اب اپنا موڈ بحال کرلو، میں دوستوں کو ناراض نہیں کرسکتا۔''
لیزا آہستہ آہستہ بحال ہوگئی، پھر ان دونوں نے کافی منگوا کر پی اور اس کے بعد لیزا شاہ زیب سے اس کی دن کی مصروفیات کے بارے میں پوچھنے لگی شاہ زیب نے اسے اس تقریب کا احوال سنایا تو وہ مسکرانے لگی۔
''ہاں یہاں کے لوگ مہمان نواز بھی ہیں، وہ تقریب یقیناً کسی کے گھر میں ہوگی، جس گھر میں تقریب ہوتی ہے وہاں کے لوگ ایسے ہی میدانوں میں رقص کیا کرتے ہیں، میں تمہیں اندر کی زندگی دکھاؤں گی، لطف آجائے گا۔'' لیزا نے کہا۔
پھر شام تک وہ دونوں ساتھ ہی رہے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے، پھر شام کو شاہ زیب تیار ہوا اور لیزا کے ساتھ اس کے گھر کی جانب چل پڑا۔

☆......☆......☆

مسٹر شیرو ک نے اپنے گھر کے بیرونی حصے میں شاہ زیب کا استقبال کیا وہ ایک شاندار لباس میں ملبوس بہت اسمارٹ نظر آرہے تھے۔ لیزا نے کہا۔
''مسٹر شاہ زیب کہہ رہے تھے کہ تکلف کی کیا ضرورت تھی، میں تو ناراض ہو کر واپس آرہی تھی لیکن پھر شاہ زیب مان گئے۔''
مسٹر شیرو ک نے کوئی جواب نہ دیا، وہ شاہ زیب کو ساتھ لیے ہوئے ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔ کافی نفاست سے آراستہ تھا۔ یہاں ان کے دیگر اہل خانہ بھی تھے، سب کے سب مہذب اور تعلیم یافتہ گو ان کے چہروں سے سان بوتو جھلک رہا تھا، لیکن مہذب تھے اور وہ بھی اعلیٰ درجے کے اور افریقہ کی روایتی وحشت کبھی کی چھوڑ چکے تھے۔ مسٹر شیرو ک نے شاہ زیب کو اپنے سامنے بٹھالیا۔
''آپ نے مجھے قتل کرنے کے بجائے میری زندگی بچائی اور اس شخص کو قتل کر دیا جسے میں قطعی نہیں جانتا اور اس کے بعد وہاں میں نے آپ سے اپنائیت کا اظہار کیا، یہ تمام باتیں ایک ٹھوس حیثیت رکھتی ہیں، انہی کی بناء پر میں نے یہ قدم اٹھایا اور آپ سے شناسائی کا اظہار کیا۔''
''کیا آپ اس بات پر غور نہیں کرسکتے مسٹر شیرو ک کہ سیکوریٹی پولیس کی تحویل میں جانے کے بجائے میں دوبارہ ان کے ہتھے چڑھ سکتا تھا اور میری ان کاوشوں کے جواب میں وہ مجھے کتے کی موت مار سکتے تھے کیونکہ میں نے ان کے اہم آدمی کو قتل کر دیا تھا۔''
''یقیناً.. میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔''
''اور اس کے بعد جب آپ نے مجھے آئرن ہادر کی حیثیت سے مخاطب کیا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کے

ساتھ وہاں سے نکل آؤں اس سے بہتر طریقہ جان بچانے کا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہاں آنے کے بعد آپ کے ان الفاظ سے مجھے بے حد تشفی ہوئی۔''

''ویسے مجھے ان لوگوں کے بارے میں کچھ اور تفصیلات بتاؤ۔''

''کیا آپ کو اپنے دشمنوں کے بارے میں خبر نہیں ہے؟'' شاہ زیب نے سوال کیا تو مسٹر شیمروک مسکرانے لگے پھر بولے۔

''دراصل میری ذمہ داریاں کچھ ایسی ہیں کہ میرے بے شمار دشمن ہو سکتے ہیں اور پھر جس مشن پر میں ہندوستان گیا تھا اس سے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا، میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے قتل کی کارروائی کن لوگوں کا کارنامہ تھا۔ بہرطور چھوڑو ان باتوں کو تم میرے ذاتی مہمان ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تم طویل عرصہ سان بوتو میں قیام کرو، مجھ سے جو چاہو حاصل کرو۔ میں تمہارے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو اور تمہاری زندگی کیا ہے، یہ تمام چیزیں دوستی کی بنیاد پر میں تمہیں پیش کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اب تم دل سے میری دوستی قبول کر لو گے۔''

شاہ زیب نے مسکرا کر گردن ہلائی اور آہستہ سے بولا۔

''میں اپنی اس چھوٹی سی کاوش کا کوئی صلہ وصول نہیں کرنا چاہتا عرض کر چکا ہوں کہ ایک آوارہ گرد ہوں، دنیا گردی کرتا پھر رہا ہوں۔ ہندوستان میں تھا وہاں سے کہیں اور نکل جاتا۔''

''تو پھر تمہاری آوارہ گردی میں سان بوتو کی آوارہ گردی بھی شامل ہونا چاہیے۔ لیزا خود بھی مہم جو ہے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ اپنے باپ کے محسن کو کہیں بھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی جہاں تک ہوٹل میں رہنے کا تعلق ہے وہ بھی تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔''

''میرا خیال ہے اس میں کوئی ہرج نہیں ہے، آپ کا وہ ہوٹل بہت خوبصورت ہے اور مجھے پسند ہے، آپ کی محبتوں کے سائے میں میں وہاں بھی رہ سکتا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''ٹھیک ہے دوست! اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

مسٹر شیمروک سے اس ملاقات کے بعد نوعیت ہی بدل گئی تھی، شاہ زیب نے دل ہی دل میں سوچا کہ کیا ہرج ہے، زندگی جب تک کوئی دوسری پٹری نہ بدلے لیزا کے ساتھ گھومنا پھرنا دلکشی کا باعث ہو سکتا ہے اور یوں بھی اب وہ زندگی کی اقدار کھو چکا تھا، تقدیر نے جو کچھ دیا تھا وہی اس کی عادت بن چکا تھا۔

لیزا کی دلکش شخصیت اور اس کے گداز وجود کو نظر انداز کرنا اس دنیا سے منہ موڑنے کے مترادف تھا۔

رات کو بہترین قسم کا ڈنر لیا گیا۔ لیزا بھی خوش نظر آ رہی تھی، اس نے بھی اس بات کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ ہوٹل میں رہے۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ شاہ زیب نے جو ممالک دیکھے تھے ان کے بارے میں آنکھیں بند کر کے ہلا دی۔

پھر لیزا خود ہی شاہ زیب کو ہوٹل چھوڑنے آئی تھی۔ اب وہ بے تحاشا ہنسنے لگی تھی اور تیزی سے بے تکلفی کے مراحل طے کرتی جا رہی تھی، ہوٹل میں وہ کافی دیر شاہ زیب کے ساتھ رہی اور پھر واپس چلی گئی۔

اس کی شاہ زیب سے دلچسپی اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ دوسری صبح جب شاہ زیب جاگا تو وہ شاہ زیب کے کمرے میں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر شاہ زیب حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا اور وہ کسی روح ہی کی مانند دوسری بار بھی اس کے کمرے میں گھس آئی تھی، پہلے تو وہ لیزا سے اس طرح آمد کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا، لیکن اب اسے دیکھ کر شاہ زیب کو اچنبھا ہوا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیوں؟''



''تم دوسری بار اس طرح میرے کمرے میں آ گئی ہو، آخر کیسے؟''

''ایسے...'' اس نے ایک چابی نکال کر شاہ زیب کے سامنے رکھ دی اور دروازے کے تالے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ ''یہ لاک دونوں طرف سے کھولا جا سکتا ہے سمجھے؟'' اور پھر مسکراتے ہوئے بولی ''میں نے ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے۔ میں نے بھی نہیں کیا۔''

شاہ زیب مسکراتا ہوا غسل خانے کی جانب بڑھ گیا تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ناشتا کر رہے تھے۔ لیزا کہنے لگی ''یقیناً تمہیں گھڑ سواری سے دلچسپی ہوگی ہم گھوڑے پر سفر کریں گے، اس طرح ایڈونچر رہتا ہے، جبکہ بند گاڑی بہت سی آسانیوں کا سبب بن جاتی ہے اور مہاتی سفر میں جب تک آسانیوں سے دور نہ رہا جائے مزہ نہیں آتا۔''

''تو تم اس سفر کی تیاریاں کر چکی ہو؟''

''ہاں میں خود بھی ان دنوں بڑی بوریت کا شکار تھی، لیکن کسی اچھے ساتھی کے بغیر کسی بھی قسم کی تفریح میں لطف نہیں آتا، بس اب تم تیار ہو جاؤ.. افریقہ تمہارا منتظر ہے۔'' لیزا نے کہا اور وہ گہری سانس لے کر مسکرانے لگا۔

''افریقہ...'' شاہ زیب نے مسکرا کر کہا۔

لیزا سفر کی ترتیب دے کر آئی تھی، اس نے بتایا کہ گھوڑوں کے ذریعے سان بوتو کی نواحی بستی پہنچیں گے اور وہاں سے دریائے بوناتا کے ذریعے سفر کیا جائے گا....

''میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تم نے دوران سفر بڑے بڑے ملکوں اور شہروں کو دیکھا ہوگا، لیکن سرزمین افریقہ پر دریائے بوناتا میں سفر کر کے تم ایک انوکھی فرحت محسوس کرو گے۔ یہاں کی زندگی خوفناک ہے، لیکن اس میں قدم قدم پر زندگی اور موت کے درمیان جو آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے وہ انسانی زندگی کے لیے سب سے دلکش لمحات کی حیثیت رکھتی ہے۔''

''موت....'' شاہ زیب نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''ہاں موت... موت کو اتنے قریب سے دیکھنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہوتا۔''

''تم خاصی خوفناک معلوم ہوتی ہو لیزا۔''

''کم از کم اس سلسلے میں اگر تم مجھے خوفناک کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو، میں خطرات سے کھیل کر ہی زندہ رہ سکتی ہوں۔''

''اور میں خطرات سے کھیلتا ہوا زندہ ہوں، لیکن یہ خطرات خود بخود مجھ تک پہنچ جاتے ہیں بلکہ یوں سمجھ لو کہ کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے، میں ان سے بھاگتا ہوں لیکن یہ میری دم میں اٹکے رہتے ہیں، کبھی کسی شکل میں اور کبھی کسی شکل میں...''

''تب تو تمہاری ان سے دوستی ہو جانی چاہیے جبکہ تم گھبراہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہو۔''

''نہیں.. یہ کم از کم میرے ایک طرفہ دوست ضرور ہیں، یعنی میں ان کی طرف نہیں دوڑتا لیکن یہ مجھ سے دور نہیں جاتے.. ویسے ہمیں کب چلنا ہے؟''

''اب سے تھوڑی دیر کے بعد میں پاپا سے اجازت لے کر آئی ہوں۔''

''یعنی.. یعنی بالکل تیار...''

''ہاں بالکل تیار.. لیزا نے ایک ادا سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور شاہ زیب پر خیال انداز میں گال کھجانے لگا۔ یہ تبدیلی بڑی پر سکون تھی۔

☆......☆......☆

لیزا شاہ زیب کے ساتھ ہوٹل سے نکل آئی، کمرہ چھوڑا نہیں گیا تھا، ظاہر ہے لیزا ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی اور اس بڑے باپ نے شاہ زیب کے سلسلے میں اسے ہر طرح کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ شاہ زیب کو ساتھ لیے ہوئے بازار میں آئی اور درحقیقت تھوڑی دیر کے لیے شاہ زیب شرمندہ ہی ہو گیا کیونکہ اس نے کچھ دوسری خریداریوں کے ساتھ شاہ

زیب کے لیے بھی چند چیزوں کی خریداری کی تھی، جن میں لباس وغیرہ شامل تھے۔ پھر وہ بستی کے اس حصے میں آ گئی جہاں وہ پہلے بھی آ چکا تھا اور اس نے یہاں سے دو گھوڑے حاصل کیے۔ شاہ زیب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گھوڑے کرائے پر حاصل کیے گئے ہیں اس نے خود ہی مقامی لوگوں سے اس سلسلے میں گفت و شنید کر لی تھی۔ ایک تیسرا آدمی بھی ان کے ساتھ تھا جو تیسرے گھوڑے پر سوار تھا، جب یہ لوگ بستی سے باہر نکلے تو شاہ زیب نے لیزا سے پوچھا کہ کیا یہ شخص گائیڈ کے طور پر ان کے ساتھ رہے گا تو لیزا نے جواب دیا۔

''نہیں یہ اس بستی تک ہمارے ساتھ جائے گا جہاں ہم گھوڑے چھوڑ دیں گے اور دریائے بوناٹا میں سفر کریں گے۔ یہ شخص وہاں سے گھوڑے واپس لے آئے گا۔''

''دریائے بوناٹا میں سفر کا ذریعہ کیا ہو گا؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔

''افریقی وحشیوں کی بنائی ہوئی چھوٹی کشتیاں جو ہمیں وہاں سے باآسانی حاصل ہو جائیں گی۔'' لیزا نے جواب دیا۔

شاہ زیب ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گیا تھا، لیزا تو افریقی نژاد تھی، لیکن کیا کشتیوں کا سفر باعث دلچسپی ہو گا، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، لیکن اب کسی لڑکی کے سامنے اس بزدلی کا اظہار بھی مناسب نہیں تھا۔ گھڑ سواری میں شاہ زیب کو کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ وہ پہلے بھی اسے بھگت چکا تھا، آبادیاں کافی دور رہ گئیں تو افریقہ کی روایتی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا، شاہ زیب کو چھوٹی چھوٹی بستیاں نظر آئیں۔ بعض ایسی تھیں جن میں صرف آٹھ دس مکانات ہی تھے اور ان کے درمیان رہنے والے آپس ہی میں میل جول کی زندگی گزار رہے تھے۔ وہ دونوں قریب سے گزرتے رہے اور کوئی پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد ایسی بستی میں پہنچ گئے جو تقریباً چار پانچ سو مکانات پر مشتمل تھی۔ رات ان لوگوں کو یہیں گزارنی پڑی تھی۔

دوسری صبح لیزا نے کشتی کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں، وہ شخص دونوں گھوڑے لے کر واپس چلا گیا تھا جو اس بستی تک ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ لیزا نے ایک چھوٹی کشتی جو درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنائی گئی تھی حاصل کر لی اور سامان کے تھیلے کشتی میں منتقل کر دیے گئے۔ دریائے بوناٹا سامنے ہی بہہ رہا تھا، اس کی روانی بہت زیادہ تند نہیں تھی، لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی، لیزا نے بتایا کہ وہ کشتی رانی کی ماہر ہے، اس کی مہارت تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا، اس نے ایک جگہ جا کر لباس تبدیل کیا، اب وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پتلون اور سرخ رنگ کی بشرٹ پہن کر ایک سیاح کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ویسے اس کے وجود کی دلکشی کا شاہ زیب دل سے معترف ہو گیا تھا۔ سر کے بالوں پر اس نے ایک سرخ رومال باندھ لیا تھا۔ ان لوگوں نے کشتی ڈھکیلی اور اچھل کر اس میں سوار ہو گئے اور اس مہم کا آغاز ہو گیا تھا۔

پتا نہیں کتنے گھنٹے تک کشتی دریا میں سفر کرتی رہی، جب شام کے سائے گہرے ہو کر رات میں تبدیل ہونے لگے تو انہوں نے ریتیلے ٹاپو کا رخ کیا۔ لیزا کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسی مہمات کی عادی ہے، اس نے لکڑیاں جلا کر مچھلی اور مکئی کے دانے بھونے یہ چیزیں وہ ڈبوں میں بند کر کے لائی تھی۔ شاہ زیب نے یہ غذا کھائی تو بڑا ہی لطف آیا اور اب وہ ذہنی طور پر اس مہم جوئی کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ پھر لیزا نے ربڑ کا بستر بچھا دیا اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی۔ شاہ زیب نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں پائی۔

کافی رات تک وہ شاہ زیب سے باتیں کرتی رہی اور پھر سو گئی، شاہ زیب کو تعجب ہو رہا تھا کہ کیا وہ اتنی معصوم ہے کہ اسے شاہ زیب کی قربت کا احساس نہیں یا پھر وہ شاہ زیب کی طرف سے کسی تحریک کی منتظر ہے۔ وہ ساری رات سکون سے سوتی رہی تھی، شاہ زیب کو بھی کسی وقت نیند آ گئی۔ صبح کو دونوں ساتھ ہی جاگے تھے، کیفیت شرمساری کی سی تھی لیکن اس کے بعد لیزا نے کسی اور ذہنی کیفیت کا اظہار نہیں کیا اور ان لوگوں نے ضروری تیاریوں کے بعد دوبارہ ڈونگی پر سفر شروع کر دیا۔ دوپہر کے بعد یہ لوگ دریا کے دو شاخے پر پہنچے۔ ایک شاخ نہایت پرسکون تھی اور دوسری بہت تیز۔ شاہ زیب نے لیزا کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تمہیں دریا کی تیز روانی پسند ہے یا اس کا پرسکون انداز؟''

''میں اس کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔''

''میں تو تیز دھاروں پر بہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا اور شاہ زیب نے شانے ہلا دیے، لیکن اس نے دوبارہ پوچھا۔

''تم نے اپنا خیال ظاہر نہیں کیا؟''

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' شاہ زیب نے کہا۔

لیزا نے فوراً کشتی کا رخ تبدیل کر دیا، ایک لمحے کے لیے ہوا تو کھسکی تھی لیکن اب ایسا بھی کیا جو ہوگا دیکھا جائے گا، وہ تیز رفتار شاخ کے ذریعے آگے بڑھتے رہے۔ جھاگ اڑاتی ہوئی لہریں اچھل اچھل کر کشتی میں آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں بھنور بھی اٹھ رہے تھے اور انہیں دیکھ کر شاہ زیب کی آنکھیں دہشت سے بند ہوئی جا رہی تھیں، لیکن لیزا نے کشتی رانی کے بارے میں سچ کہا تھا وہ ان بھنوروں سے بچتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور اپنی کشتی رانی کی مہارت کا ثبوت دے رہی تھی۔

دوسری شام ان لوگوں نے پھر دریا کے کنارے کا رخ اختیار کیا، یہاں ایک چھوٹی سی بستی نظر آئی جہاں کے لوگ کافی وحشی معلوم ہوتے تھے، ان کے دانت بہت تیز اور نوکیلے تھے۔ لیزا سے گفتگو کر کے وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ لیزا شاہ زیب سے مخاطب ہوئی۔

''یہ مہمان نواز ہیں اور ہمیں رات کو اپنی بستی میں ٹھہرانا چاہتے ہیں میرا خیال ہے اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔''

''اگر تم سمجھتی ہو کہ کوئی ہرج نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔''

''ظاہر ہے ڈیئر شاہ زیب، ہم ان کی زندگی دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ ان کے درمیان رہنا برا بھی نہیں ہوگا، آنے والے گاؤں میں ہمارے بارے میں اطلاع دینے کے لیے گئے ہیں اور اب گاؤں کے لوگ ہمارے استقبال کے لیے آتے ہی ہوں گے۔''

لیزا کا کہنا غلط نہ ہوا، تقریباً بیس پچیس افراد کا گروہ ان دونوں کو لینے کے لیے چلا آیا۔ وہ لوگ لیزا سے باتیں کر رہے تھے اور اس کے بعد یہ لوگ ان کے ساتھ چل پڑے اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے شمار لوگ آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور آگ پر کوئی چیز بھون کر کھا رہے تھے۔ انہوں نے شاہ زیب اور لیزا کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کی پیشکش کی اور لیزا ان کے ساتھ ہی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ شاہ زیب خود بھی اسی انداز میں بیٹھ گیا تھا، پھر شاہ زیب نے غور کیا کہ وہ لوگ آگ سے کیا نکال کر کھا رہے ہیں۔ اس نے قریب بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا جس نے راکھ سے کوئی چیز نکالی تھی اور اسے دیکھ کر شاہ زیب کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ وہ ایک ادھ جلا انسانی پنجہ تھا۔ شاہ زیب کا بدن تھرا اٹھا۔ ایک لمحے میں خیال گزرا کہ یہ آدم خور ہیں، شاہ زیب نے دہشت بھری نگاہوں سے لیزا کو دیکھا تو اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے غور سے دیکھو، یہ انسانی ہاتھ نہیں ہے۔''

''تب؟'' شاہ زیب نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

''یہ لوگ بندروں کے رسیا ہیں، چھوٹی بڑی نسل کے بندر انہیں دیکھ کر دور بھاگتے ہیں۔ یہ قبیلے تو سانہ ہے اور تو سانہ قبیلے کے لوگ بندروں کی ضیافت کو اولین ترجیح دیتے ہیں۔''

لیزا کی بات پر شاہ زیب کے منہ کا مزہ خراب ہو گیا تھا، اسے سخت گھن آ رہی تھی۔ اسی وقت ایک شخص ان لوگوں کے لیے بھی بندر کی ایک لاش اٹھا لایا اور لیزا سے کچھ کہنے لگا۔ لیزا نے مسکراتے ہوئے گردن خم کر دی اور پھر شاہ زیب کی طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا تم بندر کھانا پسند کرو گے؟''

''میرا تو دل الٹ رہا ہے، براہ کرم یہاں سے ہٹ جاؤ۔''

''نہیں نہیں... ہمیں مجبور نہیں کیا جائے گا، یہ ان کی طرف سے ہمارے لیے ایک تحفہ ہے۔''

''کیا تم بھی اس ضیافت کو پسند کرتی ہو؟''

''میں نے آج تک قبیلہ توسانہ کی میزبانی کا شرف حاصل نہیں کیا بس ان کے بارے میں سنا ہے دیکھو وہ بندر کی لاش پکار رہے ہیں۔'' لیزا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور شاہ زیب اس طرف متوجہ ہوگیا، ہر چند کی طبیعت اوبھ رہی تھی لیکن افریقی روایتوں کو دیکھنے کا شوق بھی دل میں تھا، لیزا نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور وہ چیخ چیخ کر دوسرے لوگوں سے کچھ کہنے لگا۔ متحرک لوگ رک گئے اور ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک بوڑھے وحشی نے انہیں کچھ سمجھایا اور وہ خاموش ہوگئے۔ لیزا شاہ زیب کو بتا رہی تھی کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کر رہے کہ ان دونوں نے ان کی ضیافت قبول نہیں کی۔

''کیا یہاں سے اٹھا جاسکتا ہے۔؟''

''اگر تم چاہو تو ٹھیک ہے۔'' لیزا نے جواب دیا اور پھر مقامی زبان میں ان سے اجازت لی۔

وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر ایک جھونپڑے میں آگئے جوان لوگوں کے لیے بنایا گیا تھا، جھونپڑے میں گھاس پھونس کا بستر تھا، لیزا نے مسکراتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھٹکا دینے والا تھا۔ لیکن شاہ زیب نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ اپنے آپ پر جبر کرے گا اور کسی بھی ایسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرے گا جو اس کے لیے وبالِ جان بن جائے۔

رات گزر گئی اور صبح یہ لوگ ان بستی والوں سے رخصت ہوکر اپنے سفر پر چل پڑے، اب دریا کی رفتار سست ہوتی نظر آرہی تھی، کشتی کی رفتار بھی مدہم پڑ گئی تھی، لیزا جو خوراک اپنے ساتھ لائی تھی اس میں چاول مچھلی کے ڈبے، گوشت کے ٹکڑے موجود تھے بسکٹ بھی تھے البتہ چائے یا کافی وغیرہ کا اس نے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا، بیوقوف لڑکی اگر مشورہ کرلیتی تو شاہ زیب اس کا انتظام ضرور کرتا، لیکن اب کیا کیا جاسکتا تھا۔

سفر جاری رہا اور پھر ایک دن ان لوگوں کو دریا کے کنارے بڑی بیلیں نظر آئیں جو پیٹھے جیسے پھل سے لدی ہوئی تھیں۔ شاہ زیب نے کشتی وہاں رکوائی۔ پھل توڑے۔ انہیں چکھ کر دیکھا تو لطف ہی آگیا۔ بہت لذیذ اور شیریں تھے، رنگت اوپر سے پیٹھوں جیسی تھی لیکن اندر سے خربوزے جیسے تھے نرم اور لذیذ، پھر ایک اور بستی پہنچے اور رات گزارنے کے بعد دوسری صبح پھر آگے بڑھ گئے۔

شاہ زیب بھی اب یہاں کے ماحول میں دلچسپی لینے لگا تھا، افریقہ کی وہ انوکھی زندگی جو وحشت سے بھرپور ہے نگاہوں کے سامنے تھی۔ زہریلی مکھیوں کے غول کبھی کبھی کشتی پر پرواز کرنے لگتے تھے، ایک دوبارہ ان مکھیوں نے کاٹنے کی کوشش بھی کی شاہ زیب نے اپنے لباس چپوؤں میں باندھ لیے اور ان مکھیوں کو اڑانے کی کوششوں میں مصروف ہوگئے۔ بمشکل تمام ان کی زد سے بچ سکے تھے۔ دو دن کے بعد دریا کا بہاؤ پھر تیز ہوگیا، شاہ زیب نے لیزا سے پوچھا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ زندگی انسانی تصورات سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ اب تک میں نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی دلکشی کا باعث ہے، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی ایسی نامعلوم سمتوں کی طرف جانکلیں جہاں سے واپسی ممکن نہ ہوسکے۔'' شاہ زیب عجیب سے لہجے میں بولا اور لیزا نے جواب میں ہنس کر کہا۔

''نہیں ڈیئر شاہ زیب، ایسی کوئی بات نہیں ہے، ابھی تو ابتدائی حصہ ہے، یہاں سے آگے جانے کے بعد ہمیں ایک بڑی آبادی شکولا ملے گی، وہاں باقاعدہ مہذب نظام قائم ہے، وہاں ہم قیام کریں گے، میرے پاس تمام نقشے موجود ہیں، ابھی تو ہم نے اس سفر کا آغاز کیا ہے، صحیح معنوں میں افریقہ کی ہیبت ناک زندگی تو آگے نظر آئے گی۔''

شکولا کا فاصلہ ابھی نجانے کتنا تھا، شاہ زیب اس ہیبت ناک زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی نشاندہی لیزا نے کی تھی، وہ تو مقامی تھی مگر شاہ زیب اس ہیبت ناک زندگی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا، لیکن پھر دل کو یہ کہہ کر سمجھالیا کہ ہرج ہی کیا ہے، جدید دنیا کی رنگینیاں تو دیکھ ہی لی تھیں اب انسانی نگاہوں سے دور صحرائے اعظم کے یہ مناظر بھی دیکھ لیے

جائیں اور اگر موت ہی اس طرف لے آئی ہے تو پھر یہی سہی، لیکن موت کو وہ اب تک شکست دیتا آیا تھا۔ لیزا ابھی تک کسی ایسی کیفیت کی حامل ثابت نہیں ہوئی تھی جو باعث توجہ ہوتی، وہ ایک دلچسپ ساتھی ثابت ہوئی تھی، بارہا ایسے دلکش مراحل آئے تھے جو ہیجان کن ہوتے تھے لیکن اس وقت شاہ زیب کی نگاہیں لیزا کا جائزہ لینے لگتی تھیں اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس کیفیت سے بالکل ہی بے نیاز ہے۔

ایک جگہ دریا کا پاٹ اتنا چوڑا ہو گیا کہ سمندر کا گمان ہونے لگا، نگاہوں کی آخری حد پر ایک لکیر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، کہیں کہیں دریا میں چھوٹے چھوٹے ٹاپو بھی آجاتے تھے۔ ان میں سے بعض پر آبادیاں بھی تھیں جن کے بارے میں لیزا نے بتایا کہ یہاں مچھیرے رہتے ہیں، اکثر غیر آباد ٹاپو جو سفید رنگ کی ریت اور سرسبز درختوں سے ڈھکے نظر آتے تھے کشتی کے بالکل قریب سے گزر جاتے، پھر ان لوگوں نے بہت دور سے دھوئیں کے بادل دیکھے اور شاہ زیب نے لیزا کو اس جانب متوجہ کیا۔ درخت جل رہے تھے راکھ اور چنگاریوں کے بادل دریا پر چھانے لگے، لیزا بھی ادھر دیکھنے لگی، پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''یہ خشک جنگل ہے، میں اس علاقے کے بارے میں جانتی ہوں، یہاں بارشیں نہیں ہوتیں اور یہاں کی زمینیں بارش نہ ہونے کی وجہ سے تپ تپ کر سیاہ ہو چکی ہیں، آؤ ان کے قریب چلتے ہیں، ویسے یہ شکولا کا عقبی علاقہ ہے، لیکن دریا کے راستے ہمیں کافی گھوم کر شکولا کے سامنے والے حصے تک جانا ہوگا، آؤ اس ماحول سے لطف اٹھائیں میں تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی۔''

کشتی کنارے کی جانب چل پڑی، لیزا کا کہنا بالکل درست تھا، درختوں کے جلے ہوئے کالے ڈھانچے بے حد خوفناک نظر آرہے تھے، یہ لوگ زمین پر اترے تو شاہ زیب کے پاؤں جلنے لگے، زمین اتنی ہی گرم ہو رہی تھی۔ لیزا نے بتایا کہ ان جنگلوں کو شکولا کے باشندوں نے جان بوجھ کر نذر آتش کر دیا ہے یہ لوگ اناج بونے کے لیے زمینیں صاف کرتے ہیں۔ سیلاب کے دنوں میں جب یہ زمینیں زیر آب آجاتی ہیں تو مچھلیاں جھاڑیوں اور درختوں کی جڑوں میں پناہ لے لیتی ہیں اور جال میں نہیں پھنستیں۔ چنانچہ ان علاقوں کو اس مقصد کے لیے صاف کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک دن موت کے اس جنگل میں گزارا، گرمی کی وجہ سے زبانیں خشک ہو رہی تھیں، لیکن مہم جو لیزا ہر ماحول سے روشناس ہونا چاہتی تھی افسوس اسے اپنے ساتھی کی دلچسپیوں کا اندازہ نہیں تھا۔

دوسری صبح یہ لوگ جلد از جلد وہاں سے آگے بڑھ گئے اور پھر دریا کے راستے شکولا پہنچ گئے۔ شکولا کے اطراف دریا میں کشتیاں نظر آرہی تھیں، شاہ زیب نے ایک موٹر بوٹ کے انجن کی آواز بھی سنی اور چونک پڑا، پھر اس نے لیزا سے سوال کیا

''یہ آواز کیسی ہے لیزا؟''

''یہ محافظ پولیس ہے۔''

''کیا پولیس ہم سے تعرض کرے گی؟'' شاہ زیب نے پھر سوال کیا

''نہیں... لیکن یہاں سے ہمیں دریائی سفر کا اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا میں اس کے لیے انتظامات کر کے آئی ہوں۔''

''یوں لگتا ہے جیسے تم ان علاقوں میں پہلے بھی آچکی ہو۔''

''نہیں اس طرف نہیں آئی۔ میں نے دوسری سمت کافی سفر کیا ہوا ہے، لیکن یہاں کے بارے میں مجھے اتنی معلومات حاصل ہیں کہ مجھے ان میں سے کوئی بھی چیز اجنبی نہیں محسوس ہوتی اور پھر میں نے پاپا سے اس سفر کے بارے میں تمام تفصیلات پوچھ لی تھیں، ہماری ایک آیا ہے جو ایسی ہی ایک اندرونی بستی سے تعلق رکھتی ہے اور کافی تعلیم یافتہ ہے، اس نے لندن سے تعلیم حاصل کی ہے کہنے کو وہ ہماری آیا ہے، لیکن اس نے افریقہ کے ان علاقوں کے بارے میں باقاعدہ مضامین

لکھے ہیں اور ان مضامین میں اس زندگی کا بڑی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، اس طرف سفر کرتے ہوئے میں نے اس سے بہت سے مشورے لیے ہیں۔''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ چند گھنٹوں کا یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں کا عام سا سفر ہوگا، لیکن یوں لگتا ہے جیسے تم کافی طویل پروگرام بنا کر نکلی ہو۔''

''فکر مت کرو ڈیڈی سے میں نے دو ماہ کی اجازت لے لی ہے۔'' لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دو ماہ اور دو ماہ ہم اسی طرح گزاریں گے۔''

''مہم جوئی کا لطف اسی وقت آتا ہے ڈیئر شاہ زیب، جبکہ ہمیں اپنے آئندہ قدم کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہو، کیا تم مجھ سے متفق نہیں ہو؟''

جواب میں شاہ زیب حیرت سے گردن ہلا کر رہ گیا، واقعی یہ اس کے لیے بھرپور ایڈونچر تھا۔ پھر یہ لوگ ایک ایسے کیمپ میں پہنچ گئے جو شکولا کا سرکاری کیمپ تھا، لکڑی کی بنی ہوئی بھدی میزیں اور اسٹول وہاں رکھے ہوئے تھے اور ان پر شکولا کے عہدے دار بیٹھے ہوئے تھے، ماحول کافی مہذب نظر آ رہا تھا، لیزا نے ان عہدے داروں سے گفتگو کی اور وہاں سے اسے آگے جانے کا اجازت نامہ مل گیا۔ شکولا سے ان لوگوں نے کھانے پینے کی اشیاء کا کافی ذخیرہ خرید الیزا اس خرید و فروخت کا انتظام کر کے آئی تھی اور اس کے بعد یہ لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے، اب دریا کا منظر بدلتا جا رہا تھا، کناروں کے ساتھ ساتھ اونچی نیچی بے ترتیب پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، بعض نشیبوں میں سرسبز گھاس نظر آ رہی تھی۔

درختوں کے جھنڈ دریا کے کنارے کنارے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، ناریل کے درخت یہاں نمایاں تھے۔ البتہ دریا کا پاٹ پتھریلے کناروں کی وجہ سے تنگ ہو گیا تھا۔ کشتی اب دریا کے تیز دھاروں میں بہنے لگی تھی، اردگرد دریا کا پانی جیسے ابل رہا تھا، آگے بھنور بھی نظر آنے لگے اور چند لمحوں کے بعد یہ لوگ ان کے قریب پہنچ گئے، یہاں کشتی میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا انتہائی مشکل ثابت ہوا، کشتی بھنور کے اندر داخل ہوتے ہی چکر کھانے لگتی، ایک بھنور سے نکلتے تو دوسرے میں پھنس جاتے بھنور سے نکلنے کے بعد چپوؤں کو تیزی سے چلانا پڑتا اور درحقیقت یہاں پہنچنے کے بعد شاہ زیب کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ لیکن خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی آخری بھنور بھی پیچھے رہ گیا، چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سی آبنائے نے انہیں اپنی آغوش میں سکون بخشا اور اس کے بعد ہم قدرے پرسکون سفر کرنے لگے۔

سفر ایک ایسی جگہ ختم ہوا جہاں دریا کے کنارے کنارے بے شمار جھونپڑیاں تھیں، جھونپڑیوں کے دوسری طرف گھنا اور سرسبز جنگل تھا۔ یہ جنگل جھونپڑیوں سے کافی فاصلے پر جا کر شروع ہوتا تھا، درمیان میں انسانی قد سے اونچی گھاس پھیلی ہوئی تھیں جو بلندی سے دیکھنے پر تراشی ہوئی اور ہموار محسوس ہوتی ہوگی۔ کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، جھونپڑیوں میں چربی سے جلنے والی مشعلیں روشن تھیں۔ انہوں نے کشتی کنارے پر کھینچ لی اور اسے ایک ابھری ہوئی چٹان میں اٹکا کر آگے بڑھ گئے، جھونپڑیوں کی قطار کے پاس پہنچے تو اندازہ ہوا کہ جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں، لیکن ہوا کے دوش پر ڈھول کی تال اور انسانی آوازیں ان تک پہنچ رہی تھیں، چنانچہ انہوں نے بھی اسی جانب رخ کیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں مشعلوں کا ایک بڑا سا دائرہ نظر آ رہا تھا، اس دائرے میں رقص کیا جا رہا تھا، غالباً یہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا، یہ لوگ ہمت کر کے آگے بڑھے، رقص کرنے والی افریقی نسل کی لڑکیاں تھیں، ان کے چہروں پر نیل اور سفید چاک سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، کچھ لڑکیوں کے چہرے دو برابر حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک حصہ نیلا اور دوسرا سفید تھا۔ رقص کرنے والی ان لڑکیوں کے علاوہ مرد بھی اس رقص میں شامل تھے، ڈھول بج رہے تھے اور نرسنگھے چنگھاڑ رہے تھے، رقص میں تیزی پیدا ہوتی جا رہی تھی، ڈھول بجانے والوں کے بدن پسینے سے چمک رہے تھے اور ہیجان خیز رقص تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ شاہ زیب اور لیزا لوگوں کے درمیان جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ کوئی بھی ان لوگوں کی جانب متوجہ نہیں ہوا تھا اور یہ بات ذرا باعث حیرت تھی کیونکہ بہرحال یہ لوگ ان سے مختلف تھے۔

(زندگی کے پیچیدہ راستوں میں اپنے ہم شکلوں کی کھوج میں نکلے، شاہ زیب کی اگلی منزل کیا ہوگی......؟
جاننے کے لیے اگلی قسط کا انتظار کیجیے۔)

توشۂ خاص، خوانِ ہفت رنگ حکایتیں

مختصر مختصر خوش بیاں، فرحت ساماں، زہرکار، عبرت اثر حکایتیں

ملتان سے پہلی حکایت

# یہی صلہ ہے یہاں

سیما گل

ملتان سے ایک حرماں نصیب کی محبتوں کا لہور لاتا انجام



یہ میری دوست ثانیہ کی کہانی ہے۔ ثانیہ 6th کلاس میں تھی جب اُس کے والد کی وفات ہوگئی۔ والدہ اس صدمے سے بیمار رہنے لگیں۔ چھوٹی سی عمر میں وہ بہت سنجیدہ اور ذمہ دار ہوگئی تھی۔ کھیل کود اور گڑیاں چھوڑ

کر وہ اپنے دو چھوٹے بہن بھائی اور اپنی ماں کو سنبھالنے میں لگ گئی تھی۔ نہ صرف اس نے ان کا خیال رکھا بلکہ اپنی تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت ہٹ کر تھی۔ نہ شوخی نہ شرارت، ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہنا۔ گھر کی تربیت نے اُسے چھوٹی عمر میں نماز کا پابند بنا دیا تھا۔ اس لیے وہ ہر وقت دوپٹہ سر پر لیے رہتی۔ صبح اُٹھ کر نماز پڑھتی اور پھر قرآن مجید کی تلاوت کرنا اس کا معمول تھا۔ پھر اسکول کے لیے تیار ہوتی اور بہن اور بھائی کو تیار کرنا، امی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں مدد دینا بھی اُس کا معمول تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ عمر سے پہلے ہی بڑی ہوتی گئی۔ اُس نے اپنی دلچسپیاں بڑھالیں۔ اپنی پڑھائی کا خرچہ نکالنے کے لیے وہ گھر داری، سلائی کڑھائی، چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹیوشنز پڑھانے لگی۔ وہ نہ صرف محلے میں بلکہ پورے خاندان میں ایک اچھی مثال مانی جاتی تھی۔

وہ بہت باادب اور اچھے اخلاق کی مالک تھی۔ سب اُس سے بہت پیار سے پیش آتے تھے۔ دادا ابو ان کی کفالت کرتے تھے۔

☆......☆......☆

وقت جیسے تیسے گزر رہا تھا۔ ثانیہ اب کالج میں پہنچ گئی تھی۔ کالج کی آزاد اور خوبصورت زندگی نے اُسے کافی حد تک بدل ڈالا تھا۔ اب وہ ڈری سہمی سی لڑکی نہ رہی تھی سہیلیوں کی محبت نے اُسے شوخ و شریر بنا دیا تھا۔ وہ ہر سرگرمی میں آگے آگے رہتی لیکن پڑھائی میں آج بھی اُسی طرح اُس کی دلچسپی قائم تھی، جیسے شروع دن سے وہ محنت کرتی چلی آئی تھی۔ ہر چند کسی نے اُس کی مدد نہ کی۔ نہ اُس نے کبھی کوئی ٹیوشن لی۔

اچھے نمبروں سے اُس نے گریجویشن تک تعلیم مکمل کرلی۔ وہ مزید پڑھنا چاہتی تھی کیونکہ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ شادی کے خواب نہیں دیکھتی تھی۔ کچھ بننا چاہتی تھی، کچھ کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے پرائیویٹ ایم اے کرلیا۔ ابھی اُس نے امتحان دیا تھا کہ اُس کے لیے رشتے آنا شروع ہوگئے۔ دوسری ماؤں کی طرح اُس کی امی کو بھی اُس کی شادی کی فکر تھی۔ بس یہیں سے اُس کی بربادی شروع ہوگئی۔

دو تین رشتوں میں سے ایک زمیندار کا بیٹا اس کی امی کو پسند آ گیا کہ وہ پڑھا لکھا اور پیسے والا ہے۔ وہ لوگ بہت چاہت سے رشتہ مانگ رہے ہیں۔ میری بیٹی کو خوش رکھیں گے۔''

اُس کے والدین نے یہ نہیں سوچا کہ ہماری بیٹی تعلیم یافتہ اور بہت حساس دل کی ہے اور زمیندار بہت سخت دل ہوتے ہیں۔ عورت کی قدر نہیں کرتے۔ بہرحال یہ سب اُس کی قسمت میں لکھا تھا اور شادی ہوگئی۔

☆......☆......☆

اُس کی آنکھوں میں دوسری لڑکیوں کی طرح بہت سے خواب تھے۔ دل میں ہزاروں ارمان تھے۔ اُس نے کبھی کسی کو اِس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے لیے تو سب کچھ اس کا خاوند تھا۔ وہ دل و جان اُس پر نچھاور کرنے کے لیے تیار تھی۔

بہت محبت سے اُس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا۔ سسرال والوں کو دل سے اپنا سمجھا۔ بہت عزت دی۔ اُن کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور خاوند کے تو وہ آگے پیچھے پھرتی تھی۔ اُس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کر کے اُسے خوشی محسوس ہوتی تھی مگر وہ اُس کی خدمتوں سے خوش نہیں تھا۔ اُسے ایک فحش عورت کی ضرورت تھی۔ شروع میں اُس کا رویہ کچھ ٹھیک رہا پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی اصلیت پر آ گیا۔ ہر بات پر لڑنا، ہر چیز میں نقص نکالنا۔ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جانا۔ مارنا پیٹنا اور بری طرح تشدد کرنا۔ پھر کئی کئی دن گھر سے باہر رہنا۔

اُس کے لیے یہ سب کچھ سہنا بہت مشکل تھا۔ وہ محرومیوں میں پلی تھی۔ خاوند کی توجہ اور محبت چاہتی تھی۔ اُس کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا کرے، جس سے اُس کا خاوند خوش ہو جائے۔

سب لوگ تو اُس کی تعریف کرتے تھے۔ اُس کی گھر داری، بچوں کی اچھی تربیت، اُس کے سلیقے طریقے کے سب مداح تھے۔ بظاہر تو اُس کا خاوند بھی خوش ہو جاتا تھا۔

اس دوران وہ چار بچوں کی ماں بن گئی، دو بیٹے دو بیٹیاں۔ اپنے بچوں میں اُس کی جان تھی۔ دن رات پاگلوں کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے پھرتی۔ خاوند کو خوش رکھنے کے طریقے ڈھونڈتی مگر وہ جو بظاہر شریف آدمی نظر آتا تھا، کبھی بیوی کے بناؤ سنگھار کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ اُسے سادہ رہنے کی تلقین کرتا کہ ایسے اچھی لگتی ہو۔ وہ اپنے آپ کو پھر

بھی بنا کر رکھتی۔ اچھے طریقے سے رہنے کی کوشش کرتی مگر وہ اُس کو وہ توجہ اور محبت نہ دیتا تھا، جو اُس کا حق تھا۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے اُسے ہر محفل، ہر فنکشن میں ساتھ رکھتا تاکہ وہ کہہ سکیں کہ کتنا خوش رکھتا ہے۔ وہ اُس کے ہر برے رویے کے بعد بھی اُس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اُسے پتا تھا کہ اُس کا خاوند ایک عیاش آدمی ہے۔ باہر اُس کے بہت سی عورتوں سے تعلقات ہیں۔ یہ اُس کی پرانی خصلت تھی کہ وہ عورتوں کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ بھلا اُسے کیسے روکتی۔ وہ ایک سر پھرا، ضدی اور اکھڑ آدمی تھا۔ بات بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتا اور کئی کئی دن سزائیں دیتا تھا۔ بچوں کی خاطر وہ یہ سب سہنے پر مجبور تھی۔ پھر ایک دن وہ قیامت بھی اُس پر ٹوٹی جس نے اس کی دنیا ختم کر دی۔

بہانے سے اُسے گھر سے نکالا اور ایک آوارہ اور بدچلن عورت کو جو عمر میں اُس سے کافی چھوٹی تھی۔ شادی کر کے اُس کی جگہ پہ لا بٹھایا۔ وہ روتی پیٹتی رہی۔ ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتی رہی کہ میرا گھر نہ چھینو، میرے خاوند کو سمجھاؤ، مگر وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔ وہ بددماغ آدمی سامنے آنے کو تیار نہیں تھا۔

اُس عورت کے ساتھ اُس نے دوبارہ ہنی مون اور نئی زندگی کا آغاز کر دیا اور ثانیہ کو دل اور گھر سے نکال دیا، دو چھوٹے بچے اُس کے حوالے کر کے۔

وہ اپنے بچوں کے لیے تڑپتی رہی، روتی رہی، جن کے بغیر وہ ایک لمحہ نہیں رہ سکتی تھی بالآخر وہ اُجڑ کر ماں کے گھر آ گئی۔ کچھ عرصہ تو وہ اپنے آپ کو سنبھال ہی نہیں سکی تھی۔

رو رو کر برا حال کر لیا۔ پھر لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر اُس نے اپنے چھوٹے معصوم بچوں کے لیے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔ اسکول میں نوکری کر لی اور ساتھ ہی بچوں کو اسکول داخل کرا دیا۔ یہاں اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اُسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ دل بہت دُکھی تھا، مگر جینا تھا، بچوں کی خاطر۔

کسی نے اس مشکل میں اُس کا ساتھ نہ دیا۔ سب رشتے خود غرض نکلے۔ ہمت کر کے اُس نے اپنے کام سے ایمانداری کی خدا نے اُس کا ساتھ دیا اور وہ اپنے بچوں کو پالنے کے قابل ہو گئی۔ ساتھ ہی اُس نے بیوٹیشن کا کورس کر لیا۔ دن رات کی محنت سے اُس نے اپنے بچوں کو قابل کیا، پڑھایا ہر آسائش دی۔ یہ بھول گئی کہ وہ بھی ایک انسان ہے۔ اُسے بھی بہت کچھ چاہیے جو اس کی ضرورت ہے۔ مگر وہ خود سے بے نیاز ہو کر دنیا کی ٹھوکریں اور دھکے کھاتی رہی۔ وقت گزرتا گیا۔

اُس کا خاوند جو ایک عیاش عورت کے ساتھ بہت خوشیوں بھری زندگی جی رہا تھا۔ جس نے اُسے ابھی تک چھوڑا نہیں تھا۔ بچوں کے کہنے پر اُن کی نوکرانی بنا کر سسرال کے ایک کونے میں کمرہ دے دیا رہنے کے لیے۔ وہ سمجھی تھی خاوند کے گھر جاؤں گی تو اُسے میرا خیال آئے گا۔ وہ میرے پاس آئے گا مگر اُس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اُس نے بچوں کو اُس کے حوالے کر کے اپنی عیاشیاں اور بڑھا لیں۔

پہلے دور بیٹھی وہ سوچتی تھی۔ اب سارے نظارے سامنے دیکھنے لگی۔ دن رات جلنے کڑھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ بچے بڑے ہو چکے تھے۔ جن کے آسرے پر اُس نے تکلیف دہ دن رات گزارے۔

وہ نئے زمانے کی پیداوار تھے۔ انہیں ماں میں سو سو عجیب نظر آتے تھے۔ بات بات پر بے عزتی کرتے نہ ماں کی عزت کرتے نہ احساس۔ وہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف اور خوش رہتے۔ بے شک اُن میں کوئی بُری عادت نہیں تھی وہ تعلیم یافتہ تھے، کچھ بننا چاہتے تھے، مگر ثانیہ کو اپنا آنے والا وقت بہت بُرا نظر آ رہا تھا۔ اُسے تو اپنی اولاد کی محبت اور توجہ کی ضرورت تھی مگر اس کے لیے اُن کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ نہ ضرورت، وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میرا کیا بنے گا۔ آج جو بچے میرے دُکھ کا احساس نہیں کرتے مجھ سے پیار سے بات نہیں کرتے۔ کل جب میں اُن کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گی تو مجھے کیسے سہارا دیں گے۔ میری دلجوئی کریں گے۔ میرا خیال رکھیں گے۔ نہ خاوند میرا ہے نہ بچے؟ آخر میں کہاں جاؤں۔ اُس کا دل چاہتا تھا کوئی اُس کو اپنا لے مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ کوئی اس کے بارے میں نہیں سوچتا تھا۔ نہ آگے راستہ نہ پیچھے۔ مزید ذلت سے بچنے کے لیے وہ مر جانا چاہتی تھی۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ مگر کیا ثانیہ کی زندگی بہت ساری ماؤں کے لیے سوال نہیں؟ اولاد کی پرورش کرنے والی عورت کی زندگی کا یہ صلہ ہے؟ ضرور سوچیے اور احتیاط کریں۔

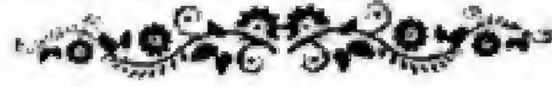
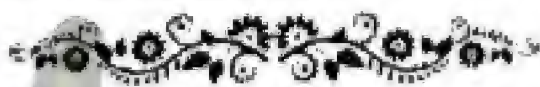
☆☆......☆☆

# چھٹی حس



شیخ معظم الٰہی

لاہور سے، اُس شخص کی کہانی جس کی چھٹی حس بلا کی تیز تھی

یہ واقعہ جو میں لکھنے جا رہا ہوں، وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ ان دنوں میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ والد محترم کا کاروبار قصور میں ہوا کرتا تھا۔ اور وہ لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر قصور آتے جاتے تھے۔ وہ صبح جاتے اور شام کو واپس آ جاتے۔

ایک دن والد محترم قصور جانے لگے تو میں نے ان سے ضد کی کہ اس بار میں بھی آپ کے ساتھ قصور جاؤں گا۔

''والد محترم نے جواب دیا کہ نہیں اس دفعہ نہیں میں تمہیں اگلی بار چھٹی کے روز قصور لے کر جاؤں گا۔'' میں نے ان کی بات مان لی اور اگلی بار کا انتظار کرنے لگا۔

اگلی دفعہ چھٹی کے روز جب وہ قصور جانے لگے تو انہوں نے مجھے بھی تیار ہو کر ساتھ چلنے کے لیے کہا کہ چلو بیٹا آج تم میرے ساتھ۔ راستے میں اٹاری سروبا بھی تمہیں دکھاتا چلوں گا۔

''اٹاری سروبا میں والد محترم کی کچھ زرعی زمین تھی۔ جو قصور کے راستے میں پڑتی تھی۔ چنانچہ میں فوراً ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ والد محترم نے مجھے ساتھ لیا اور رکشے میں بیٹھ کر ہم چوبرجی پہنچ گئے۔ ان دنوں چوبرجی سے قصور جانے والی بسیں چلا کرتی تھیں۔ وہاں ہم بس کا انتظار کرنے لگے۔ اس دن چھٹی کی وجہ سے بسوں میں بہت رش تھا۔ جو بس وہاں آتی وہ بہت بھری ہوئی ہوتی۔ انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا کہ اتنے میں والد محترم کے ایک پرانے جاننے والے دوست صابر صاحب نے بہت زور سے والد محترم کو آواز دی۔

صابر صاحب قصور ہی کے رہنے والے تھے۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ اور واپس قصور جانے کے لیے وہاں موجود تھے۔ والد محترم نے پلٹ کر دیکھا اور ان کی طرف لپکے۔

علیک سلیک کے بعد صابر صاحب نے پوچھا کہ ''شیخ صاحب کیا آپ قصور جا رہے ہیں؟ تو چلو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں اور میری طرف دیکھ کر پوچھا کہ یہ بچہ کون ہے؟'' تو والد محترم نے جواب دیا کہ یہ میرا بیٹا معظم الٰہی ہے۔

صابر صاحب نے مجھے پیار کیا اور پھر والد کی طرف متوجہ ہو گئے اور کہا ''شیخ صاحب آج جو بھی بس آ رہی ہے بھری ہوئی آ رہی ہے۔ اس طرح تو جگہ ملنا بہت مشکل ہے۔''

☆......☆......☆

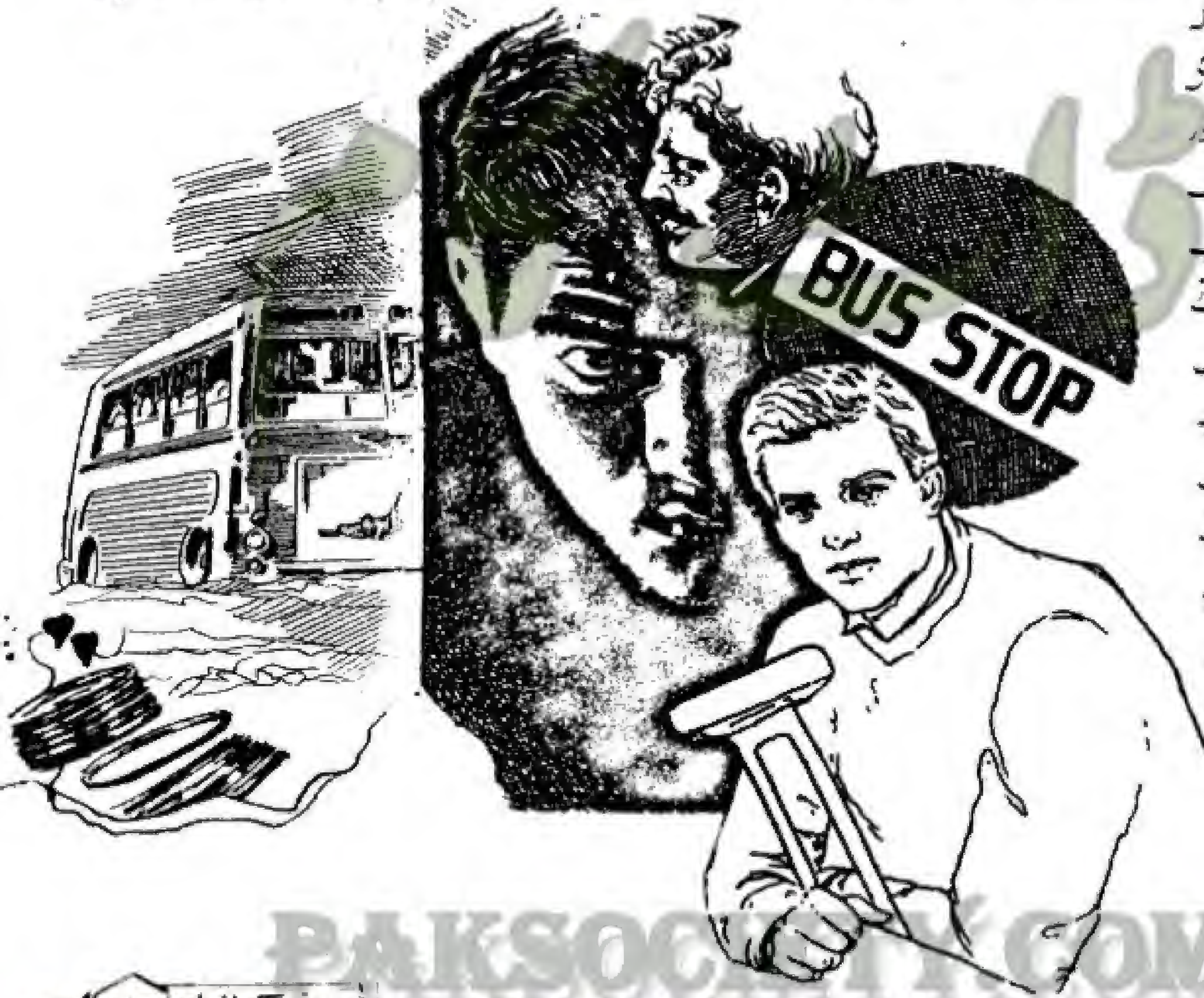
ابھی صابر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے اچانک ایک بس وہاں آ کر رکی جہاں ہم کھڑے تھے بس میں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ ایک دوسرے پر لدے ہوئے تھے۔ صابر نے والد محترم کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ چلیں شیخ صاحب ہمیں بھی تھوڑی سی جگہ کھڑے ہونے کے لیے مل ہی جائے گی۔ یہاں کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ اس بس میں سوار ہو جائیں۔

”مگر والد محترم نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ نہیں صابر تم جاؤ۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ کسی دوسری بس میں سوار ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ بس میں بہت بھیڑ ہے میرا بیٹا گھبرا جائے گا۔“

صابر صاحب نے بہت اصرار کیا کہ شیخ صاحب اگلی بس نہ جانے کب آئے گی۔ ہم اسی بس میں سوار ہو کر چلتے ہیں۔

ابھی پہلی والی بس کو روانہ ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اتنے میں دوسری بس بھی آ گئی۔ اتفاق سے وہ آدھی خالی تھی۔ والد محترم نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس بس میں سوار ہو گئے۔ ابھی ہماری بس کاہنا کاچھا (قصور کے راستے میں پڑتا ہے) سے کچھ دور ہی پہنچی تھی کہ اچانک ہماری بس کے ڈرائیور نے بس کو بریک لگا دی۔ سب مسافروں نے ڈرائیور سے بس روکنے کی وجہ پوچھی تو بس ڈرائیور نے سامنے اشارہ کیا تو دیکھا کہ وہاں بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ والد محترم کو تشویش ہوئی کہ یہ بھیڑ کیسی ہے؟ چنانچہ وہ مجھے ساتھ لے کر بھیڑ والی جگہ پر چلے گئے تو دیکھا ایک بہت خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ لاہور سے قصور جانے والی بس جس میں صابر صاحب سوار تھے۔ اور قصور سے آنے والی بس آپس میں اتنی زور سے ٹکرائیں کہ ایک دوسرے میں بری طرح دھنسی ہوئی تھیں۔ دونوں بسوں کے بہت سے مسافر ہلاک ہو چکے تھے اور بری طرح سے زخمی بھی تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں صابر صاحب بھی شامل تھے۔ والد محترم صابر صاحب کی لاش کو دیکھ کر بہت دکھی ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اگر میں اور میرا بیٹا اس بس میں سوار ہو جاتے تو کیا بنتا۔ پھر انہوں نے کسی طرح سے صابر صاحب کے ہلاک ہونے کی خبر ان کے گھر والوں تک پہنچائی۔

آخر کار والد محترم مجھے لے کر اپنی بس میں سوار ہوئے اور اٹاری سرو پا جا کر اتر گئے۔ والد محترم مجھے ساتھ لے کر اپنی زرعی زمین کی طرف لے جانے لگے۔ راستے میں مجھے بتانے لگے کہ ہماری زمین یہاں سے لے کر ادھر تک پھیلی ہوئی ہے۔“ ابھی انہوں نے یہ الفاظ منہ سے نکالے ہی تھے کہ اچانک انہوں نے مجھے ایک



## نابینا ماہرِ نباتات!

نابینا ماہر نباتات جان گرمشاولکنسن تقریباً 23 سال کی عمر میں نابینا ہوگیا تھا۔ لیکن اس نے زبان کی نوک سے چھو کر پھولوں کو پہچاننا سیکھ لیا تھا۔ وہ پانچ ہزار مختلف قسم کے پھولوں کو چھوتے ہی فوراً اُن کے نام بتا سکتا تھا۔ اسی طرح مشہور انگریز سائنسدان جان ڈالٹن کا ہم عصر جان گوغ بھی پیدائشی نابینا ہونے کے باوجود بیس میل کے اندر موجود ہر قسم کے پودوں کو چھو کر، سونگھ کر اور ذائقہ چکھ کر پہچان لیتا تھا۔ جان گوغ کو علمِ موسمیات سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کئی زبانیں بھی جانتا تھا۔ (مرسلہ: یاسر وکی۔ دیپالپور۔ ساہیوال)

قریبی گڑھے میں دھکا دے دیا اور خود بھی اس گڑھے میں کود پڑے اور انہوں نے مجھے اپنے نیچے چھپا لیا اور خود بھی بہت زیادہ نیچے جھک گئے۔ میں ان کے اس عمل سے بہت گھبرایا تھا کہ اچانک بس کا ایک ٹائر اسی گڑھے کے منہ پر آ کر پھنس گیا جہاں ہم دونوں نے پناہ لی ہوئی تھی۔ والد محترم بہت نیچے ہونے کی وجہ سے ٹائر کی چوٹ سے بچ گئے تھے۔

جس وقت ٹائر گڑھے میں پھنسا اس وقت کچھ عورتوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید وہ بھی سمجھی تھیں کہ ہم دونوں باپ بیٹا بس کے ٹائر کے نیچے آ کر کچلے گئے ہیں مگر والد محترم نے چلا کر کہا کہ "ہم دونوں اللہ کے فضل کرم سے زندہ ہیں اور صحیح سلامت ہیں۔ اور ہماری باہر نکلنے میں مدد کریں۔"

والد محترم کی آواز سن کر بس کے سب مسافروں نے اکھٹے ہو کر سڑک پر جاتی ہوئی ایک بس کو روکا اور بس ڈرائیور کو پہلے والی بس کو گڑھے سے نکالنے کی درخواست کی۔ جب کہ بس ڈرائیور نے ان کا مطالبہ مان لیا۔ اس نے بس سے فوراً اتر کر ایک رسہ نکالا اور اس کا ایک سرا اپنی بس اور دوسرا سرا پہلے والی بس کو باندھا۔ پھر بس اسٹارٹ کر کے پہلے والی بس کو گڑھے سے کافی پیچھے دھکیل دیا۔

اس کے بعد ہم دونوں باپ بیٹا باآسانی گڑھے سے باہر نکل آئے۔ ہم دونوں کو زندہ سلامت دیکھ کر تمام مسافروں نے والد محترم کو مبارک باد دی۔ عورتوں نے بڑھ کر مجھے پیار کیا اور کہا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ دونوں کی جان بچ گئی۔ ورنہ بس کے ٹائر نے آپ دونوں کو کچل ہی دیا تھا۔"

والد محترم نے تمام لوگوں اور مسافروں کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ پہلے والی بس کا ڈرائیور کہاں ہے؟" اس بس کے مسافروں نے ڈرائیور کو تلاش کرنا شروع کر دیا تو پتا چلا کہ وہ افراتفری کے وقت وہاں سے بھاگ چکا تھا۔ اس کے بعد اس بس کے مسافر پیچھے کسی دوسری بس میں سوار ہو کر چلے گئے۔

والد محترم نے مجھے ساتھ لیا اور کہا کہ بیٹا اب ہم ابھی واپس لاہور چلتے ہیں تمہیں قصور کسی اور دن لے کر جاؤں گا۔"

گھر واپس آ کر والد محترم اور میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور نوافل پڑھے اور پھر والد محترم نے گھر والوں کو یہ دونوں واقعات سنائے۔ گھر والے یہ دونوں واقعات سن کر بہت حیران اور پریشان ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت تھی کہ آپ دونوں کی زندگی بچ گئی ورنہ......!

بڑے ہو کر میں نے والد محترم سے پوچھا کہ ابا جان آپ کو گڑھے میں کودنے سے پہلے کیسے پتا چلا کہ ہم کسی حادثے سے دوچار ہونے والے ہیں۔" تو انہوں نے جواب دیا کہ معظم بیٹا! مجھے تو خود پتا نہیں چلا کہ اس گڑھے میں، میں کیسے کودا اور تمہیں کیسے دھکا دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ کوئی پُراسرار طاقت مجھ سے یہ کام کروا رہی ہے۔

ساتھیو! آج والد محترم تو اس دنیا میں نہیں رہے لیکن اُن کی بلا کی چھٹی حس مجھے آج بھی حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

☆☆......☆☆

کراچی سے تیسری حکایت

# اولڈ ہاؤس



مرزا مبشر بیگ

کہیں آپ بھی اپنے گھر کی رحمت کو اولڈ ہاؤس چھوڑنے کا تو نہیں سوچ رہے...

''جلدی کریں پاپا میں آفس کے لیے لیٹ ہو رہا ہوں!!'' عامر نے عجلت میں باپ کو پکارا۔ ابراہیم

صاحب نم آنکھوں کے ساتھ اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر عامر کی طرف چل دیے، جو اپنی گاڑی میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اُن کے بیٹھتے ہی گاڑی چلنے لگی۔ گاڑی کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد ایک مقام پر جا کر رک گئی۔ عامر نے بنا کچھ کہے، اشارے سے باپ کو اُترنے کے لیے کہا۔ وہ اپنا سوٹ کیس تھامے ہوئے چپ چاپ گاڑی سے اُتر گئے اور عامر نے اُسی خاموشی سے گاڑی اپنے آفس کی طرف رواں دواں کر دی۔

ابراہیم صاحب کے سامنے ایک بڑا سا گھر تھا۔ جس کا چوکیدار ان کا سوٹ کیس لے کر انھیں گھر کے اندر لے گیا۔ چوکیدار نے انہیں ان کا کمرہ دکھایا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی ابراہیم صاحب نے کمرہ اندر سے بند کر دیا اور ان کی آنکھوں سے اشکوں کا تھما ہوا سمندر اپنا بند توڑتا ہوا بہنے لگا اور اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

وہ کیوں نہ روتے، ان کی اکلوتی اولاد عامر انھیں آج بوجھ سمجھ کر اولڈ ہاؤس میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ روتے روتے وہ نڈھال ہو گئے اور جب اشک تھوڑے تھمے تب ابراہیم صاحب یادوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر ماضی کے اس جزیرے میں جا پہنچے۔ جب انھیں پہلی بار 'ڈاکٹر مریم' نے بیٹے کی ولادت کی خوشخبری سنائی تھی۔

ابراہیم صاحب یہ خبر سن کر پھولے نہیں سما رہے تھے اور ہر ایک سے فخریہ انداز میں اپنے باپ بننے اور بیٹے کی آمد کی خبر دے کر مبارکباد وصول کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کی اہلیہ ہما بھی بیٹے کی آمد پر فخر محسوس کر رہی تھیں۔

اس خوشخبری پر انہوں نے گھر میں ایک پارٹی منعقد کی۔ جس میں شہر کی چیدہ چیدہ اہم کاروباری شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔ ابراہیم صاحب ہر شخصیت کے پاس جا کر فرداً فرداً ان سے ملاقات کرتے تھے اور مبارکباد وصول کرتے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ ابراہیم صاحب اپنے اکلوتے بیٹے کو ایک بہت بڑا بزنس مین بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے اسے شہر کے سب سے بڑے اسکول میں داخلہ دلوایا گیا۔ عامر بہت ذہین تھا۔ اور اپنے مضامین میں ہر سال عمدہ کارکردگی دکھا کر اوّل آتا تھا۔ جب عامر تیسری کلاس میں پہنچا تب اسکول انتظامیہ کی طرف سے ابراہیم صاحب کو ایک پیغام وصول ہوا۔

''عامر تمام مضامین میں نہایت عمدہ کارکردگی دکھاتا ہے لیکن اسلامیات کے مضمون میں اس کی دلچسپی بہت کم ہے۔ برائے مہربانی والدین سے درخواست ہے کہ وہ اسلامیات کے مضمون میں عامر کے ساتھ پڑھائی میں سختی کریں۔ شکریہ۔

ابراہیم صاحب نے اس پیغام کا جواب اسکول والوں کو کچھ اس طرح دیا تھا۔

''مجھے اپنے بیٹے عامر کو ایک بڑا بزنس مین بنانا ہے اگر مولانا بنانا ہوتا تو اسے اسکول کے بجائے مدرسے میں تعلیم دلواتا۔ لہٰذا اسلامیات پاس کرنا ہی کافی ہے۔''

☆......☆......☆

دن گزرتے گئے عامر نے میٹرک کے بعد انٹر کب کیا پتا ہی نہیں چلا۔ گریجویشن میں ایڈمیشن دلوانے کے لیے ابراہیم صاحب نے پہلے سے پلان کر رکھا تھا۔ اسے IBA میں ایڈمیشن دلوائیں گے۔

عامر ذہین تھا اس لیے اس نے IBA کا ٹیسٹ با آسانی پاس کر کے وہاں ایڈمیشن حاصل کر لیا۔

تب اس جشن میں ابراہیم صاحب نے ایک بہت بڑی پارٹی منعقد کی اور پھر سے ایک بار شہر کے تمام رئیس و معزز، بزنس مین اس میں مدعو کیے گئے۔

پارٹی میں دو روز باقی تھے۔ پارٹی کی تیاریاں عروج پر چل رہی تھیں۔ گھر کو ایسے سجایا جا رہا تھا جیسے عامر کو IBA میں ایڈمیشن نہیں بلکہ IBA کی سند ملی ہو۔

آج گھر میں ہر طرف جشن کا سماں تھا۔ شہر کی باعزت اور باوقار شخصیات ابراہیم صاحب کے گھر میں موجود تھیں۔ لوگ خوب خوب مبارک باد دے رہے تھے۔ ابراہیم صاحب اور ان کی اہلیہ ہما بہت خوش تھے اور اپنے بیٹے کو بار بار دیکھ کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ان دونوں کو آج عامر پر بہت فخر محسوس ہو رہا تھا۔

اسی اثناء میں ان کا نوکر شرفو (شریف الدین) آیا اور ابراہیم صاحب سے کہنے لگا۔

"دروازہ پر ایک بوڑھا آدمی آیا ہے اور اسے آپ سے ملنا ہے۔ اپنا نام اسماعیل بتاتا ہے۔" شرفو نے ایک ہی سانس میں تمام بات کہہ دی۔

یہ نام سن کر ابراہیم صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا تھا۔ انھوں نے اپنے نوکر سے کہا کہ انھیں وہیں روک کے رکھو اور بالکل اندر مت آنے دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔" پھر کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ پارٹی سے نکل کر صدر دروازے پر پہنچے۔ گیٹ کھولنے کا اشارہ دیا تو سامنے ایک دُبلا پتلا ضعیف العمر شخص دھوتی، کرتا پہنے لاٹھی کے سہارے کھڑا تھا۔ ابراہیم صاحب نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو جانے کا اشارہ کیا۔ چوکیدار وہاں سے چلا گیا۔ تب بوڑھا شخص ابراہیم صاحب کو دیکھتے ہی زاروقطار رونے لگا اور ابراہیم صاحب کے گلے لگنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب ابراہیم صاحب نے اس بوڑھے شخص کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں کیوں آئے؟ آپ کو منع کیا تھا کہ آپ یہاں مت آئیے گا۔ اگر میرے کسی دوست نے دیکھ لیا تو میں انھیں کیا جواب دوں گا؟ پلیز 'پاپا' آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں ایک بہت بڑا بزنس مین ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو آپ کے بارے میں پتا چلے کہ میں ایک معمولی کسان کا بیٹا ہوں۔ پلیز پاپا' آپ جائیں یہاں سے......"

بوڑھا شخص خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا اور پھر اس کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔

ابراہیم صاحب نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر بوڑھے باپ کے ہاتھ پر رکھ دیے اور انھیں جانے کے لیے کہا۔ بوڑھے نے پیسے واپس کر دیے اور بنا کچھ کہے وہاں سے چلے جانے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ اور ابراہیم صاحب دوبارہ اپنے دوستوں میں آکر عظیم پارٹی انجوائے کرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

سال پَر لگا کر اڑتا رہا۔ ہما اب بہو لانے کی تیاریوں میں مشغول ہو چکی تھیں۔ عامر بھی اپنی پڑھائی کر کے ایک بہت بڑا بزنس مین بننے کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا۔

ایک امیر گھرانے سے بہو کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ سیٹھ واجد (جو شہر کا بہت بڑا رئیس تھا) کی بیٹی انزیلہ واجد سے عامر کا رشتہ طے پا گیا۔

رشتہ ہو جانے کے کچھ ماہ بعد ہما بیگم کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی اور وہ کچھ دن کی علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اہلیہ کی موت کے بعد ابراہیم صاحب بہت اکیلے ہو گئے تھے اور سال بعد ہی وہ عامر کی شادی کر کے بہو کو گھر لے آئے۔

☆......☆......☆

امیر گھرانے کی بہو ہائی ایجوکیشن یافتہ تھی۔ ابراہیم صاحب اسے ایک پل نہیں بھاتے تھے۔ ابراہیم صاحب کو بہو کا گھر سے باہر رہنا اور جاب کرنا پسند نہیں تھا۔ اسی وجہ سے گھر میں ایک سرد جنگ سی چھڑی رہتی ہے۔ انزیلہ نے عامر سے صاف صاف سے کہہ دیا تھا کہ آپ کے پاپا بہت دقیانوسی خیالات کے مالک ہیں۔ یا تو آپ مجھے چھوڑ دیں یا اپنے پاپا کا کہیں اور انتظام کر دیں۔ عامر اور انزیلہ میں ابراہیم صاحب کی وجہ سے لڑائی رہنے لگی تھی۔

بالآخر روز روز کی ٹینشن سے نجات حاصل کرنے کے لیے انزیلہ کی خوشی کی خاطر عامر نے ابراہیم صاحب کو اولڈ ہاؤس میں منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور دوسرے دن صبح ہی وہ اپنے والد کا سامان پیک کر کے انھیں ان کی مستقل جگہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ان سے دور چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ابراہیم صاحب یادوں کے سمندر سے باہر نکل کر اصل دنیا میں واپس آگئے۔ دروازہ کھولا تو دروازے کے باہر ابراہیم صاحب کی طرح کئی اور والدین انھیں اپنے اس نئے گھر میں ویلکم کہنے کے لیے موجود تھے۔ ابراہیم صاحب کو دیکھ کر سب خوش تھے کہ اولڈ ہاؤس میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور پھر سب ابراہیم صاحب کو لے کر کھانے کی ٹیبل تک لے گئے۔ اسی طرح کے حالات سے ہم لوگ بھی دوچار ہیں۔ قارئین! کہیں آپ بھی تو اپنے گھر کی رحمت کو اولڈ ہاؤس آباد کرنے کا تو نہیں سوچ رہے؟

☆☆......☆☆

چارسدہ سے چوتھی حکایت

# کیسی محبت؟



جواد احمد



چارسدہ سے ایک عام لڑکے کی بہت خاص لو اسٹوری، جو آپ کو چونکا دے گی

وہ ایک سیدھا سادا لڑکا تھا۔ نہ بد صورت نہ ہی خوب صورت، نہ بہت سی صلاحیتیں رکھنے والا ہیرو اور نہ ہی کلی طور پر صلاحیتوں سے محروم زیرو۔ اس کی ہر چیز، ہر بات ہر خصوصیت متوسط درجے کی تھی۔ وہ متوسط گھرانے کا چراغ تھا۔ مستقبل میں ایک اچھا مقام چاہتا تھا۔ لیکن اس مقام پر اسے پہنچنے کا شوق تھا۔ وہ کسی کی جان بوجھ کر دل آزاری نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر کسی کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں میں محبت بانٹتا تھا۔ ہر کسی کی معمولی خواہشات کو تکمیل پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی یہی باتیں اسے ہر دل عزیز رکھتی تھیں۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اور وہ لوگوں کو پسند کرتا تھا۔

محبت بانٹنے والے متوسط خصوصیات کے حامل اس لڑکے کا نام یاسر تھا۔

لوگوں کے علاوہ خدا سے بھی اس کا تعلق متوسط درجے کا تھا۔ وہ خدا سے محبت کرتا تھا، خدا سے ڈرتا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند تو نہ تھا لیکن پھر بھی اکثر مسجد کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ روزے بھی اس کے بہت کم چھوٹتے تھے۔

وہ جس طرح کا تھا اس کے دوستوں کا کہنا تھا کہ جلد ہی اسے کسی لڑکی اور کسی لڑکی کو اس سے محبت ہو جائے گی اور وہ ہنس دیتا۔

''فلموں نے تم لوگوں کے ذہن کو بگاڑ دیا ہے۔ لڑکا اور لڑکی کی محبت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ تو نوجوانوں کے وقت گزارنے کا مشغلہ ہے اور کچھ نہیں۔''

کچھ دوست اس کی بات سن کر خاموش ہو جاتے کچھ مد مقابل دلیلیں دیتے اور کچھ جرح کرنے پر اتر آتے لیکن اس کا ذہن نہ بدلتا۔

''تو پھر تمہارے خیال میں محبت کا وجود نہیں۔''

''میری جان میں محبت کے وجود سے انکاری نہیں۔ اس کائنات کے ذرے ذرے میں محبت ہے۔ اگر محبت کہیں نہیں ہے تو وہ دو نامحرموں کے درمیان نہیں ہے۔'' وہ سعد کے کندھوں کو دباتے ہوئے محبت پاش لہجے میں کہتا تھا۔ سعد بہت کچھ کہنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہ پاتا۔ دراصل سعد کو کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اگر یاسر کی فلاسفی درست ہے تو وہ کیا چیز ہے جو اس کے دل میں زینب کے لیے ہے۔ زینب اس کے لیے دن تھی، رات تھی، صبح تھی شام تھی۔ سانس تھی، دھڑکن تھی الغرض زینب سعد کے لیے سب کچھ تھی تب سے جب سے اس نے شعور کی منزلیں طے کرنا شروع کی تھیں۔ یاسر سعد کے دلی جذبات سے واقفیت رکھتا تھا۔ لیکن وہ ان چیزوں کا قائل نہ تھا۔ اب دوست کو خفا اور

دل برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے تو بالواسطہ کچھ نہ کہتا البتہ بالواسطہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

☆......☆......☆

تھوڑا وقت مزید سرک گیا۔ اور گریجویشن کی تکمیل کے بعد یاسر نے یونیورسٹی میں قدم رکھا۔ جب اس نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تب بھی اس کی محبت فلاسفی وہی تھی۔ ساری فلاسفی اور سارے کے سارے خیالات دھرے کے دھرے رہ گئے، جب ملیحہ پر اس کی پہلی نظر پڑی تھی۔

کتنے دن وہ جھٹلاتا رہا، اپنے آپ کو سمجھتا رہا، لیکن سب بیکار گیا۔ اسے تسلیم کرنا ہی پڑا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ ایک نامحرم سے محبت، پہلی نظر کی محبت اب اسے کیا کرنا ہے۔ اسے پتا نہیں تھا ہاں البتہ سعد سے وہ نظریں چرانے لگ گیا۔

''جب محبت ہوتی ہے تو یہ محرم اور نامحرم کے چکر ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ محبوب کا خیال آپ کے دماغ کے لیے اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے آکسیجن۔'' سعد کی کافی عرصہ پہلے کہی بات شاید اسی لیے اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی کہ اسے اس بات پر یقین آنا تھا۔

اس رات وہ آدھی رات تک جاگتا رہا۔ رات بھر جھٹلانے کے بعد جب وہ تھک گیا۔ اس نے مان لیا۔

''مجھے ملیحہ سے محبت ہو گئی ہے۔''

☆......☆......☆

توجہ تعلیم کی طرف ہوتی ہی نہ تھی۔ ملیحہ کا خیال ذہن سے چپکے رہتا۔ ملیحہ جس طرف ہوتی، نگاہیں خود بخود اس طرف بھٹک جاتیں۔ اب ملیحہ سے کس طرح بات کی جائے اور کس طرح حالِ دل بتایا جائے ابھی یاسر کوئی راہ ڈھونڈ نہ پایا تھا کہ ملیحہ نے خود ہی اسے مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ کبھی کوئی نوٹس مانگتے ہوئے، کبھی کوئی لیکچر ڈسکس کرنا ہوتا تو کبھی یونہی...... نشستیں لمبی ہونے لگیں۔ کینٹین کے چکر لگنے لگے۔

ملیحہ ذہین تھی۔ تھوڑی آزاد خیال تھی۔ لڑکوں کے ساتھ بیٹھنے کو، ان سے گپیں لگانے کو معیوب نہ سمجھتی تھی۔ کیوں کہ خوبصورت تھی اس لیے کلاس کے جس لڑکے کے ساتھ دوستی کرنا چاہتی کر سکتی تھی۔ لیکن آخر اس نے یاسر کو ہی کیوں چنا؟ اس کا جواب بھی یاسر کو چند ہفتوں میں مل گیا۔ یاسر نے ملیحہ کی آنکھوں میں

اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات جو دیکھ لیے تھے۔

☆......☆......☆

سعد قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ زینب سے اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ یاسر بھی کسی کو راز داں بنانا چاہتا تھا۔ اپنے خوش ہوتے دوست کو دیکھ کر اس نے ملیحہ کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ سعد کی آنکھیں۔ سعد کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔

''چھپے رستم مان لیا نا محبت کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔'' سعد نے کہا تو وہ جواب نہ دے سکا۔

''اچھا تو پھر تم ملیحہ سے کتنی محبت کرتے ہو؟''

''کتنی؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''جتنی کہ ممکن ہے۔'' چند لمحوں بعد اس نے کہا تھا۔

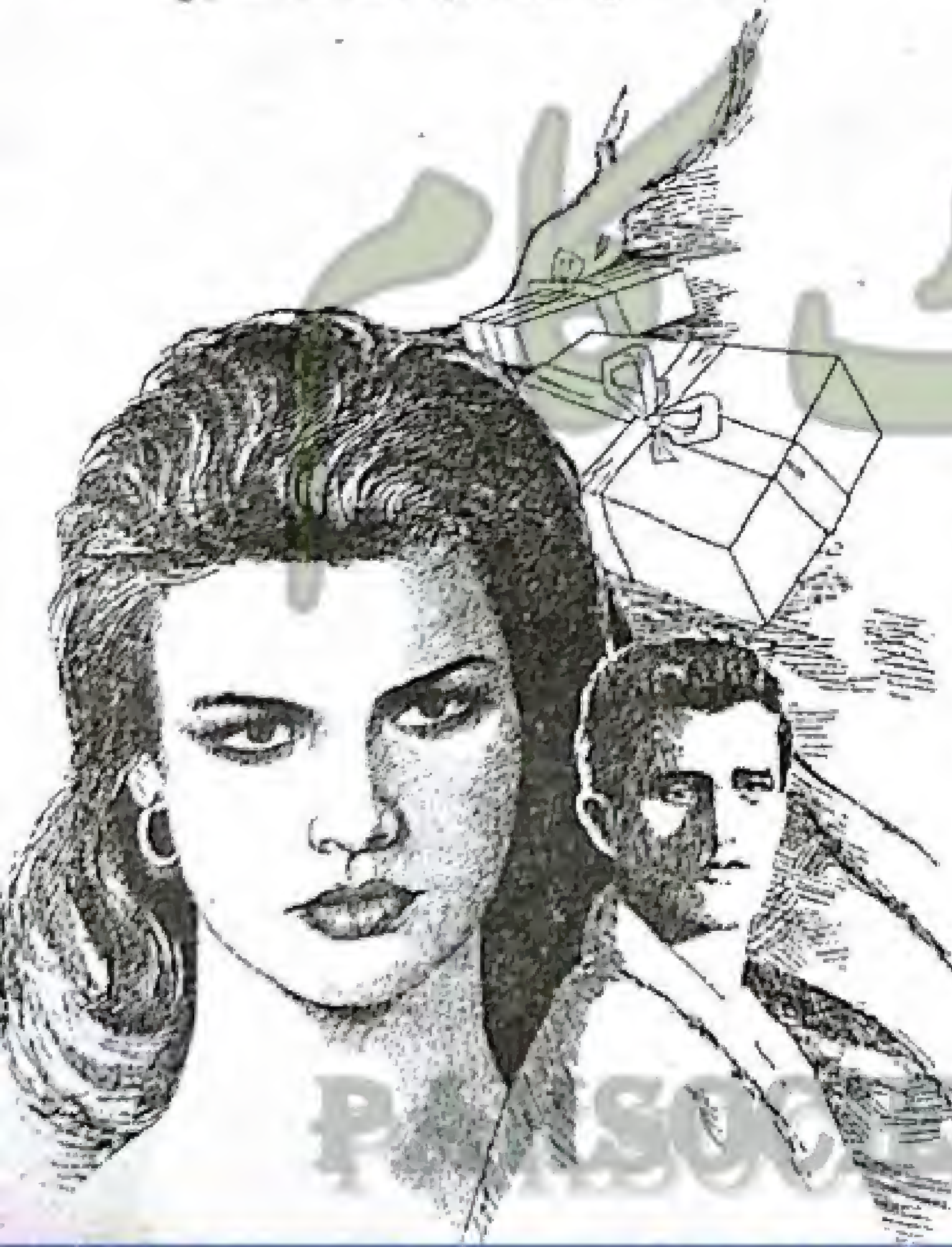
''کتنی ممکن ہے؟'' سعد پتا نہیں کیا اگلوانا چاہتا تھا۔

''یہ کیسا سوال ہے بھلا؟'' وہ زچ ہونے لگا تھا۔

''اچھا فرض کرتے ہیں کہ اگر تمہیں ملیحہ نہیں ملتی، اس کا تمہارا شریکِ سفر بننا قسمت میں نہیں......''

''چپ کرکے بیٹھو ایویں قسمت میں نہیں۔'' اس نے سعد کی بات کاٹی تھی۔ وہ ناراض ہونے لگا تھا۔

''اچھا یار ناراض مت ہو بس اتنا بتاؤ کہ اگر تمہیں



ملیحہ نہیں ملتی تو کیا ہوگا۔'' سعد نے پُر اشتیاق نگاہوں سے اپنے یار کو دیکھا تھا۔

''مچھلی کو پانی نہ ملے تو کیا ہوتا ہے، بس مجھے اگر ملیحہ نہ ملی تو میرے ساتھ بھی وہی ہوگا۔''

☆......☆......☆

پہلے سال کا نتیجہ خوش کرنا والا تھا۔ وہ اور ملیحہ دونوں ہی اپنے رزلٹ سے خوش اور مطمئن تھے۔ کینٹین میں اپنی خوشیوں کو بیٹھے سیلیبریٹ کر رہے تھے۔ اور آج کے دن کو ہی یاسر نے اظہارِ محبت کے لیے چنا تھا۔

''مجھے تم سے محبت ہے، بہت چاہتا ہوں تمہیں شادی کرو گی مجھ سے۔ اس کی بات سن کر ملیحہ کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ لمحے بھر رُکا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے پیٹیز کا وہ ٹکڑا دوبارہ منہ کی طرف دھکیل دیا اور مسکرانے لگی تھی۔

''اتنی دیر کردی کہنے میں۔'' ملیحہ کا جواب اُسے سر سے پاؤں تک سرشار کر گیا۔

''ہاں میں شادی کروں گی تم سے، کیوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن......'' ''کیا لیکن؟''

''لیکن کہ تمہیں اعتراض ہوگا۔''

''مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''میں مسلمان نہیں ہوں، پارسی ہوں۔'' ملیحہ نے ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے کہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا سموسے کا ٹکڑا دوبارہ پلیٹ میں گر گیا تھا۔ اس نے بے یقین نظروں سے ملیحہ کو دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے ہر عضو سے شکوہ جھلکتا تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی دو زانو مسجد میں بیٹھا تھا۔ وہ آج خدا سے شکوہ کرنے آیا تھا۔ لیکن شکوہ کرنے کے لیے الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہی نہ تھے۔ ہاں البتہ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ اور وہ رو دیا۔

''آج کے دور میں مہذب کا فرق کیا معنی رکھتا ہے۔ اتنا تنگ نظر ہونے کی کیا بات ہے۔'' ملیحہ کہہ رہی تھی اور وہ اسے دیکھنے لگا۔ ''کیوں نہیں رکھتا معنی، مذہب زندگی ہے۔ آخرت ہے، سب کچھ ہے۔''

''تو میں تمہیں کب پارسی ہونے کا کہہ رہی ہوں۔ تم اپنے مذہب پر قائم رہو اور میں اپنے مذہب پر۔ خوش!''

''خوش۔!!'' اس نے ملیحہ کے الفاظ کو غیر ارادی طور پر دہرایا تھا۔

''تم مسلمان ہو جاؤ۔ پلیز۔''

''کس لیے؟ تم سے شادی کرنے کے لیے؟''

وہ چپ کر گیا جواب نہ بن پڑا۔

''میں کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کرسکتا۔''

''اور وہ محبت جو تم مجھ سے کرتے ہو۔''

''اس محبت کا کیا کروں جو مجھے خدا سے دور کرے۔''

''میں تمہیں خدا سے دور نہیں کر رہی یاسر۔'' ملیحہ کا لہجہ عاجزانہ ہوتا گیا۔

''تم تو جانتی تھیں کہ میں مسلمان ہوں، اپنے پارسی ہونے کی بات تم نے جان بوجھ کر چھپائی تھی نا۔''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ میں تمہیں کھو دوں گی۔''

''تم نے اچھا نہیں کیا ملیحہ۔'' وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اور ملیحہ سوچنے لگی تھی کہ وہ اسے کس طرح قائل کرے گی۔

خوب رو لیا تو خود ہی چپ کر گیا۔ دل ضرور مغموم تھا۔ لیکن یہ اطمنان حاصل تھا کہ اس نے خدا کی محبت پر ایک نامحرم کی محبت کو ترجیح نہیں دی۔

☆......☆......☆

سعد کی شادی تھی زینب کہ ساتھ۔ مسکراہٹ سعد سے جدا ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کی خوشیوں میں شریک ہونے آیا تھا۔ نکاح کے بول پڑھے گئے۔ قبول ہے، قبول ہے کے بعد مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

اور جب وہ سعد کو اسٹیج پر مبارک باد دینے گیا تھا۔ تب سعد نے اس کے کان میں کہا تھا میں نے تو اپنے لیے آکسیجن کا بندوبست کرلیا ہے۔ بول میری مچھلی تو کب پانی سے پکی یاری لگا رہی ہے۔'' وہ مسکرا دیا اور جواب دیے بغیر پلٹ آیا۔

ملیحہ کو وہ چھوڑ چکا ہے۔ اس وقت سعد کو یہ بتانا مناسب نہ تھا۔

اس طرح متوسط خصوصیات رکھنے والے عام سے لڑکے کی محبت کی، عام سی کہانی انجام کو پہنچی۔

☆......☆......☆

واہ کینٹ سے پانچویں حکایت

# ساتویں بہن

احتشام انور

جیون کے رنگ سب کے لیے رنگ نہیں ہوتے
کسی کے لیے یہ رنگ ہر سو اندھیرے بھی بھر دیتے ہیں



میں چھ بڑی بہنوں کے بعد پیدا ہونے والی اپنے والدین کی ساتویں اولاد ہوں، میری پیدائش کیا تھی بس جیسے زندگی نے جینے کا ایک نیا ڈھنگ سیکھ لیا تھا، پورا گھر ہی ایک جشن منانے میں مست تھا یہاں تک کہ میرے والد کی لاڈلی بیوی جو میری پیدائش کے گھاؤ سے بری طرح گھائل تھی، کسی نے اس کی جانب بھی توجہ نہیں کی اور نہ ہی صحیح طریقے سے تیمار داری کی۔ میری پیدائش نے گھر والوں کی ترجیحات بھی بدل دی تھیں، میرے والد کو والدہ کی طبیعت کی سنگینی کا احساس تب ہوا جب زخم نے ناسور کی شکل اختیار کر لی اور میری بہنیں بھی بس سب کچھ بھول گئی تھیں کیوں کہ میرا آنا ان کی زندگی کا جواز بن گیا تھا ورنہ تو وہ بے چاریاں دادا، دادی، چاچا، پھوپو کے اکثر اور کبھی کبھی مایوس ابا جان کے طنز کا نشانہ بنتیں یہ باتیں مجھے بہت آہستہ آہستہ معلوم ہوتی گئیں۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا میرے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو میری سمجھ میں بہت کچھ آنا شروع ہو گیا۔

بہر حال، میری تربیت خاص کی ذمہ داری دادی نے اس اعلان کے ساتھ اٹھائی کہ بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے معصوم بچہ رُل جائے گا، اس لیے مجھے ہی اس کی دیکھ بھال کرنی ہوگی اور دادا نے کہا کہ میں بھی چونکہ فارغ ہی ہوتا

ہوں اس لیے کی دیکھ بھال میں تمہاری ماں کی مدد کر دیا کروں گا۔ اور میری ماں جس نے مجھے پیدا کیا تھا میری شکل تک دیکھنے کو ترس گئی میں کبھی دادا، کبھی دادی، کبھی پھوپو تو کبھی چاچا کی تفریح طبع کا ذریعہ بنا رہا، میری بہنیں دور سے مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتیں پر انہیں اجازت نہیں تھی کہ وہ مجھے گود میں لیں یا میرے ساتھ کھیلیں کہ وہ لوگ تو منحوس تھیں کہیں ان کی نحوست مجھ پہ نہ پڑ جائے۔

اور پھر آہستہ آہستہ میرا گھر دو گروہ میں بٹ گیا، ایک گروہ جو میرے دادا، دادی، ابا جان، پھوپو اور چاچا پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا گروہ بدنصیب لوگوں کا تھا جن میں میری بدنصیب ماں جس کا گناہ اس کی پے در پے چھ بیٹیاں تھیں اور ان کے ساتھ وہ چھ لڑکیاں بھی، خیر زندگی اپنی اپنی جگہ دونوں گروہ کی گزر رہی تھی کیونکہ اس نے تو گزرنا ہی ہوتا ہے پھر یہ ہوا کہ ایک ہی ہلے میں پھوپو اور چاچا کی ایک ساتھ ہی شادیاں کہ چاچا کے ولیمے میں پھوپو کی بارات سے جیسے گھر کی چہل پہل آدھی رہ گئی تھی یوں بھی میری بہنیں تو اس گھر میں ایسے رہتی تھی جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو خیر چاچا شادی کے بعد الگ رہنے لگے۔ جب کچھ عرصے بعد ہی پہلے دادی پھر دادا اپنی قضا پہ لبیک کہتے ہوئے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔۔۔۔ پھر جیسے پورا گھر ہی جیسے خالی ہو گیا تھا سائیں سائیں کرتا خالی گھر ایک عجیب وحشت زدہ مقبرہ محسوس ہوتا تھا۔

میری پیدائش کے بعد ابا جان نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کر لیا تھا کہ بچوں کی وجہ پریشانی ہوتی ہے سکون نہیں ملتا جس پر دادی نے اپنے برابر والا کمرہ فوراً تیار کروا دیا اور ابا دفتر سے واپس آ کر کھانا کھاتے وقت کچھ بات اماں سے کر لیتے تو کر لیتے ورنہ دادا اور دادی کے ساتھ ہی وقت گزارتے یہی ان کے روز کے معمولات تھے اور میری ماں تو جیسے اللہ میاں کی گائے تھی کبھی جو حرفِ شکایت زبان تک لائی یہاں تک کہ اپنی فطرت ضرورت کو بھی خود میں دفن کر لیا اور سارے گھر والوں کی بغیر تنخواہ کے نوکر بن گئی تھی۔ خیر دادا دادی کے گزرنے کے بعد ابا جان اکثر دفتر سے واپسی پہ گھر میں موجود ہو کر بھی بے گھر ہوتے تھے، ان کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اماں اور بہنوں کے کمرے میں چلے جائیں وہ سارے گھر میں یونہی بولائے بولائے پھرتے تھے کبھی دادا دادی کے کمرے میں تو کبھی ڈرائنگ روم میں تو کبھی اپنے کمرے میں لیکن اس طرح بے گھری کی زندگی گزارنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

آخر ایک روز بغیر کسی شرم و حیا کے انہیں میری ماں یاد آ گئی اور وہ جنم جلی مشرقی عورت اپنی بے گھری بھول کر اپنے بے یار و مددگار مجازی خدا کی پہلے ہی کی طرح بندگی میں جت گئی۔ بدبخت عورت......

خیر ابا جان پھر سے ہم سب کے یعنی صرف میرے نہیں بلکہ اپنے پورے سات بچوں کے رکھوالے بن گئے۔ اپنی ماں بہنوں کے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کا میں عینی شاہد تھا، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ساری زیادتی میری وجہ سے ہوتی رہی ہے۔ یعنی میرے ددھیالی رشتہ داروں کو اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے ایک لڑکے کی ضرورت تھی تو میری پیدائش سے وہ ضرورت پوری ہو گئی۔

میرا ناپختہ ذہن ایک عجب کشمکش میں مبتلا رہتا تھا کہ میں کیا ہوں؟ میں کون ہوں؟ کہ جس نے اس گھر کی ہیئت ہی بدل ڈالی، پھر میں نے نہ جانے کیا کیا سوچنا شروع کر دیا۔ جس نے میری آئندہ کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مجھے اپنے ددھیالی رشتہ داروں کی محبت میں جانے کیوں کھوٹ نظر آتی تھی اور میں کھسیا جاتا تھا ان کے بے جا لاڈ پیار سے یا جب وہ میرے خوامخواہ ناز اٹھاتے کہ بیٹا آرام سے دیکھ کر چلو تم سے ہی ہماری آئندہ نسل کی آس ہے اور میں سوچتا کہ یہ آس کیا ہوتی ہے اگر یہ آس نہ ہوتی تو کیا یہ سب میری بہنوں کی مانند مجھے بھی درخورِ اعتنا رکھتے یا یوں ہی مجھ سے محبت کرتے......؟

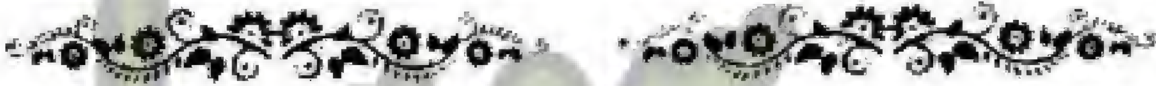
خیر پھر جب مجھے باتیں سمجھ میں آنے لگیں تو پھر جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ میری ماں اور بہنیں اپنے ناکردہ گناہ کی سزا کاٹ رہی ہیں اور میرے والد سمیت پورے ددھیالی رشتے دار اس ظلم میں برابر کے شریک ہیں تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اس ناکردہ گناہ کی سزا دینے والوں کو نہیں چھوڑوں گا کہ انہیں اس کا حساب بہرحال دینا ہوگا۔ اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں انتقام لوں گا ایک ایسا انتقام کے میرے ددھیالی رشتے دار ہوں یا بظاہر میرے معصوم سے ابا جان ان سب کے اوسان ہی خطا ہو جائیں گے اور پھر میں نے انتقام لے لیا ایک ایسا انتقام کہ جس کی کوئی مثال نہیں یعنی میں اپنی چھ بہنوں کی ساتویں بہن بن گیا۔

☆☆......☆☆

# جائے پناہ ہے کہاں؟



الماس فاطمہ ارمان



اُس کی مالکن نے اپنا گناہ اُس غریب کے سر ڈال کر اُسے عمر قید کرادی تھی

رات دھیرے دھیرے ڈھل رہی تھی آج اُسے دسواں روز تھا جیل کی سلاخوں کے پیچھے۔ تمام عورتیں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ اُن کا سکون دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے وہ سات پشتوں سے یہاں رہ رہی ہوں مگر سکھاں اب تک جاگ رہی تھی۔

آج سحری کے لیے اپنے کیبن میں سب کو اٹھانے کی باری اُس کی تھی۔ سکھاں کو اپنا گاؤں اور بہن بھائی ماں باپ یاد آ گئے۔

وہ لالہ موسیٰ کی رہنے والی تھی۔ اُس کا گاؤں بھی شہر کی طرح لگتا تھا۔ ہر چیز کی سہولت تھی۔ صبح سحری میں اُس کے ابا گرم گرم پراٹھے اور حلوہ لے کر آتے۔ اماں ابا نماز روزے کے بہت پابند تھے۔ سولہ سال کی عمر میں اُس کی شادی موسیٰ سے ہوگئی۔ موسیٰ اُس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ موسیٰ اُس سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ سکھاں جس کا نام سکینہ بی بی تھا، اچھے نین نقش، گوری رنگت والی ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ موسیٰ اور اُس کا کوئی جوڑ نہیں تھا، بس غربت کی وجہ سے موسیٰ اُسے لے کراچی آ گیا۔ وہ کلفٹن کے ایک بنگلے میں چوکیداری کرتا تھا۔ بچپن سے ہی وہ اس سیٹھ کے ساتھ رہتا تھا۔ سیٹھ نے اُسے رہنے کے لیے سرونٹ کوارٹر دیا ہوا تھا تاکہ وہ دونوں آرام سے رہیں۔ موسیٰ کے ساتھ ساتھ سکھاں بھی گھر کے کام کاج میں سیٹھ کی بیوی فوزیہ کا ہاتھ بٹاتی۔ دونوں اپنی دنیا میں مگن تھے مگر انسان محبت واعتبار کر کے ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔ آج کے دور میں انسان انسان پر اعتبار کرنے کے لائق نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کس پر اعتبار کر رہا ہے۔ موسیٰ سکھاں سے بہت محبت کرتا تھا۔ سکھاں کا رنگ روپ موسیٰ کی محبت کی چھاؤں میں اور بھی نکھر گیا تھا۔ وہ کہیں سے بھی گاؤں کی نہیں لگتی تھی۔

فوزیہ اُسے اپنے پرانے اچھے کپڑے پہننے کے لیے دیتی تھی۔ وہ کپڑے پہن کر، بن سنور کر فوزیہ کے ساتھ کہیں جاتی تو وہ اُس کی بیٹی ہی لگتی تھی۔ فوزیہ نے سکھاں کو اپنا اتنا گرویدہ بنالیا کہ وہ اس پر جان بھی دینے کے لیے تیار تھی۔

فوزیہ کے کسی اور آدمی سے تعلقات تھے، اس بات کا سکھاں کو بھی علم تھا۔ کیونکہ فوزیہ نے اُسے خود سے اتنا قریب کرلیا تھا کہ سکھاں اُس کی زندگی کے شب و روز تک کا علم رکھتی تھی۔ فوزیہ کے دو بچے تھے ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ دونوں اسٹڈی کے لیے دوسرے ملک میں تھے۔ جب سیٹھ شکیل آفس چلا جاتا تو فوزیہ فون کر کے اپنے آشنا کو گھر بلالیتی اور وہ بھی معمول کی طرح ایکسٹرا Key سے پچھلے دروازے کو کھول کر بیڈ روم میں آجاتا اور پھر نفس کے تمام تقاضے پورے ہوتے۔ اُدھر سکھاں گیٹ پر بیٹھ کر موسیٰ سے گپ شپ کرتی تاکہ اُسے کوئی شک نہ ہو اور اس کے علاوہ سیٹھ کی گاڑی بھی اس ہی دروازے سے داخل ہوتی تھی۔

وقت گزرتا گیا سکھاں فوزیہ کے راز میں شامل رہی۔ وہ گاؤں کی سیدھی سادھی لڑکی تھی، اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ اس راز کی وجہ سے بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائے گی۔

☆......☆......☆

''کافی دن سے یہ بات سننے میں آرہی تھی کہ بچے واپس پاکستان آ رہے ہیں۔ فوزیہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ آئیں کیونکہ اُس کا بیٹا ریحان بہت ہی غصے والا تھا، اُسے ڈر تھا کہ اُسے فوزیہ کا کوئی راز نہ پتا چل جائے۔ سکھاں نے اسے سمجھایا کہ تم کہیں باہر ہوٹل میں اُس سے مل لینا۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر ریحان بہت شکی ہے، اُسے مجھ پر بچپن سے شک ہے۔'' وہ اپنے ہی ڈر سے اُلجھتی رہی اور آخرکار بچے پاکستان آ گئے۔

ریحان بہت غصے والا تھا۔ ہر چیز اُسے ٹائم پر چاہیے تھی۔ فوزیہ ہر وقت اُس کے لیے اینٹنشن رہتی۔ وہ باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ کچھ دن گھر میں رہنے کے بعد وہ پاپا کے ساتھ فیکٹری جانے لگا تاکہ وہ بھی کاروبار کو سمجھ سکے۔ فوزیہ کو پھر موقع مل گیا اور اُس کا آشنا پھر سے اُس سے ملنے آنے لگا۔ سکھاں نے اُسے سمجھایا بھی کہ باجی تم اس بندے کو گھر مت بلاؤ، خطرہ ہے باہر مل لو۔''

''نہیں بھئی باہر نہیں مل سکتی، باہر زیادہ تر لوگ مجھے سیٹھ کی بیوی کے طور پر جانتے ہیں۔'' وقت گزرتا گیا مگر ایک نہ ایک دن یہ راز پتا چلنا تھا۔ ریحان کو کسی طرح شک ہوگیا اور اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ ماں کے ساتھ اس کھیل میں سکھاں بھی برابر کی شریک ہے۔ بس وہ ٹوہ میں لگ گیا۔

پھر وہ وقت بھی جلد ہی آ گیا۔ ریحان اُس وقت گھر میں داخل ہوا جب وہ شخص گھر میں داخل ہوا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چل سکا مگر سکھاں نے ریحان کو پچھلے دروازے سے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جلدی سے فوزیہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ابھی فوزیہ سنبھل بھی نہ پائی تھی

کہ ریحان اندر داخل ہوگیا۔ فوزیہ بہت ہی چالاک تھی۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے بیڈ پر سکھاں کو دھکا دے دیا اور ساتھ ہی اُس کا گریبان بھی چاک کر دیا تاکہ ریحان یہ سمجھ سکے کہ اُس کی ماں نہیں بلکہ بستر پر سکھاں تھی۔ سکھاں اِس افتاد سے سنبھل بھی نہ سکی۔ ریحان کمرے میں داخل ہوگیا۔ فوزیہ دوسرے راستے سے کچن میں داخل ہوگئی۔ ریحان نے پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اُس شخص کے پیٹ میں اُتار دی۔

اتنے میں فوزیہ کو موقع مل گیا۔ اُس نے شور مچا کر موسیٰ اور مالی بابا وغیرہ کو مدد کے لیے بلالیا۔ پولیس کو کال بھی کر دی۔ اُسے اب ریحان کو پھانسی کے پھندے سے بچانا تھا کیونکہ وہ اُس کی اولاد تھی اور سکھاں نوکر کی بیوی۔

اُس نے پولیس کو بیان دیا کہ مجھے نہیں معلوم یہ آدمی کون ہے۔ میں سکھاں پر بیٹی کی طرح بھروسا کرتی تھی۔ آپ دیکھ رہے ہیں ہمارے گھر وائٹ واش ہوا ہے۔ میں نے سکھاں سے کہا تھا میرے کمرے کی صفائی کردو۔

مجھے پھیلا ہوا گھر برا لگتا ہے۔ میں تو دوسرے کمرے میں تھی۔ میں نے سکھاں سے پوچھا اندر کمرے میں کون ہے اُس نے بتایا کہ اندر رنگ کرنے والا ہے۔

میں اُس کے ساتھ مل کر کمرہ سمیٹ رہی ہوں۔ آپ اُسے کچھ اوپر سے پیسے دے دینا۔ ٹھیک جب کام ختم ہوجائے تو بتا دینا۔ میں ابھی شور کی آواز سُن کر آئی ہوں۔ میرا بیٹا ریحان بھی آ گیا۔ ہم دونوں نے دیکھا کہ رنگ والا سکھاں سے زبردستی کررہا تھا۔ ریحان اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے سکھاں نے اُس کے پیٹ میں چھری اُتار دی۔ یہ دیکھیے چھری بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔''

فوزیہ نے ریحان کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے نکل جائے، ریحان جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔ وہ ماں کی چال سمجھ گیا۔ مگر کیا کرتا، اگر وہ سچ بولتا تو چودہ سال کی قید کاٹنا۔ اس لیے اُس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ سکھاں کو پولیس نے جیل میں بند کر دیا۔

موسیٰ چیختا رہا۔ ''نہیں میری سکھاں ایسی نہیں۔'' مگر غریب کی کون سنتا ہے۔ سکھاں نے بھی منہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ کیا کہتی، اُس کی کون سنتا۔ اس طرح اُسے جیل ہوگئی کچھ عرصے موسیٰ اُس سے ملنے آتا رہا پھر نہ جانے وہ بھی کہاں غائب ہوگیا۔ پتا نہیں کتنی عیدیں اسی طرح گزر گئیں۔ ہر عید پر سکھاں روتی آنکھوں سے موسیٰ اور اپنے باپ کا انتظار کرتی کہ شاید ابا اُس سے ملنے آ جائیں۔ ابا تو نہیں آئے مگر اُن کی موت کی خبر گاؤں سے آئی۔ وہ مہینہ بھی رمضان کا تھا، جب اُس کا باپ منوں مٹی تلے دب چکا تھا۔

وہ عید پر ابا اور ماں کو یاد کر کے بہت روئی۔ موسیٰ بھی بہت یاد آتا رہا۔ اُس نے اپنے طور پر موسیٰ کا پتا کروایا۔ کچھ لوگوں نے اُسے بتایا کہ وہ نشے کے انجکشن استعمال کرتا تھا، شاید غلط دوا استعمال کرنے کی وجہ سے مر گیا۔ وہ موسیٰ کو بہت یاد کرتی تھی۔ موسیٰ اُسے بہت چاہتا تھا۔ ہر عید پر اُسے بازار لے کر جاتا، اُس کے پسند کے کپڑے، چپل ہر چیز اُس کی مرضی سے دلاتا۔ جب وہ عید پر تیار ہوکر اُس کے سامنے جاتی تو وہ بس یہی کہتا۔

''اب تُو موسیٰ کی دلہن لگ رہی ہے۔ بس تُو ہمیشہ اسی طرح بجی سنوری نظر آیا کر۔ تُو میری زندگی ہے۔''

وہ شاید سکھاں کا دکھ برداشت نہ کرسکا۔ سکھاں کا جیل میں سب کے ساتھ اچھا سلوک تھا، اس لیے سب اُس کی عزت کرتے۔

ماہ و سال گزرتے گئے، سکھاں کی دو سال کی سزا بھی معاف کر دی گئی۔

سکھاں قید سے رہا ہوگئی۔

جیل کے بڑے سارے آہنی گیٹ سے نکل کر جب اُس نے کھلے آسمان تلے آزاد ہوا کو محسوس کیا تو اُسے لگا وہ ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں آ گئی ہے۔ اُس کے قدم تیزی سے ایدھی ہوم کی جانب اُٹھ رہے تھے۔ ہر جگہ گدھ ہیں، ہر جگہ عفریت بھری چڑیلیں نفس کی پیاس میں زبانیں باہر نکالے کھڑی تھیں۔ مگر پھر بھی خدا نے جائے پناہ رکھی ہے۔ اور وہ اُسی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

☆☆......☆☆

# خوش ہو کے بھنور باندھ لیے

ثمینہ طاہر بٹ

اُس شخص کی زندگی کا مآل، جو بے جرم ہو کر بھی مجرم کی طرح زندگی گزار رہا ہے

کہتے ہیں یہ معاشرہ مردوں کا ہے اور اس معاشرے میں عورت ہمیشہ سے ہی مظلوم رہی ہے۔ بیچاری "مظلوم" معصوم، شکست خوردہ، قابل رحم، اور مظلومیت کی تصویر...... مگر کسی نے شاید یہ بھی نہ سوچا ہوگا کہ یہ عورت ظالم بھی ہو سکتی ہے۔ سخت دل اور مکار بھی، اور وہ بھی ایک 'مرد' کے لیے۔ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کا عورت پر ظلم تو ہمیشہ سے مشہور ہے۔ نند بھاوج ہو یا ساس بہو۔ ان کا آپس کا جھگڑا نہ تو کبھی ختم ہوا ہے اور شاید کبھی ختم ہو۔ مگر عورت کا مرد پر تشدد اور ظلم......؟ یقین نہیں آرہا ناں؟ کیسے آئے گا بھلا......؟ ایسے واقعات قصے کہانیوں کا تو حصہ ہوتے ہیں۔ مگر کبھی کبھار وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

اور اگر یہ واقعات، آپ بیتی ہوں تو کیا آپ کو یقین نہیں آئے گا......؟ اب سنیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے......؟

'میرا نام علی ہے۔ میں اپنے والدین اور بڑے بھائی کا بے حد لاڈلا تھا۔ میری ہر خواہش بنا کہے پوری کی جاتی تھی۔ مجھے خود پر ناز ہونے لگتا اس لیے بھی کہ میں اپنے سب بہن بھائیوں میں چھوٹا تھا، اور سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ہمارا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ اباجی نے بڑی محنت اور ایمانداری سے ایک چھوٹی سی فیکٹری کی بنیاد رکھی تھی اور خوب محنت سے اس کی آبیاری کی۔ جلد ہی ولی بھیا نے ان کے شانہ بشانہ ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ کافی حد تک اٹھالیا تھا۔ اباجی اور بھیا کی محنت سے فیکٹری خوب چلنے لگی۔ معاشی حالات تو ہمارے پہلے بھی اچھے تھے مگر پھر اور زیادہ بہتر ہوتے چلے گئے اور بہنوں کے رشتے آنے لگے۔ یوں تو ولی بھیا سب سے بڑے تھے اور اصولی طور پر پہلے ان کی شادی ہونی چاہیے تھی مگر اباجی نے بھیا کے مشورے سے پہلے آپی کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہماری امی بے حد نرم دل، معصوم اور محبت کرنے والی ہستی تھی۔ اس لیے تو وہ ہر حال میں ہمیشہ مطمئن رہتی تھیں اور اپنے رب کے فیصلے پر راضی۔

جلد ہی اباجی نے نور آپا اور ایمان آپی کے رشتے طے کر دیے۔ سلطان بھائی اور سلیم بھائی بھی اپنا بزنس کرتے تھے۔ سلطان بھائی کا مون مارکیٹ میں شاپنگ پلازہ تھا اور سلیم بھائی کی اسپیئر پارٹس بنانے کی فیکٹری۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد، اباجی نے شادی کی تاریخ طے کر دی۔ یہ ہمارے گھر کی پہلی شادیاں تھیں، لہٰذا پوری شان شوکت سے فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔ اور اس سلسلے میں صباحیہ آپی کے ساتھ ساتھ میں

نے بھی بھرپور حصہ لیا تھا۔
شادی میں دور و نزدیک کے تمام رشتے دار مدعو تھے۔ اور ہر کسی کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا۔ ارے بھئی! ولی کی شادی کب کرو گے؟ باری تو ولی کی تھی؟ ارے بھابی! ولی کی شادی کے لڈو کب کھلا رہی ہیں......؟'' اور بھابی (امی) بھلا کیا بتاتیں کہ وہ تو خود ابا جی اور بھیا کی منطق سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ کیوں بڑے بیٹے کو چھوڑ کر بیٹیوں کو پہلے بیاہنے لگے۔ سب کی دعاؤں کے سائے میں دونوں بہنیں رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر آباد کرنے چلی گئیں اور ہمارا آنگن سونا کر گئیں۔

☆......☆......☆

ابا جی اور بھیا ایک بار پھر فیکٹری اور کاروبار میں مصروف ہو گئے، میں اور صباحیہ آپی اپنی پڑھائی میں۔ ہم سب کی مصروفیات نے امی کو بالکل تنہا کر دیا اور اس تنہائی کی وجہ سے وہ ایک دم بوکھلا سی گئیں۔ مگر جلد ہی ابا جی نے گھر کے اس سناٹے کو ختم کرنے کا سامان کر دیا۔ انہوں نے اپنے کزن کی بیٹی کے ساتھ ولی بھیا کی منگنی کر دی۔

'جوہی' بھابی بے حد خوبصورت تھیں۔ اتنی خوبصورت کہ جو دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ ہم سب بھیا کی منگنی اور جلد متوقع شادی سے بے حد خوش تھے۔ امی کے ساتھ ساتھ بہنوں نے بھی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

''امی! آپ غور سے سن لیں ہمیں بھیا سے نیگ میں سونے کی انگوٹھیاں ہی چاہیں۔ اس سے کم پر ہم نہیں ٹلنے والی ہیں کہہ دیا ہے ہم نے۔ آپ ابا جی کو بتا دیجیے گا ہاں۔'' ایمان باجی نے ڈھیروں رنگ برنگے کپڑوں سے الجھتے ہوئے اپنا فرمائشی پروگرام نشر کیا تو ہم سب ہنس دیے۔ ظاہر ہے جب انسان کے اندر خوشی کی فصل کھلی ہو تو باہر بھی خوشیوں کی بہار نظر آتی ہے۔

''اری بدھو! انگوٹھی تو بھیا دیں گے اپنی سالی کو دودھ پلائی میں اور صباحیہ کی بچی کو...... ہم کنگن لیں گے اور وہ بھی جڑاؤ۔ بھئی آخر کو شادی شدہ بہنیں ہیں سسرال میں بھی رعب نہیں ڈالنا کیا۔ بھائی نے شگون میں دیے



ہیں۔''نور آپا نے ہنستے ہوئے ایمان باجی کو مشورہ دیا۔

''آپا! اگر آپ کا ایسا تگڑا نیگ لینے کا ارادہ ہے تو پھر معذرت آپ غلط جگہ، اپنی توانائیاں خرچ کر رہی ہیں۔ بھئی ہماری پیاری، سیدھی سادھی اور معصوم امی بھلا کہاں دلوا پائیں گی آپ کی پسند کے کنگن۔ آپ تو اباجی کو بھی چھوڑیں اور سیدھا ولی بھیا سے رابطہ کریں۔ شرطیہ کہتا ہوں۔ کل ہی آپ کا مطالبہ مان لیا جائے گا۔ اور اگر یہاں وہاں کی سفارش ڈھونڈتی پھریں گی تو کچھ ہاتھ آنے والا نہیں۔ لکھوالیں مجھ سے۔''میں نے اپنے قیمتی مشورے سے انہیں نوازا اور تینوں کی آنکھیں چمک اٹھیں اور پھر فوراً بھیا کو گھیر کر اُدھر لایا گیا۔ بری کا سامان انہیں دکھاتے ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے آپا نے کچھ اس انداز سے اپنی فرمائش ان کے گوش گزاری کہ بھیا فوراً مان گئے۔ اگلے ہی دن ہم تینوں کو اپنے ساتھ لے جا کر ان کی پسند کے کنگن بھی دلوا دیے۔ اپنی سالیوں کے لیے آپا اور باجی کے مشورے سے انگوٹھیاں بھی خرید لیں۔

بڑے ارمانوں، بڑی خوشیوں اور بہت چاہتوں کے ساتھ ہم جوہی بھابی کو بیاہ کر لائے۔ شادی کے شروع کے دنوں میں ہم تو خوشیوں کے ہنڈولے جھول رہے تھے۔ اس لیے بھابی کے لیے دیے انداز کو ہم نے، ان کی شرم اور جھجک سمجھا۔ مگر کب تک؟ تین چار مہینے گزرنے کے بعد ابھی بھی ان کے رویے میں کوئی واضح تبدیلی نہ آئی تو ہم کھٹک گئے۔ بھابی جتنی خوبصورت تھیں، ہمیں امید تھی کہ وہ اتنی ہی خوب سیرت بھی ہوں گی۔ کیوں کہ ہم سب تو ایسے ہی تھے اور پھر بھابی بھی تو ہماری فیملی سے تھیں، اس لیے یہ کہنا کہ وہ اپنے رعب حسن سے مغرور تھیں، تو بالکل غلط تھا۔ یہ رعب حسن نہ تھا، شاید نیت کا فتور ہی تھا، جو آہستہ آہستہ سب پر کھلنا شروع ہو گیا۔

☆......☆......☆

جوہی بھابی بھی، بھیا کی طرح اپنے بھائیوں بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی چار بہنیں تھیں اور ایک ہی بھائی جو ابھی چھوٹا تھا۔ بھابی کی ایک بہن چمپا کی شادی بھی بھابی کے ساتھ ہی ہوئی تھی اور سننے میں آ رہا تھا کہ ان کا رویہ بھی اپنے سسرال والوں کے ساتھ بالکل ویسا تھا جیسے بھابی کا ہمارے ساتھ......

''اباجی! جوہی مان نہیں رہی، میں تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا۔ مگر اس کی سوئی ابھی تک وہیں کی وہیں اٹکی ہوئی ہے کہ اپنی بہنوں کو نیگ میں جڑاؤ کنگن دیے اور اس کی بہنوں کو صرف انگوٹھیاں آخر کیوں؟ ان کے لیے بھی کنگن لینے چاہیے تھے۔ اب آپ ہی بتائیں اباجی ایسی صورت میں، میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔''ولی بھیا کی تھکی آواز جیسے میرے اردگرد گھنٹیاں بجا گئی۔ وہ اس وقت ابا کے بیڈ پر ان کے ساتھ بیٹھے، راز و نیاز میں مصروف تھے۔ میں کمرے کے باہر سے گزر رہا تھا کہ میرے کان میں بھیا کی آواز پڑ گئی اور اباجی کی طرح میں بھی پریشان ہو گیا۔ مگر ابھی تو یہ شروعات تھیں۔ اس کے بعد تو گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا۔ ہمارا وہ گھر جو جنت کا گہوارہ تھا آہستہ آہستہ اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ بھابی کے ساتھ جانے کیا مسئلہ تھا کہ وہ اس گھر سمیت بھیا پر صرف اپنا حق سمجھتی تھیں۔ نہ تو ان کی نور آپا سے دوستی ہو پاتی تھی اور نہ ہی ایمان باجی سے......؟ صباحیہ آپی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور رہا میں؟ تو شروع شروع میں تو انہوں نے مجھے بھی اپنے سرد رویے کی بھینٹ چڑھائے رکھا مگر پھر جانے کیا ہوا کہ آہستہ آہستہ ان کا رویہ میرے ساتھ تبدیل ہونے لگا۔ ان کے اس التفات نے میرے ساتھ میری بہنوں کے کان بھی کھڑے کر دیے تھے۔ لیکن ہم اپنے پیارے بھیا کی وجہ سے خاموش تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے کسی بھی عمل کی وجہ سے بھیا کو کوئی دکھ پہنچے یا ان کی زندگی متاثر ہو۔ جیسے ہی صباحیہ آپی کی تعلیم مکمل ہوئی ان کی شادی پھوپو کے بیٹے کے ساتھ طے کر دی گئی۔

ہماری ایک ہی پھوپو تھیں اور اباجی سمیت تینوں چچاؤں کی لاڈلی تھیں۔ بہت اچھی نیچر کی مالک، محبت کرنے والی خاتون، جتنا اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں سے پیار کرتی تھیں اس سے کہیں زیادہ پھوپھا جان کے بھانجوں بھانجیوں بھتیجوں اور بھتیجیوں پر جان چھڑکتی تھیں اور ہماری جوہی بھابی بھی ہمارے جیٹھ کی بیٹی تھیں اور رشتہ پھوپو نے ہی کروایا تھا۔ اور اگر ہم سب ابھی تک اس رشتے کو اچھی طرح نبھا رہے تھے تو پھوپو اور پھوپھا جان کی وجہ سے یا پھر بھیا کے معصوم بچوں کی وجہ سے،

جن میں، ہماری جان تھی اور جب سے صباحیہ آپی اور عمر بھائی کا رشتہ طے ہوا تھا ہم نے ایک واضح قسم کی بے چینی، ایک عجیب طرح کی ہلچل، بھابی اور ان کے گھر والوں کے رویے میں محسوس کی تھی۔

☆......☆......☆

جس دن آپی کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی، اس دن گھر میں صبح سے ہی خوشگوار سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ آپا اور باجی بھی اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ اشتہا انگیز پکوانوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سارے بچے باہر دوڑتے پھر رہے تھے۔ بہنوں کے کام کے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اس قدر مصروفیات کے عالم میں بھابی کی بے چینی اور اضطراب نمایاں تھا۔ ان کا زیادہ وقت فون کرتے ہوئے گزر رہا تھا، جانے کیا بات تھی؟ مگر بھابی کی سرگرمیاں صبح سے ہی پراسرار لگ رہی تھیں۔ امی اور آپا نے ایک دو بار پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر ادھر سے نولفٹ کا بورڈ لگا دیکھ کر خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔

مقررہ وقت پر پھوپا جان اپنے بزرگوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ عمر بھائی چونکہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے لہٰذا وہ شادی کی ہر رسم پورے جوش جذبے کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنی طرف کے تمام لوگوں کو لائے تھے۔ بھابی کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ہم نے بہت خوشی اور محبت سے سب کا استقبال کیا۔ تمام فنکشن بہت اچھا رہا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے بات کررہے تھے بھابی نے اچانک ہی ایک نیا طوفان کھڑا کردیا۔ ایک دم اٹھتے شور اور بھابی کی تیز آواز سن کر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ اندر کی طرف بھاگا مگر بار بار اپنے نام کی تکرار سن کر بیچ دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا۔ اندر کا منظر بہت عجیب سا ہو رہا تھا۔ بھیا مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے اندر موجود تمام لوگ خاموش اور سنجیدہ بیٹھے میز پر بکھرے سامان کو دیکھ رہے تھے بھابی اور ان کی امی غصے سے بھری سب کو کڑے تیوروں سے گھور رہی تھیں۔

''بس! دیکھ لیں ثبوت۔ اتنے ثبوت کافی ہیں یا کسی اور گواہی کی ضرورت ہے بڑے ابو آپ کو؟ اب آپ ہی فیصلہ کریں صباحیہ آپ کا خون ہے یا بیلا۔ اگر صباحیہ کی منگنی کے سال یا ڈیڑھ سال بعد ہی اس کی شادی کا فیصلہ کیا جارہا ہے تو پھر میری بہن کو پچھلے تین سال سے کیوں لٹکا رکھا ہے ان لوگوں نے؟ پوچھیں آپ ان سے، جواب طلب کریں۔ ابھی یہاں سب کے سامنے۔ بھابی کی غصے سے بھری آواز نے جیسے تمام بے جان جسموں میں جان ڈال دی تھی جو حیرانی سے بت بنے ان تمام ثبوت کو دیکھ رہے تھے جو میز پر بکھرے تھے۔

''لیکن جوہی بیٹا یہ کیسی منگنی ہے جس کا نا تو لڑکے کو علم ہے اور نہ ہی لڑکے کے گھر والوں کو ؟ کیا ولی جانتا ہے اس رشتے کے بارے میں؟ یا پھر بھائی جان اور بھابی جان کے علم میں ہے کوئی بات......؟'' بھابی کے بڑے تایا ابو (جنہیں سب بڑے ابو کہتے تھے) نے حیرت اور غصے پر غلبہ پاتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں بڑے ابو! کیا ہم علی کے بڑے نہیں؟ بڑے بھائی اور بھابی بھی تو ماں باپ کی جگہ ہوتے ہیں ناں اور ہم سب تو اپنا مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئے ہیں اور آپ کا ہر فیصلہ مانتے ہیں تو پھر ہم اور ولی کیوں نہیں، علی کے بڑے بن کر اس کی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے؟ اور ضروری نہیں کہ ہم اپنے کیے گئے فیصلے کے لیے سب کے سامنے جوابدہ بھی ہوں...... میری امی جانتی ہیں میرے ابو جانتے ہیں ولی جانتے ہیں اس لیے کسی اور کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایسا کیا جائے صباحیہ کی شادی کے ساتھ ہی بیلا اور علی کا نکاح بھی رکھ دیا جائے اور علی کے ولیمے کے دن صباحیہ کی رخصتی کر دی جائے، ورنہ کوئی بھی شادی نہیں ہوگی۔'' بھابی کے الفاظ نے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح سب کے تن بدن کو جھلسا کر رکھ دیا۔

''جوہی ہوش کی دوا کرو۔ تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ بھلا نکاح شدہ لڑکی کی منگنی کیسے ہوسکتی ہے؟ احمر اور بیلا کے نکاح کو پانچ سال ہوگئے ہیں اب ان کی رخصتی کرنی ہے تو یہاں یہ سب ڈرامہ رچانے کی ضرورت کیا ہے؟ ہم اپنے بیٹے کی خوشیاں اور ارمان سجا کر آئے ہیں اور تم ہر خوشی کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہو۔''

بہت دیر سے خاموش بیٹھے اور سب کو سنتے پھوپا جی

کی برداشت ختم ہوگئی اور وہ غصے سے بولے۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں چچا جان! آپ ان تصویروں کو دیکھیے' کیا یہ ولی نہیں ہے؟ یہ بیلا کو مٹھائی کھلاتے ہوئے' سلامی دیتے ہوئے اور اس کی خوشیاں دینے کا وعدہ کرتے ہوئے؟ اور سب سے بڑی بات یہ کنگن جو بیلا کے ہاتھ میں ہے' علی کے نام کے کنگن! ان کو پہنچاہیے۔'' بھابی نے پھوپا جان کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے تند لہجے میں کہا۔

''ولی بیٹا یہ بہو کیا کہہ رہی ہے اتنی دیر سے؟ اور تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟ اب تو کچھ بولو بیٹا! بہو کی باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آرہیں!'' اباجی نے سر جھکائے بیٹھے بھیاجی سے کہا' تو بھیا نے بے بسی کی ایک نظر سب پر ڈالی اور پھر نگاہیں مجھ پر جم سی گئیں اور بولے۔

''اباجی آپ کو یاد ہے تین سال پہلے جب ضمیر چچا (بھابی کے ابو) کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا تو اس کے پیچھے یہ ہی وجہ تھی احمر کو بیلا پسند نہیں تھی۔ مگر اپنے والدین کی ضد کے سامنے مجبور ہو کر اس نے نکاح کر لیا مگر جیسے ہی اسے موقع ملا اس نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر لی اور بیلا کو لندن سے ہی طلاق بھجوادی۔ ضمیر چچا اس صدمے کو نہ سہہ پائے اور انہیں ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ جو ہی ان دونوں عیان کی پیدائش کے بعد رہنے گئی ہوئی تھی۔ اس نے ہی سب کو مجبور کیا کہ اس طلاق کی خبر کسی کو نہ دی جائے کیوں کہ اس طرح چچی کے میکے میں بدنامی ہو جاتی۔ اس واقعے کے بعد چچا جان تو موت کے منہ میں گئے ہی' بیلا کی دماغی حالت پر بھی بہت برا اثر پڑا۔ آپ سب کو یاد ہی ہوگا کہ وہ شدید بیمار ہوگئی تھی۔ اور سب نے یہ ہی سمجھا تھا کہ ابو کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہے۔ میں بھی سب کی طرح اصل حقیقت سے لاعلم تھا۔ پھر ایک دن جو ہی نے بہت ایمرجنسی میں مجھے وہاں بلایا۔ اس کی گھبرائی آواز سن کر میں وہاں پہنچا تو آ گے یہ سب میرا مطلب ہے' بیلا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ چچا جان بھی خوش لگ رہے تھے۔ اور پھر میرے پہنچتے ہی جو ہی نے بیلا کو وہی کنگن پہنا دیے جو اس وقت آپ کے کہنے پر اسے دلوائے تھے جب اس نے شادی کے نیگ میں دیے گئے کنگنوں اور انگوٹھیوں کو لے کر فساد کھڑا کیا تھا۔ میں خود

اس ساری صورتحال سے پریشان ہوگیا اور تب میرے استفسار پر جو ہی نے مجھے سارے حالات بتائے' مگر ساتھ ہی عیان' نعمان کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم دلوائی کہ میں اس بات کو راز ہی رکھوں۔ جب تک مناسب موقع نہیں آجاتا۔ بیلا کو اپنے طور پر علی سے منسوب کرنے کے بعد اس کا رویہ علی کے ساتھ بدلا تھا۔ میں تو آپ کو بہت پہلے یہ سب بتانا چاہتا تھا' مگر ضمیر چچا کی وفات کے بعد میں بھی خاموش ہوگیا میرا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیلا بھی سنبھال جائے گی اور جو ہی بھی سمجھ جائے گی۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ مجھے اگر ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ یہ آج اس بھری محفل میں میرا اور میری بہن کا تماشا بنائے گی تو میں خود ہی پہلے بتا چکا ہوتا۔ ساری حقیقت چھپا کر غلطی تو میں نے بھی کی ہے اور اس کا مداوا کیا ہوگا؟ مجھے نہیں پتا؟ آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں مجھے منظور ہوگا۔ جو بھی سزا دیں' مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' بھیا نے سر جھکاتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

''غلطی تو واقعی تم سے ہوئی ہے برخوردار! اور اب اس کا خمیازہ صرف تمہیں نہیں ہم سب کو بھگتنا پڑے گا اگر صباحیہ ہماری بیٹی ہے تو بیلا بھی ہمارا خون ہے۔ زیادتی تو ہم' اس کے ساتھ بھی نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن اس طرح یک طرفہ فیصلہ کر کے تم لوگوں نے علی کے ساتھ زیادتی نہیں کی؟ اور اب اس فیصلے پر تصدیق کی مہر لگوا کر بہت بڑا جرم نہیں کروانا چاہ رہے ہو تم لوگ' ہم سے؟ جو ہی تمہیں اتنا بڑا کھڑاگ پالنے سے پہلے ایک بار تو ہم سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا۔ غضب خدا کا' اتنا کچھ ہوگیا۔ ہمارا بھائی اتنا بڑا دکھ لے کر دنیا سے رخصت ہوگیا اور ہمیں کسی نے کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی۔ بھابی! آپ نے اچھا نہیں کیا۔ صرف اپنے میکے کی آن اور بھائیوں کا مان رکھنے کے لیے ان کی عزت بچانے کے لیے آپ نے تو ہماری عزت کا جنازہ ہی نکال دیا ناں۔ بیلا ہماری بھی بیٹی ہے اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بروقت ہمیں علم ہو جاتا تو کیا ہم اس کے حق کے لیے آواز نہ اٹھاتے؟ اور معاف کیجیے گا بھابی جان! آپ کی اعلیٰ تربیت تو چیخ چیخ کر اپنے اعلیٰ پن کا ثبوت دے رہی ہے مگر اب ہم اور کسی کے ساتھ زیادتی

نہیں ہونے دیں گے۔ ٹھیک ہے فیصلہ آپ نے اور ہمارے مرحوم بھائی نے چھپ کر کربھی لیا ہوگا اس فیصلے کو ماننے یا نا ماننے کا اختیار ہم سب کے سامنے علی کو دیتے ہیں۔ اگر اسے بیلا کے ساتھ شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تو ہم بخوشی اس کی تاریخ رکھ دیتے ہیں اور اگر اس کو یہ رشتہ منظور نہیں تو کوئی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔ نہ ہی ہم نہ ہی تم۔'' بڑے ابو نے فیصلے کا سارا اختیار مجھے دیتے ہوئے بھابی اور ان کی امی کے ساتھ ساتھ بھیا کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو میں آہستگی سے چلتا ہوا بھیا کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''کون کرے گا انکار میری بہن کے ساتھ شادی کرنے سے' اور کیوں کرے گا یہ انکار۔ یہ میرا گھر ہے' میرا یہاں جو کچھ ہوگا میری مرضی سے ہوگا۔ آپ علی کو بہکانے کی کوشش نہ کریں بڑے ابو! شادی تو علی کو میری بہن سے کرنا ہی ہوگی ورنہ میں حشر برپا کر دوں گی بتا رہی ہوں سب کو۔'' میرے کچھ بھی بولنے سے پہلے بھابی یک دم بھڑک اٹھیں' تو میں جو بھیا کی محبت میں' ان کی مجبوری اور بے بسی کو محسوس کرتے ہوتے شادی کے لیے ہاں کرنے جا رہا تھا کہ یکدم ہوش میں آ گیا۔

''بڑے ابو' ابا جی! بھیا! آپ لوگ جس سے کہیں گے جہاں کہیں گے' جب کہیں گے میں شادی کر لوں گا۔ چاہے وہ جیسی بھی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر بھابی کی بہن سے ہرگز نہیں۔ کبھی بھی نہیں......!'' میں نے بھابی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غصے سے اپنا فیصلہ سنا دیا اور کوئی بھی جواب سنے بغیر میز کو زوردار ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

صباحیہ آپی اور عمر بھائی کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی' مگر اس پر آنے والے اخراجات صحیح معنوں میں میرے ہوش اڑا دیے۔ جب سے میں نے فیکٹری جانا شروع کیا تھا میرا ''بی کام'' میرے خوب کام آ رہا تھا۔ فیکٹری کا فنانس اور آڈٹ وغیرہ کا کام بھی میں خود دیکھ لیتا تھا اس لیے شاپنگز پر اٹھنے والے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ مگر میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ ساری شاپنگز اور تیاریاں بھیا بھابی مل کر کر رہے تھے۔ حالانکہ پھوپا اور پھوپی جان نے سختی سے جہیز کے لیے منع کر دیا تھا' اس لیے آپی کے کپڑے اور زیورات ہی تیار کیے گئے تھے مگر اس پر بھی اتنے اخراجات......؟ جب میں زیادہ الجھ گیا تو ابا جی سے ذکر کیا۔ میری بات سن کر تو ابا جی سر جھکا کر خاموش ہو گئے مگر آپا خاموش نہ رہ سکیں جو وہیں بیٹھی آپی کے جوڑے ٹانک رہی تھیں۔

''خرچہ تو ہوگا علی! خرچ تو اس سے بھی زیادہ ہوگا کیوں کہ بھابی خریداری کر رہی ہیں اور وہ صباحیہ کی شادی کے ساتھ ساتھ اپنی تینوں بہنوں کا جہیز بھی تیار کر رہی ہیں۔ پھوپو اور پھوپا جان نے تو کچھ بھی دینے سے منع کر دیا ہے مگر بھابی کو کون سمجھائے؟ حالانکہ بیلا نے تو شادی کے فوراً بعد امریکہ چلے جانا ہے مگر پھر بھی' بھابی تمہاری ضد اور خار میں بھیا سے خرچ کروائے جا رہی ہیں۔ بس اللہ ہی ہدایت دے انہیں تو شاید سمجھ پائیں ورنہ کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ان کے سمجھنے کے!''

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں کہتے' اللہ سے ہدایت سب کے لیے مانگتے ہیں اور اپنے لیے بھی کیوں کہ اگر ہم دعا نہ مانگیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ہم بہت کامل ہیں۔ ہمیں رب کے فضل اور ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ درست عمل نہیں ہے۔ بیٹا کیوں کہ یہ غلطی تو ابلیس سے بھی ہوئی تھی۔'' ابا جی نے بڑے پیار سے آپا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو بات کسی اور طرف نکل گئی۔ مگر مجھے اس حقیقت کو جاننے کے بعد بے حد دکھ ہوا۔ کیوں کہ آپا شاید ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ بھابی کو تو نہ کوئی سمجھا سکتا تھا اور نہ ہی کوئی منع کر سکتا تھا۔

میرے انکار کے بعد بھابی کو بہت مشکل سے قابو کیا گیا تھا۔ پھوپا جان نے وہاں موجود تمام بزرگوں نے بیلا کے علاوہ چنبیلی اور نرگس کی شادی کی ذمہ داریاں بھی اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ بلکہ پھوپا جان نے تو جب صباحیہ آپی سے پہلے بیلا کو رخصت کرنے کی حامی بھری تو بھابی نہیں مانیں۔

پھوپا جان نے اپنے وعدے کی لاج نبھائی اور اگلے ہی ہفتے اپنے دیرینہ دوست کے بھانجے عباد کے ساتھ بیلا کا رشتہ کروا دیا۔ عباد کی پوری فیملی امریکہ میں رہائش پذیر تھی اور وہ عباد کی شادی کے لیے پاکستان آئی تھی۔ کہتے

ہیں جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، مگر ان کا ملن زمین پر ہوتا ہے۔ بیلا اور عباد کا جوڑا بھی اوپر کہیں بن گیا تھا وہ بلاشبہ عباد کا نصیب تھی۔ اس میں کچھ بھابی کی ضد اور انا کا چکر تھا اور کچھ عباد لوگوں کو واقعی جلدی تھی صباحیہ کی شادی سے آٹھ دن پہلے ان دونوں کی شادی دھوم دھام سے انجام پائی۔

بیٹیاں آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں۔ ان کی چہکار سے گھر آنگن میں رونق لگی رہتی ہے۔ دونوں بہنوں کی شادی سے پہلے ہمارا آنگن بھی میٹھی میٹھی چہکاروں سے گونجتا تھا۔ ان کی کھلکھل کرتی ہنسی، ختم نہ ہونے والی مسلسل باتیں، کچن میں نئی نئی ریسیپیز ٹرائی کرنے کی کوشش میں ہونے والے برتنوں کے ٹکراؤ کا مدھر شور۔ اور ہم سب کا بے حد خیال رکھنے اور ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش میں ان کا ہلکان ہونا، سب جیسے خواب ہوگیا تھا۔ اب گھر میں ہر وقت سناٹے کا راج رہتا، بھابی کی تو پہلے کسی سے نہ بنتی تھی، اب تو وہ بالکل الگ تھلگ ہوگئی تھیں۔ بچے بھی ان کے کنٹرول میں تھے۔ اور تو اور، اب تو بھیا بھی ہم سے دور ہوتے جارہے تھے بالکل غیر محسوس انداز میں۔ جانے بھابی کے ہاتھ بھیا کی کون سی کمزوری آگئی تھی جس کا وہ خوب فائدہ اٹھا رہی تھیں؟

صباحیہ آپی اور بیلا کی شادی پر اٹھنے والے ہوشربا اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اب مجھے صحیح معنوں میں دن رات کام کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ کام تمام بوجھ میرے کاندھوں پر آگیا تھا۔ میں 'فیکٹری مالک' سے صرف ''ورکر'' بن گیا تھا۔ بھیا نے آہستہ آہستہ سارا اکاؤنٹ اور آڈٹ مجھ سے لے کر اکاؤنٹنٹ کے سپرد کر دیا تھا جسے بھاری تنخواہ پر رکھا گیا تھا۔ اور مجھے فیلڈ ورک سونپ دیا۔

گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ کیسی کھچڑی پک رہی ہے مجھے حقیقتاً اس کا علم نہ تھا۔ میں تو صبح سویرے فیکٹری نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا، کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ مگر بھیا اپنی مرضی سے فیکٹری آتے تھے اور جب دل چاہا واپس چلے جاتے تھے۔ وقت کا دھارا اسی طرح بہتا رہا اور وقت کے پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر گیا میں نے کبھی دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بیلا کے بعد چنبیلی کی شادی بھی بھابی نے اسی شان شوکت سے کروائی، جس طرح وہ چاہتی تھیں۔ اب رہ گئی تھی نرگس چھوٹی بہن اور فاروق حسن ان کا چھوٹا لاڈلا بھائی۔ فاروق حسن کو بیلا نے اپنے پاس امریکہ بلوالیا تھا۔

میں عمر عزیز کی بتیسویں بہار دیکھ چکا تھا۔ مگر ابھی تک میری شادی کے شادیانے نہیں بج پائے تھے اس لیے نہیں کہ میرے والدین یا بہنوں کو خیال اور خواہش نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ بھابی ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ امی اور بہنوں نے جہاں جہاں میرے رشتے کے لیے کوشش کی، بھابی نے بڑے آرام سے ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا ان کے اس عمل سے سب ہی بہت پریشان تھے اور اسی پریشانی میں ایک دن پھوپو نے بھابی کو ڈانٹ دیا۔ مگر وہ بھی بھابی تھیں بولیں۔

''اچھا کیا چچی! آپ نے آج یہ بات سب کے سامنے پوچھ لی۔ میں بھی اس وعدے کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اب تھک چکی ہوں، جو میں نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ اور آپ سب کے سامنے کیا تھا کہ علی کی شادی ہوگی تو صرف اور صرف میری بہن سے ہوگی۔ کسی دوسری لڑکی کو تو میں اس گھر کی بہو بننے دوں گی نہیں۔ یہ میرا گھر ہے میری سلطنت۔ اور میری اس راج دھانی میں کسی 'دوسری عورت' کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں کسی اور کی اجارہ داری برداشت نہیں کروں گی۔ اس لیے علی کی دلہن بن کر یہاں آئے گی تو صرف میری بہن آئے گی۔ پھر چاہے وہ بیلا ہو یا نرگس؟ کیا فرق پڑتا ہے۔ کان کھول کر تم سن لو علی، جس تنفر سے تم نے دعویٰ کیا تھا نہ کہ بھابی کی بہن سے مر کر بھی شادی نہیں کروں گا۔ تو اب نہ تو میں تمہیں مرنے دوں گی اور نہ ہی کسی اور کا ہو کر جینے دوں گی۔ تمہاری زندگی میں صرف اب نرگس کی جگہ ہے صرف نرگس کی...... اور اس بار میں دیکھتی ہوں کہ مجھے کون روک سکتا ہے؟ اب میں یہ شادی کروا کر رہوں گی۔ یاد رکھنا آپ سب......!''

جوہی بھابی نے ایک بار پھر دھماکہ کیا تھا۔ ایسا دھماکہ جس نے ہمیں پوری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کا فیصلہ سن کر سب ہی دہل گئے تھے مگر وہ بھی جوہی بھابی تھیں، اپنی ضد کے آگے انہوں نے کسی کی بات نہیں سنی اور میں تو صرف بھیا کی بے زبانی اور مجبوری کی بھینٹ چڑھ گیا۔ جو

بھابی نے کہا وہ زبردستی کر کے دکھایا (کہ بھابی نے اپنا ہی گھر اجاڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور بھیا مجبور تھے)۔

☆......☆......☆

نرگس جیون ساتھی کے روپ میں میری زندگی میں شامل ہوگئی۔ میں نے اسے اپنا نصیب سمجھ کر خوشی سے اپنا لیا۔ کیسے نہ اپناتا؟ میرے جان سے پیارے بھیا کی گرہستی داؤ پر لگی تھی۔ اباجی بستر مرگ پر جا پڑے تھے۔ خاندان کی عزت داؤ پر لگی تھی تو میں کیسے آگے نہ بڑھتا......؟ بھیا کی خاطر یہ اذیت بھی اٹھالی میرے ساتھ ساتھ سب کے حواس معطل ہو چکے تھے (اور یہ سب کچھ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ بھابی نے بھیا سے علیحدہ ہونے کا اشارہ دیا تھا اور بھیا اپنا گھر بچانے کے چکر میں خاموش ہو گئے تھے)۔

بھیا کا گھر بچانے اور اپنے گھر کی عزت کے لیے میں نے خوشی خوشی نرگس سے شادی کر لی تھی۔ اپنی انا اور، اپنی ضد پوری کرنے کے بعد بھابی اس قدر مطمئن اور اس قدر خوش تھیں کہ ان کے اطمینان پر سب کو حیرت ہوئی۔ ہمارا گھر لگتا تھا ایک بار پھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا ہو۔ امی بھی اس خوشگوار ماحول کے زیر اثر بہت مطمئن رہنے لگیں۔ مگر کہتے ہیں ناں سکھ تو صرف نصیب کی عطا ہے، اور نصیب کب تک ساتھ دے، یہ کوئی نہیں جان سکتا۔

بھابی کے غرور اور انا کے پندار کو پہلا جھٹکا بہت جلد لگا تھا۔ وہ جانے کیا سوچ کر کس طرح کی پلاننگ کے تحت نرگس کو 'دیورانی' بنا کر لائی تھیں مگر وہ یہ بھول گئی تھیں کہ سب سے بہتر پلاننگ کرنے والی ذات صرف رب ہے۔ اس کی پلاننگ کے سامنے بڑے بڑوں کی سوچ منصوبے اور پلان دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ نرگس بھی آخر جو ہی بھابی کی بہن تھی۔ وہ بھلا کیسے دب کر کیسے رہ سکتی تھی۔ بلکہ وہ ہی کیا ان کی تو سب بہنیں ہی ڈنکے کی چوٹ پر اپنی سسرال میں اسی طرح 'راج' کر رہی تھیں۔ تو پھر بھلا نرگس کیسے ان سے ہٹ کر کچھ کرتی۔ بہت جلد اس نے اپنے اوپر سے دلہناپے کی شرم اور اخلاق کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور پھر دونوں بہنوں کی دن رات ہونے والی لڑائی نے ہمارا سکون بھی غارت کر ڈالا۔

یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ نرگس تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کس لہجے اور کس انداز میں بات کر رہی ہو، تم میرے ساتھ۔ بھول گئیں میرے احسان؟ میں نے اپنا گھر داؤ پر لگا کر، پورے خاندان سے ٹکر لے کر اپنی پوری سسرال کو تگنی کا ناچ نچا کر تمہارے راستے ہموار کیے۔ اپنے اتنے خوبصورت، فرمانبردار اور سیدھے سادھے دیور کا نصیب پھوڑا، تمہارا پھوٹا نصیب جگانے کے لیے؟ اسی دن کے لیے؟ یہ دن دیکھنے کے لیے کہ تم میرے کیے کرائے پر پانی پھیر کر حساب کتاب لینے میرے سامنے کھڑی ہو جاؤ...... تم......؟'' بھابی غصے سے اپنی بہن سے بات کر رہی تھیں۔

''نصیب اس کا نہیں میرا پھوٹ گیا ہے۔ آپ کی باتوں میں آ کر۔ آپ پر اعتبار کر کے۔ آپ کی سازشوں اور پلاننگز کا حصہ بن گئی۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ میں انکار کر دیتی۔ علی اور ولی بھیا کے صاف اور واضح انکار کو سمجھتی، اور اپنی عزت نفس کو داؤ پر لگا کر آپ کی باتوں میں ہرگز نہ آتی۔ زندگی برباد کر دی آپ نے میری بھی اور اپنے دیور علی کی بھی۔'' یہ نرگس کی آواز تھی اور یہ انجام تھا بھابی کی ضد کا...... لیکن ابھی تو شروعات تھیں۔ ایسے معرکے پھر آئے دن ہونے لگے۔

''تم اب میری بہن نہیں شریک بن گئی ہو...... 'دیورانی' ہو اور اب تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانی پڑے گی۔ چپ چاپ اپنے شوہر کی طرح سر جھکا کر میری جی حضوری کرنا سیکھو کیوں کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔'' یہ بھابی تھیں۔

'زبان سنبھال کر بات کریں آپ میرے ساتھ۔ غلام یار کھیل نہیں ہوں آپ کی...... اور اگر ولی بھیا آپ کے رچائے ڈراموں کے جال میں پھنس سکتے ہیں تو کیا باقی سب بھی اسی طرح کے ہوں گے......؟ تو ایسا نہیں ہے، آپ کا خیال ہے صرف۔ جتنا آپ کا حق ہے اس گھر پر اتنا میرا بھی ہے۔ میں بھی آپ کی ہی بہن ہوں، اگر آپ شریک دار بن رہی ہیں تو اس شریک داری کو میں آپ سے بڑھ کر نبھاؤں گی 'جیٹھانی جی......' اور ویسے بھی تربیت یافتہ تو آپ کی ہی ہوں تو چلیں دیکھتے ہیں اب چپ چاپ سر جھکائے کون فرمانبرداری سے وقت گزارتا ہے اور ہاں آئندہ مجھ سے ایسی باتیں کرنے

سے پہلے سوچ لیجیے گا کہ آپ کے سامنے، ولی بھائی' علی یا ان کے گھر والے نہیں بلکہ آپ کی چھوٹی اور لاڈلی بہن نرگس ہے۔ جسے آپ تمام گھر والوں سے لڑ کر بیاہ کر لائی ہیں اپنی راج دھانی میں۔" بھابی کے تابڑ توڑ جواب کے حملوں میں ڈٹ کر کھڑی رہنے والی اور ترکی بہ ترکی کا جواب دینے والی نرگس نے نہ صرف بھابی بلکہ سب کو نالاں کر دیا تھا۔

بھابی اگر حسن اور خوبصورتی میں یکتا تھیں تو نرگس ان کے بالکل الٹ، سالونی سلونی شام جیسی رنگت، معمولی اور عام سے نقوش کے ساتھ ساتھ ادب واخلاق سے بھی دور دور تک کوئی واسطہ نہ تھا اور صرف وہ ہی کیوں؟ بھابی سمیت ان کی ساری بہنوں کی یہی عادات تھیں اور یہی انداز......

☆......☆......☆

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

جی ہاں! اب تو عمر رواں کا آخری پڑاؤ ہے۔ مگر میں نے سکھ کی زندگی صرف اس وقت تک ہی دیکھی، جب تک جو ہی بھابی ہماری زندگی میں نہیں آئی تھیں۔ بھابی اور نرگس کے آئے روز معرکوں نے بہت جلد ابا جی اور امی کو ہم سے چھین لیا بہنوں نے میکے آنا بھی چھوڑ دیا کیوں کہ ان کو محبت عزت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ بھیا کی جانے کون سی مجبوری، کون سی کمزوری بھابی کے ہاتھ لگ گئی تھی کہ وہ چپ چاپ سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہے، منہ سے کچھ بھی نہ کہتے اور پھر ایک دن وہ اسی خاموشی، چپ چاپ مجھے ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ کر منوں مٹی تلے جا سوئے اس دن میری دنیا اجڑ گئی۔ مجھے لگا آج میں صحیح معنوں میں یتیم ہو گیا ہوں۔ جیسے بھی تھے میرا سائبان تھے۔ میرے دل کے ہر درد سے آشنا۔ نرگس کے کسے گئے شکنجے میں میرا سانس رکنے لگتا تو بھیا فوراً میری مدد کو آگے آتے۔ میں ان کے شانے پر سر رکھ کر روتا اور بھیا میرے سینے سے لگ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے......

مگر اب وہ سہارا بھی نہ رہا۔

نرگس اور بھابی کی نوک جھونک اب بھی جاری رہتی تھی یہاں تک کہ وقت گزرتا گیا اور بچے بھی جوان ہو گئے اور ظاہر ہے، بچوں نے بھی وہی کرنا تھا جو انہوں نے اپنی اپنی ماؤں کو کرتے دیکھا تھا۔ جانے کب اور کیسے بھابی نے فیکٹری اور گھر کی 'پاور آف اٹارنی' اپنے نام کر والی تھیں۔ بھیا کی وفات کے بعد انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گھر اور فیکٹری بیچ کر اور خود ساری رقم سمیٹ کر اپنی ماں کی طرف شفٹ ہو گئیں۔ فاروق حسن کے امریکہ سیٹ ہو جانے اور ان کی امی کی وفات کے بعد ان کا گھر کرائے پر چڑھا دیا گیا تھا مگر اب بھابی نے ایمرجنسی میں گھر خالی کروا کر اپنے لیے سیٹ کروا لیا۔ بھابی تو وہاں چلی گئیں مگر ہم کہاں جاتے؟ کیوں کہ ہمارے حصے میں تو کچھ بھی نہ آیا تھا سوائے عمر بھر کی خواری اور چاکری کے۔

نرگس ایک بار پھر بھابی کے سامنے ڈٹ گئی۔ اس نے اتنا شور مچایا کہ محلہ اکٹھا ہو گیا۔ اور پھر یہ ہی نہیں وہ پولیس اسٹیشن جا پہنچی اور بھابی کے خلاف رپورٹ لکھوا دی۔ بھابی کو جب F.I.R کی خبر ملی تو انہوں نے سارے ثبوت بھیا اور ابا جی کے دستخط شدہ وصیت، پاور آف اٹارنیز لے کر انسپکٹر کے سامنے پیش ہو گئیں۔ پولیس اب کیا کر سکتی تھی۔ بھلا اس سارے قصے کو وہ خاندانی جھگڑا اور اندرونی مسئلہ کہہ کر چلتے بنے۔

نرگس نے یہ وار خالی جاتا دیکھ سارے خاندان کو جمع کر لیا۔ پھوپا جان سمیت اپنے سارے بزرگوں کو درمیان میں پڑ کر فیصلہ کرنے کو کہا۔ مگر یہاں اس کی ایک نہ چلی کہ اب ان دونوں بہنوں سے مزید عزت افزائی کروانے کو کوئی بھی راضی نہ تھا۔ مگر بھابی شاید جانتی تھیں کہ وہ بھی نرگس ہے ان کی ہی بہن۔ اب کی بار اس نے ان کی چال اس طرح پلٹ دی کہ اپنا سارا ساز وسامان اٹھا کر وہ بھی اپنے میکے جا پہنچی۔

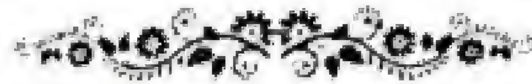
ایک بار پھر دونوں بہنوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ مگر اب کی بار ان کے میکے والوں بہنوں، بہنوئیوں نے ثالثی کرواتے ہوئے ہمیں اس گھر میں رہنے کا اختیار دلوا دیا اور بھابی پوش ایریا میں بنگلہ خرید کر وہاں شفٹ ہو گئیں۔ ان کے بچے تو جوان ہو چکے تھے۔ عیان اور نعمان نے گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ ہاں میرب کی شادی بھابی نے کر کے اسے بھی امریکہ رخصت کر دیا تھا۔

# اک پہیلی



محمد کاشف مغل

**عشق اور مشک کے درمیان سفر کرتے ایک نوجوان کا محبت نامہ**



اس حادثے میں دو لوگ ملوث تھے۔ اک وہ اور دوسرا میں۔ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا اس سے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ بلکہ "محبت نہیں عقیدت ہے، مجھے تم سے۔" شاید یہ سننے سے پہلے وہ خوش تھی۔ اگر خوش ہی تھی تو کیوں اکثر کہا کرتی تھی کہ نہ ہوتا میں تو اچھا ہوتا۔

وہ کیوں ظاہر کرتی تھی کہ اسے احساس محرومی ہے یا وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔ غلطی اس کی تھی۔ نہیں شاید غلطی میری تھی۔ میں اسے کیوں سوچنے لگا تھا۔ (اس کی اس محرومی کا احساس مجھے ہی کیوں ہونے لگا تھا۔ کہیں



مجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی تھی۔

"نہیں... نہیں میں نے سب کچھ انسانیت کے لیے کیا۔ انسانیت کا ہی رشتہ تھا میرا اس سے۔ غلطی اس کی تھی۔ کیوں کہتی تھی کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ یا پھر وہ فریب تھا، جھوٹا تھا، وہ چاہتی کیا تھی یہ میں نہیں جانتا تھا۔ ہرگز نہ جانتا تھا۔ بہت گہری تھی وہ، ہاں وہ بہت گہری تھی۔ غلطی میری تھی میں اتنا نادان تو نہ تھا کہ یہ بھی نہ جان سکوں کہ اس سے محبت نہ کرے کوئی کہ جس کے لہجے میں اتنی مٹھاس ہو کہ بس سنتے رہو۔ اگر میں دور چلا جاؤں تو



وہ مجھے یاد کرے گی؟ نہیں وہ مجھے کیوں یاد کرے گی۔ وہ مجھ سے محبت تو نہیں کرتی تھی۔ ہاں کچھ باتیں تھیں اس میں جو نہ چاہتے ہوئے بھی آج بھی یاد آتی ہیں۔

وہ کہتی تھی کہ اس کی آنکھوں میں کاجل ٹھہرتا نہیں بکھر جاتا ہے۔ ''ہاں کچھ تو تھا ان آنکھوں میں، جو میں بھی چھپی نظروں سے ان میں ڈوبا رہتا تھا۔ اسی لیے کاجل نہ لگاتی تھی وہ، کیونکہ اس کے بکھر جانے کا ڈر تھا اسے۔ اور میں اس کی آنکھوں میں رہنے لگا تھا، شاید اسی لیے بکھر سا گیا تھا ۔نہیں...نہیں میں تو پہلے سے ہی بکھرا تھا اندر ہی اندر۔

اس کے ہونٹ گلاب کی پتیوں کے مانند تھے۔ جب میرے قریب ہوتی تو حجاب کرتی۔ اک شعلہ سا بھڑکا دینے والی ادا تھی اس کی۔ غلطی میری تھی۔ میں کیوں یہ تصور کر بیٹھا تھا کہ وہ میری تھی۔ بہانے بہانے سے اس کی انگلیوں کو چھوتا بھی تھا اور وہ موقع بھی دیتی تھی۔ مجھے اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ رات کی تنہائی میں اسے یاد کرنے لگا تھا میں۔ جب وہ کسی اور سے بات بھی کرتی تو مجھے بُرا لگتا تھا۔

اسے جاننے کی جستجو کیوں بڑھ گئی تھی مجھ میں یا پھر یہ دسمبر کی شرارت تھی۔ لیکن دسمبر تو اپنے آخری لمحات میں تھا۔ پت جھڑ کو دعوت دے چکا تھا۔ کیا میں نہیں جانتا تھا اس موسم میں پتے بھی شاخوں کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں...

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس سے عشق ہو چکا تھا۔ اس کی باتوں، اس کی نظروں، اس کی روح سے۔ بس اب تو اسے اپنانے کی اک لہر دل میں دوڑ گئی تھی۔ لیکن یکطرفہ محبت تو سزا دیتی ہے۔ میں اس بات سے ناآشنا تھا کہ وہ کہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں!!

ہاں... ہاں وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ کھڑکی سے چھپ چھپ کے دیکھتی تھی وہ۔ اس کے ہاتھوں کی لکیروں میں خود کو تلاش بھی کیا کرتا تھا میں۔ پھر... پھر مجھے اس سے دور ہونا پڑا لیکن ہاں جانے سے پہلے میں نے کچھ وعدے لیے، اس نے بھی انتظار کرنے کا کہا۔ اس نے اپنی ڈائری میں رکھا تھا۔ ''مجھے آپ کا اندازِ گفتگو بہت پسند ہے۔''

بس میرے لیے یہی محبت کی دلیل تھی۔

میں چلا گیا اپنے جو سپنوں کے محل تھے ان کو حقیقت کرنے کی دوڑ میں لگ گیا۔ مہینوں میں بات ہوا کرتی تھی۔ صرف اس کا حال ہی سنتا تھا۔ اپنا حال تو سنانے کا ہی نہ تھا کہ وہ مجھ سے دور تھی۔ دو سال گزر چکے تھے۔ وہ اور اس کے ساتھ گزرے ہوئے پل پل کی یادیں ساتھ ساتھ ہی رہتی تھیں۔

میں اس کی خوشبو بھی محسوس کیا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔ چھ ماہ بعد مجھے واپس آنا تھا اور اسے اپنانا تھا۔ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ رہنا تھا۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ یہ سب اسی کے لیے تھا۔ وعدہ جو کیا تھا اسے اپنانے کا۔ اس کی کئی باتیں میں اپنے لفظوں میں قید کر چکا تھا۔ اس کی یادیں مجھے پردیس میں رہنے کے احساس سے کوسوں دور رکھتی تھیں۔ ساری تھکن اتر جاتی تھی جب فون پر اس کی آواز سنا کرتا تھا۔

میری کارکردگی کو دیکھتے ہی کمپنی نے ویزا کمپلیٹ ہونے سے ایک ماہ پہلے ہی چھٹی دینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے سرپرائز دینا تھا اسے کہ پاکستان پہنچتے ہی خبر دوں گا آنے کی۔ بس انتظار تھا کہ کب پہنچوں۔ پر ہوتے تو خود ہی اڑ آتا...... پہنچتے ہی میں نے اسے کال کی کہنے لگی ''کہاں ہو؟'' میں نے کہا۔

''پاکستان اور کل ملوں گا تم سے۔''

بولی ''رات میں فون کر کے بتاؤں گی۔''

میں بہت خوش تھا لیکن اس کے لہجے میں پہلے جیسا تسلسل نہ تھا۔ میں ساری رات انتظار کرتا رہا۔ رات کو اس کا میسج آیا۔ ''مجھے بھول جاؤ۔'' پھر میں نے اُسے کال کرنے کی بہت کوشش کی پر Power Off تھا۔

رات تو کشمکش میں کٹی...... صبح ہوتے ہی میں وہاں گیا جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ وہ وہیں موجود تھی...... بہت خوش تھی۔ وہی ادائیں، وہی شرارتی آنکھیں بنا کاجل کے پر میری جگہ وہ تھا۔ جسے وہ چاہتی تھی۔ شاید یہ وہی لڑکا تھا جس کے بارے میں وہ کہتی تھی کہ میرا ایک کزن ہے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ پر تم سے کم کرتا ہے، اور یہ بھی کہتی تھی کہ میرا کزن اکثر مجھے نادان کہتا ہے۔ کہتا ہے تمھیں محبت کا کچھ پتا ہی نہیں۔''

شاید میرے لیے یہ جاننے کے لیے کافی وقت تھا کہ اس نے کہاں...... کہاں اور کب کب مجھ سے محبت سیکھی۔

کوئی نہ تھا اب میرا وہاں۔ پھر میں واپس آ گیا ہاں اب اس سے بچھڑے ہوئے یہ دوسرا دسمبر ہے۔ دسمبر بھی ہے، میں ہوں بس اس کی یادیں ہیں پر وہ نہیں۔ وہ مجھ سے محبت کی طرح ناگزیر ہو چکی ہے۔

☆☆......☆☆

میں تو بھیا کی زندگی میں ہی بھیا کے مشورے پر دبئی چلا گیا تھا اور یہ سارے واقعات میرے پیچھے ہی رونما ہوئے تھے۔ میں دور پردیس میں سب سن کر خاموش رہا کہ ان دونوں بہنوں سے کچھ بھی باز پرس کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اور پھر جب سے بھیا نے دنیا اور میں نے ملک چھوڑا تھا۔ ان دونوں بہنوں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں تو اب ایک مشین تھا نوٹ چھاپنے والی مشین۔ میرا صرف اکام اتنا ہی تھا کہ دن رات نرگس کی خواہشیں پوری کرتا رہوں۔ میں چاہ کر بھی خود کو اس کی قید سے آزاد نہیں کر پا رہا تھا اور کرتا بھی کیسے؟ جو صیاد نرگس کی طرح ہوشیار اور شاطر ہوں۔ وہ مجھ جیسے بے وقوف قیدیوں کو کبھی آزاد نہیں ہونے دیتے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میری جان میری اکلوتی بیٹی رمشا ہے اور اس نے رمشا کو ہتھیار بنالیا تھا۔ یہ میری ایسی کمزوری تھی کہ وہ جب چاہے رمشا کے ذریعے اپنی بات منوالیتی تھی اور میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بے بس تھا۔

آہ! آج بھی سوچتا ہوں نہ جانے کس جرم کی سزا پائی ہے میں نے ساری زندگی۔ میرے والدین اور شریف النفس بھائی کا آخر کیا قصور تھا؟ یاد ہی نہیں آتا مجھے۔ عام طور پر لوگوں کو ان کے جرم کی سزا مل جاتی ہے مگر ہم شاید ایسے مجرم تھے۔ جن کا نہ تو کوئی جرم تھا اور نہ ہی خطا۔ مگر سزا ابھی تک بھگت رہے تھے۔ میں آج عمر کے آخری دور میں پڑا ہوں۔ مگر آج تک خالی دامن ہوں۔ نہ اس میں محبت کے کھنکتے سکے ہیں اور نہ ہی چاہت کے انمول موتی۔ صرف اور صرف دکھوں کے انگارے بھرے ہیں وہ دکھ جو جو بھائی نے مجھے انعام میں، ان کی بے پناہ عزت کرنے کا انعام، ان کا گھر بچانے کا انعام، ان کی بات مان کر سب کچھ حتیٰ کے اپنی زندگی بھی لٹادینے کا انعام اور وہ دکھ جو میری نصف بہتر نے مجھے دیے۔ نارسائی کا دکھ، ساری عمر یہ ہی شک رہا اسے کہ میں کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوں، اس شک کا دکھ، طعنوں کا دکھ، اور پھر سب سے بڑھ کر میری جان اکلوتی بیٹی کی ہمیشہ جدائی کا دکھ...... جی ہاں، ہمیشہ کی دائمی جدائی۔

نرگس کو جس طرح اپنی من مانی کرنے کی عادت تھی اس نے میری رمشا کے معاملے میں اپنی من مانی کی اور میری گڑیا میری رمشا کا نکاح بیلا کا بیٹا ارمغان کے ساتھ طے کردیا۔ میں نے اعتراض کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے فون پر ہی بے نقط سنا ئیں اور پھر میری ضد میں نکاح ہی نہیں رخصتی کروادی۔ یہ سوچے بغیر کہ ایک بہن کہ ساتھ اس کی ساری زندگی نہیں بنی تو میری شہزادی بیٹی کو اس کی دوسری بہن کیسے سکھ دے گی۔ اور بہن بھی وہ جسے میں بھری برادری میں ریجیکٹ کر چکا تھا۔ بیلا بھی شاید اس واقعے کو نہیں بھولی تھی۔ اسی لیے وہ بڑی خوشی اور جوش وخروش سے رمشا کو بیاہ کرلے آئی۔ مگر وہاں سترہ ہزار میل دور امریکہ میں اس کے ساتھ جانے کیا کیا ہوا کہ شادی کے آٹھ ماہ بعد اٹھارہ سال کی عمر میں میری جان! میری بچی زندگی کی بازی ہار گئی۔ میری شہزادیوں جیسی، پھولوں کلیوں جیسی بیٹی، دلہن کا خوبصورت روپ سجائے، ڈھیروں ارمان اور خواب لیے پیا دیس سدھاری، مگر واپس سفید کفن میں لپٹی، تابوت میں بند ہوکر آئی۔

آہ! یہ دکھ میری کمر توڑنے کو کافی تھا۔ میں اندر سے ڈھے گیا۔ میں اس دن اتنا رویا تھا مگر نرگس! وہ تو لگتا تھا جیسے پتھر ہوگئی ہو اور مزے کی بات، اس سمیت اس کی بہنیں اس سارے حادثے کا ذمہ دار مجھے سمجھتی تھیں کیوں کہ ان کے نزدیک سب سے بڑا مجرم میں ہی تو تھا کہ نہ میں بیلا کو ٹھکراتا اور نہ یہ سب ہوتا۔

میں آج بھی اپنی بیٹی کو اپنے امی ابو کو اور بھیا کو یاد کر کے بلک بلک کر روتا ہوں۔ میری بہنیں میری حالت دیکھ کر خون کے آنسو بہاتی ہیں اور میں صرف یہ سوچتا رہ جاتا ہوں مجھ سے کیا گناہ ہوا، کیا خطا ہوئی؟...... کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے کہ ختم ہی نہیں ہورہی ہے۔ اور اب میں ساتھ ساتھ نرگس کے پاگل پن، کو بھی جھیل رہا ہوں (کہ بیٹی کی بے وقت موت نے اس کو ہوش وخرد کی دنیا سے دور کردیا)۔

اس کے ظلم وستم جھیلنے کے بعد اب میں اس کے پاگل پن کو بھی جھیل رہا ہوں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرا جرم کیا ہے؟ کیوں یہ سزا سہتے میری ساری عمر گزر گئی......؟ اگر آپ کی سمجھ میں آئے تو مجھے بھی بتایئے گا۔

☆☆......☆☆

# کفارہ ہوا ادا

مومینہ بتول

اُس دوشیزہ نے صرف اپنا گھر بچانے کے لیے

نادانستگی میں کسی کو گناہوں کی دلدل کے سپرد کر دیا تھا

نوشابہ عمران عورتوں کے حقوقِ نسواں کی اک تنظیم 'حوا' کی روحِ رواں تھی۔ یہی نہیں اس کی اَن تھک محنت، سماجی مدد...... دوسروں کے لیے دل سے کام کرنے کی سچے جذبے کو دیکھ کر تنظیم 'حوا' کی بانی بیگم نیازی نے اُسے اپنا اسسٹنٹ بنا رکھا تھا۔ تنظیم کے ارکان میں شامل کئی خواتین اور لڑکیاں تھیں۔ لیکن بیگم نیازی نے اس پر خاص اعتماد کیا ہوا تھا۔ وہ اس سے خاص معاملات میں مشورے بھی کرتی تھیں۔ اس تنظیم کا کام معاشرے کی دھتکاری ہوئی مظلوم خواتین، زمانے کی ستائی ہوئی عورتوں تک پہنچ کر اُن کی مدد کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اُن کی اخلاقی ہمدردی و محبت کے ساتھ علاج معالجے کے بعد انہیں معاشرے کا اک فعال رکن بنانا بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بے آسرا خواتین کو توجہ اور راہ نمائی کے ساتھ مخلص افراد میسر آتے تو اُن کی زنگ آلود صلاحیتیں بھی بیدار ہونے لگتیں۔ نوشابہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سلجھی ہوئی اور حسن فطانت میں طاق لڑکی تھی۔ جس کا خاندانی بیک گراؤنڈ بھی کافی پڑھا لکھا تھا، اس کے والد کا شمار شہر کے سلجھے ہوئے علمی اشخاص میں ہوتا تھا۔ صاف گو، ملنسار اور سوجھ بوجھ رکھنے والی نوشابہ، عمران کی یونیورسٹی فیلو تھی۔ دونوں ذہنی طور پر ایک دوسرے کے کافی قریب تھے۔ لہٰذا جب عمران کی والدہ نے کامیاب زندگی کی ابتداء کرنے والے بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی ابتدا کی تو عمران نے اُن کو پریشانی سے بچانے کے لیے بے دھڑک نوشابہ کا نام لے دیا تھا۔ خود عمران بھی ایک پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد بھی شہر کے امیر لوگوں میں گنے جاتے تھے، لہٰذا بغیر کسی رکاوٹ کے اُس کا معصوم سا عشق کسی مشقت و مشکل کے شادی کی ڈور میں بندھ گیا تھا۔

شادی کے پہلے ہی سال جرنلزم کی ڈگری ملتے ہی نوشابہ نے عمران کی اجازت سے ایک اخبار جوائن کر لیا تھا اور پھر اُس نے گھر، شوہر، ملازمت کو کچھ اس طرح ڈیل کیا کہ کبھی کوئی مسئلہ اُن کے مابین کھڑا نہ ہو سکا تھا۔

نوشابہ کی ملاقات بیگم نیازی سے اُن کے ایک اخباری انٹرویو کے دوران ہی ہوئی تھی۔ اپنے بچوں کو اُن کی منزل پر پہنچانے کے بعد بیگم نیازی نے ڈیفنس میں واقع اپنے ہزار گز کے وسیع بنگلے کا آدھا حصہ معاشرے کی غریب و مظلوم خواتین کے نام سے 'سائبان' کے طور پر مختص کر دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنی اس این جی او کو چلا رہی تھیں۔ اُن کا ایک بیٹا اور بیٹی بیرون ملک ہنسی خوشی رہ رہے تھے، جبکہ بیگم نوشابہ نے تنہا زندگی کا سہارا معاشرے کی مظلوم لڑکیوں کی مدد کرنے میں ڈھونڈ لیا تھا۔



نوشابہ دوران انٹرویو ہی اُن کی ذات، اخلاقی اقدار اور اُن کی دُکھی دل خدمت پر اُن کے عزائم سے اس حد تک متاثر ہوئی تھی کہ وہ بھی اس میں بحیثیت ایک رکن اُن کی ٹیم میں شامل ہوگئی، یہی نہیں بلکہ اُس نے آنے والے دنوں میں مصروفیات بڑھ جانے کی وجہ سے اخباری ملازمت کو خیرباد کہہ کر کل وقتی طور پر اپنی خدمات 'حوا' کے نام کردی تھی۔ اس کی آمد سے تو جیسے بیگم نیازی کو دو آنکھیں بطور نعمت مزید مل گئی تھیں۔ انہوں نے نوشابہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی صلاحیتوں کو ادارے کا تحفظ قرار دے کر اپنے قریب ترین ساتھی کا درجہ دے دیا اور ادارے کی خدمات اس کے سپرد کردیں۔ نوشابہ کے اس غیر متوقع اور اچانک فیصلے پر عمران نے بھی کوئی قدغن نہیں لگائی تھی۔ ویسے بھی اُس کی شادی کو چار سال ہو رہے تھے۔ اور یہ بھی مشیت ایزدی تھی کہ وہ ماں نہ بن سکی تھی، اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود...... پھر دونوں نے خدا کے آگے اُس کی رضا کے سامنے یہ کہہ کر سر خم کردیا تھا کہ خدا کے یہاں دیر سہی مگر وقت آنے پر اللہ تعالیٰ انہیں ضرور اولاد کی نعمت سے مالا مال کرے گا۔

آفس پہنچ کر بھی نوشابہ کل کی ادھوری فائل پر کام کررہی تھی کہ بیگم نیازی نے اُسے آفس میں طلب کرلیا۔ وہ اپنے روم سے نکل کر میڈم کے آفس پہنچی تو دردانہ وہیں موجود تھی۔ وہ بھی اُس کی ہی طرح اس تنظیم کی ورکر تھی۔ مگر دونوں کے عہدوں میں بڑا فرق تھا۔

علیک سلیک کے بعد بیگم نیازی نے اُسے دومن تھانے سے اپنی ضمانت پر لائی جانے والی نو لڑکیوں کی انٹری فائل دی۔ اُن نو میں سے دو کو ان کی ذہنی و جسمانی خراب حالت کی وجہ سے اسپتال منتقل کردیا گیا تھا، جبکہ سات لڑکیاں سائبان پہنچادی گئی تھیں۔

بیگم نیازی کی جانب سے اُسے اور دردانہ کو یہ ہدایت ملی تھی کہ انہیں نہایت توجہ، محبت اور اعتماد میں لے کر اُن خواتین کی اُس تاریک زندگی سے وابستہ حالات رپورٹ کرنا ہیں، جس کی وجہ سے وہ اس مذموم گھناؤنے کام میں شامل ہوئیں۔ ان لڑکیوں کو فحاشی کے الزام میں ایک پوش علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ ایک فلیٹ کے کمرے سے دادِ عیش دیتے ہوئے برہنہ حالت میں گرفتار ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ پکڑے جانے والے مردوں نے اپنے اثر و رسوخ کے سبب پولیس سے مک مکا کر کے جان چھڑا لی تھی۔ جبکہ یہ لڑکیاں دو دن تھانے کی زینت بنا دی گئی تھیں۔ میڈم نیازی انہیں اپنی ضمانت پر لے کر آئی تھیں۔

جب بیگم نیازی کو لڑکیوں کی گرفتاری کی اطلاع ملی تھی تو وہ فوراً ابنتِ حوا کے لیے کھڑی ہوگئی تھیں، انہیں گناہ کی دلدل سے نکالنے کے لیے اور کچھ دیر بعد ہی تمام لڑکیاں، اُن کے آفس میں موجود تھیں۔

نوشابہ اور دردانہ کو ہدایات دے کر بیگم نیازی جا چکی تھیں۔ دردانہ قلم سنبھالے، ایک ایک لڑکی سے اُس کے حالاتِ زندگی معلوم کر رہی تھی جو کچھ وہ اپنے بارے میں بتا رہی تھیں، وہ سن رہی تھی، بلکہ نوشابہ ایک ایک نکتے اور ایک ایک زاویے سے نپے تلے سوالات کر رہی تھی۔ اُس کا مقصد اُن لڑکیوں کی نیتوں کو بھانپنا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہ رہی تھی کہ آخر کون سی ایسی وجہ ہے جس نے انہیں تباہی کے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا اور وہ سستے داموں اپنی عزتوں کا سودا کر رہی تھیں۔ واقعتاً وہ مجبور و معذور تھیں یا محض جنسی لذت کے لیے وہ غیر مردوں کی بانہوں میں کھیل رہی تھیں یا انہیں کھلونا بنا کر بیچا گیا تھا۔ وہ تمام پہلو مدنظر رکھے ہوئے تھی۔

وہ چوتھے نمبر پر آنے والی لڑکی تھی۔ انتہائی خوبصورت نازک اندام سونے جیسی چمکتی رنگت، جسے تاریک راہوں کے سفر نے بھی آلودہ نہیں کیا تھا۔ لیکن سحر ہونے سے پہلے انسان نما بھیڑیے اس کی عصمت کو تار تار کر چکے تھے۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہی یوں گویا ہوئی۔

"آپ کا نام نوشابہ عمران ہے نا؟ آپ مجھے نہیں پہچانتیں، مگر میں آپ کو کبھی بھی نہیں بھول سکتی۔" اُس کا لہجہ گلوگیر تھا اور نوشابہ...... وہ تو ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی تھی۔

وہ تو ہونق چہرہ لیے اس لڑکی کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی مجھے پہچانتی ہے مگر......

"کب...... کہاں...... کون؟" کی تکرار اُس کے ذہن و دل میں گونجنے لگی تھی۔ وہ جہان حیرت میں غوطے کھاتی اس لڑکی کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی کہ آخر یہ کون ہے؟ جس نے مجھے بطور خاص پہچان کر ایک ہلچل سی مچا دی ہے۔ نوشابہ کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا کہ لڑکی نے کہنا شروع کیا۔ "آپ مری کے ہوٹل 'ہالی ڈے اِن مری' کے ویٹر گلفام کو کیسے بھول سکتی ہیں؟" اور پھر کئی پردے نوشابہ کی آنکھوں سے سرکتے چلے گئے۔

اُسے یاد آ گیا تھا کہ تمام تر تیاریوں کے باوجود شادی کے فوراً بعد وہ اپنا ہنی مون سیلیبریٹ نہیں کر سکے تھے۔ کیونکہ اچانک اس کے سُسر کی سیریس حالت کی وجہ سے وہ پلان از خود ختم ہو گیا تھا، مگر شادی کی پہلی سالگرہ عمران نے مری کے ہوٹل میں ہی منائی تھی، یوں اِن کا ہنی مون لیٹ سہی مگر...... سال بعد، اُسی طرح منایا گیا تھا اور وہیں عمران کی ملاقات اُس ویٹر گلفام سے ہوئی تھی۔ بس یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اُس کی بھی اپنی دوسری کی وہی ڈیٹ تھی، جو نوشابہ اور عمران کی تھی۔ یہی ایک چھوٹی سی وجہ اُن پندرہ دنوں میں ایک اٹوٹ دوستی کی بنیاد بن گئی تھی اور اُن کے کراچی لوٹنے سے پہلے گلفام نے رات کے کھانے پر اُن دونوں کو انوائٹ کیا تھا۔ اپنی فیملی سے ملانے کے بہانے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت کشمیری گھرانہ تھا۔ جہاں محبتوں میں گندھے رشتوں کی مہک نے اس ماحول کو مہکا رکھا تھا۔ گلفام کی خوبصورت پری جیسی دلہن پروشہ۔ نوشابہ کے ذہن میں ایک فلم تھی جو تسلسل کے ساتھ مختلف واقعات کو تصاویر کی کڑیوں سے جوڑ رہی تھی۔ اس کے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ سوچ نہیں سکتی تھی کہ یہ وہی پروشہ تھی، شرمائی لجائی سی، کجراری آنکھوں والی، جس کی معصومیت، پاکیزگی، پر وہ خود ایک عورت ہونے کے باوجود فدا ہو گئی تھی۔

جھرنوں اور آبشاروں کے دیس میں رہنے والی وہی پروشہ آج ایک آبرو باختہ عورت کا ٹائٹل سجائے۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی اور اسے اپنی داستانِ غم سنا رہی تھی۔ آپ لوگوں سے مل کر ہمارا پورا

گھرانہ بے حد خوش تھا۔ گلفام تو دیوانہ ہو گیا تھا آپ دونوں کا۔ آپ کے اخلاق، آپ کی محبت و خلوص کا۔ جب عمران صاحب نے اُس کی تعلیم، اُس کے ڈپلومے کا سُن کر کہا تھا کہ وہ کراچی پہنچتے ہی اُس کے لیے جاب تلاش کر کے اُسے اپنے پاس بلائیں گے، تب سے تو وہ بے تاب سا ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اچھی تعلیم کے بعد اچھی جاب سے اپنا فرض نبھائے۔ بوڑھے والدین کا فرض ادا کرے۔ اپنی اکلوتی بہن اور بھائی کی اچھی جگہ شادی کر کے ایک پکی چھت بنوائے، ماں باپ کو حج کرائے۔

وہ دن رات اُٹھتے بیٹھتے زندگی کا ایک حسین اَن دیکھا، سکون بھرا خواب بُننے لگا تھا۔ اُس نے تو آپ لوگوں کے سیل نمبرز بھی ازبر کر لیے تھے۔ اس کی زبان پر صرف آپ لوگوں کی باتیں اور یادیں رہتی تھیں۔ اس نے مجھے یکسر فراموش کر دیا تھا۔ میں اس کی ان باتوں پر اکثر جھنجلاتی تھی باجی، مگر پھر مجھے خیال آتا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، ہمارے لیے ہی تو کر رہا ہے۔ بس باجی صاحبہ...... میں نے بھی پندرہ بیس بار رٹا لگا کر آپ کا موبائل نمبر رٹ کر زبانی یاد کر لیا تھا۔ اور پھر آپ کو بھی یاد ہو گا کہ ہم پر قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔

جی ہاں...... 8 اکتوبر 2005ء کا قیامت خیز زلزلہ جو نہ جانے کتنے لوگ، کتنے خاندانوں کو نگل گیا، اُن کے خواب، اُن کی خواہشوں سمیت، حالانکہ اُس سحر کی صبح بھی عام صبح جیسی ہی تھی۔ لوگ سب حسبِ معمول اپنے کاموں کی طرف اور بچے اسکول پہنچے تھے۔ گھر والیاں، گھر کے کاموں میں معروف تھیں کہ صورِ اسرافیل کی مانند...... خوفناک چنگاڑیں، گڑگڑاہٹیں، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پہاڑوں میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ پہاڑ ایسے لرز رہے تھے جیسے تنکے ہوا میں اڑتے ہیں۔ پتھر روئی کی طرح اُڑ رہے تھے۔ لمحے بھر میں سب کچھ تلپٹ ہو گیا تھا۔ زندگی زیرِ خاک اور موت سطح زمین پر تیر رہی تھی۔ آہوں، سسکیوں کے سوا کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ زخمیوں کی چیخ و پکار نے کانوں کے پردے سُن کر دیے تھے۔ وہ شہر جو لمحہ بھر پہلے زندگی کی پہچان تھا جیتی جاگتی سانس لیتی جانوں کو لے کر اُلٹ گیا تھا۔ ہر سُو قیامت تھی، سسکتے بین کرتے لوگ...... کچھ ہی دیر میں موت کی گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ بچھڑے خاندان ماتم کناں تھے۔

ٹنوں ملبے میں پھنسے خون آلود لوگ زندگی کی بازی ہار چکے تھے...... کہیں کہیں سسکتی بلکتی آوازیں آ رہی تھیں مگر...... کون تھا ایسا جو انہیں حیاتِ نو دیتا۔ وہاں تو نفسا نفسی کا وہ عالم تھا کہ زندہ بھی خود کو مُردوں میں ہی گِن رہے تھے۔ وہ خود کسی کی مدد کے طالب تھے۔

بکھرے انسانی اعضاء لاشوں کے ڈھیر، روتے بلکتے بچ جانے والے لوگ، منہدم گھر، کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا۔ ہمارے محلے سمیت ہمارا گھرانہ بھی زمین بوس ہو چکا تھا۔ ہم جیسے غریب لوگوں کے مٹی کے گھر...... اور اب اسی بے مایہ مٹی میں ہمارے جیسے لاکھوں وجود لمحے بھر میں 'مٹی' ہو گئے تھے۔ خدا جانے کون بچا...... اگر کوئی بچا بھی تو پھر آج تک مل نہیں پایا۔ مہینوں میرے ٹوٹے پھوٹے ریزہ وجود پر ڈاکٹروں نے علاج کا مرہم رکھا۔ کچھ عرصے بعد زخمی جسم کے گھاؤ تو بھر گئے مگر روح کے گھاؤ تو ابھی بھی رس رہے ہیں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں تھے وہ کہہ رہی تھی۔

''باجی صاحبہ...... جو زندہ بچے تھے، زندہ ہونے کے باوجود لاش بن گئے تھے۔ پورا ملک انسانی ہمدردی کا جذبہ لے کر ہر سطح، ہر طبقے کا شخص جذبۂ خدمت لیے خدائی اہلکار بنا ہمارے مٹے ہوئے راولاکوٹ آ پہنچا تھا۔ جن کی سچی حب الوطنی اور انسانی بھائی چارے کی عظیم مثال پر کوئی شک نہیں تھا۔ مگر ایک اور زلزلہ میری ذات کے لیے بھی تیار تھا۔ اُن سادہ لوح ہمدردوں کے بیچ مکروہ چہرے والے، شرافت کا لبادہ اوڑھے لٹیروں میں سے ایک کاذب بھی اپنے چہرے پر ہمدردی کا غازہ چڑھائے، انسانیت کا نقاب اوڑھے میرے نام نہاد چچا کے روپ میں مجھے اسپتال سے ڈسچارج کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور اس کے کچھ ساتھی بھی اسی طرح جھوٹ سچ حلفیہ بیان دے کر پانچ لڑکیوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اسی دن ہمیں لاہور لے آئے۔

باجی صاحبہ مہینوں ہمیں اس دلدل میں اُن کے کالے کرتوتوں کا علم ہی نہ ہو سکا۔ کیونکہ انہوں نے چہروں پر نقاب جو چڑھائے ہوئے تھے۔ ہماری نظر میں تو وہ ہمارے محافظ، ہمارے ہمدرد تھے۔ جو زلزلے میں پورے پورے خاندان کو کھو بیٹھنے والی لڑکیوں کو چچا، تایا، ماموں بن کر اُن کو تحفظ دے رہے تھے۔

وہ ہمیں اچھا کھلا پلا رہے تھے، توجہ دے رہے تھے، دن رات دل جوئی کر رہے تھے۔ ہر ہفتے پندرہ دن بعد صحت مند نظر آنے والی لڑکیوں کو مزید بہتر علاج کے نام پر لے جایا جاتا تھا، مگر پھر کبھی وہ لڑکی ہمیں دکھائی نہ دیتی تھی، البتہ اس کی جگہ کوئی اور مظلوم لے لیتی تھی۔

ہمیں روز یہ بتایا جاتا کہ رضا کار ابھی تک ہمارے پیاروں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا مگر اندرونِ خانہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ کی ایک لڑکی کشمالہ نام کی تھی۔ یہی وہ لڑکی تھی جس نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے ساتھ کچھ غلط ہونے جا رہا ہے۔ وجہ پڑھی لکھی بڑی خوبصورت اور ذہین لڑکی تھی۔ اس کی حس بہت تیز تھی اور وہ خطرے کو بروقت محسوس بھی کر لیتی تھی لیکن......

ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم انتہائی مجبور ولاچار تھے، ہمیں کوئی راستہ بتانے والا تھا نہ ہی ہاتھ تھامنے والا۔ ہم کس طرح اُن سے دامن چھڑا سکتے تھے۔ ہمیں اس کا علم ہی نہیں تھا۔ ہم تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئے تھے۔ ہمیں تو وہ تنکا ہی کافی معلوم ہوتا جو ڈوبنے والے کو مل جائے تو اُس کے لیے وہی زندگی کی نوید ہوتا ہے۔

ہمیں ہفتے میں 2 بار ذہنی تفریح کے نام پر فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں جو کہ چھانٹ کر منتخب کی ہوئی ہوتیں، جس سے انسانی نفسیات پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ ہمیں لوگوں کو امپریس کرنے کے طریقے بھی بتائے جاتے تھے۔ اسی دوران عجیب وغریب صورتوں والی عورتوں کا مصنوعی روتا بلکتا، چہرہ بھی نظر آنے لگتا تھا، جو کسی لڑکی کو بیٹی کی صورت ممتا کی خالی جھولی میں بھرتیں، تو کوئی بچھڑی بیٹی کو ہم شکل قرار دے کر اس لڑکی کو لے جاتی۔ تب نہ جانے کیسے کشمالہ یہ ہولناک انکشاف لے کر آئی تھی کہ ہم تمام بھیڑیے نما درندوں کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔ ہماری ایک ایک نقل وحرکت کو فوکس کیا جاتا ہے۔ اور اب...... جو کچھ انہوں نے ہم پر خرچا کیا تھا اُس کو وصولنے کا وقت آ چکا تھا۔'' یہ کہہ کر پروشہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی اور خالی خالی نگاہوں سے دیواروں کو گھورنے لگی۔ میں خاموش بت بنی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں اس سے کچھ کہوں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

''باجی...... قدرت کے ڈھائے زلزلے سے ہم سے ہمارے پیارے، ہمارے گھر، ہماری خوشیاں چھین لی تھیں، لیکن ان مکروہ انسانوں کے لائے زلزلے نے تو ہم سے ہماری شناخت، ہماری ناموس اور ہماری عصمت وعفت تک چھین لینی تھی۔'' پروشہ کی آنکھوں میں آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اس کی آواز رندھ چکی تھی اور وہ ذہنی طور پر انتہائی منتشر ہو چکی تھی، لیکن اپنی بپتا مسلسل سنائے جا رہی تھی۔ آہوں اور سسکیوں کے درمیان وہ کہہ رہی تھی۔

''باجی! کوئی راہ نہیں تھی۔ کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ تب میرے ذہن میں گلفام کی آواز گونجی تھی۔ وہ میرے جھنجلانے پر پیار سے سمجھا رہا تھا۔

''ارے پگلی صاحب لوگوں کے نمبر ذہن کی ڈائری سے کوئی نہیں مٹا سکتا تُو صدا کی بھلکڑ ہے۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں، ضرور مجھے کراچی بلوائیں گے تب...... تجھے مجھ سے رابطے میں آسانی ہوگی۔'' تب...... باجی صاحبہ...... مجھے آپ لوگ نجات دہندہ لگے۔ مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں اُمید کی کرن جھلملائی تھی۔ لیکن نمبر یاد ہونے کے باوجود ہمارے پاس سیل فون نہیں تھا۔ پی ٹی سی ایل پر آبزرویشن لگی ہوئی تھی۔ ہمیں کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل رہا ہے۔ مگر تنکا کہاں تھا؟ پھر کشمالہ ہی تھی جس نے جانے کون سے جتن کر کے اس نوعمر سوپر کو راضی کیا تھا کہ محض کچھ دیر کے لیے وہ اپنا موبائل ہمیں دے یا ہمارے دیے گئے نمبر پر کال کر کے ہماری بات کرا دے۔ وہ معصوم بچہ ہم لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پسیج گیا تھا اور دوسرے دن ہی اپنے باپ کا کھٹارا سا موبائل مع بیلنس لے آیا تھا۔ اس کے اس احسان کے جواب میں ایک دوسری لڑکی نے اپنی کانوں کی بھاری بالیاں اُتار کر اُسے دے دی تھیں۔ اُس کے لاکھ انکار کے باوجود...... اسے لینے پر مجبور کیا تھا کہ یہ کسی احسان کا بدلہ نہیں ہے بلکہ ہم اسے اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔

سچ باجی...... اُس روز وہ خاکروب بچہ...... ہمیں اپنے پیاروں کے وجود سے بھی زیادہ پیارا لگا تھا۔ پھر اس کے کام کے دوران...... ہم نے چھپ چھپ کر ان نمبروں پر کال کی تھی۔ بیل جا رہی تھی۔ مگر کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا، کافی دیر تک اُس خاکروب بچے کے کام کے دوران ہم میں سے ہر لڑکی باری باری کال کرتی رہی، نمبر ملاتی رہی، دو مرتبہ

صاحب جی نے فون اٹھایا، ہیلو کہا بھی مگر اس سے پہلے کہ بات ہوتی، یوں لگا جیسے کسی نے اُن کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا ہو۔ ایک مرتبہ آپ کی آواز بھی مجھے سنائی دی تھی۔ مگر آپ نے سخت لہجے میں ڈانٹ کر فون رکھ دیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری اُمید کا دامن بھی چھوٹ گیا۔ پھر ہم رابطہ نہ کرسکے۔ باجی ہم سب بکھر گئے۔ کبھی نہ ملنے کے لیے...... ہمارا دامن محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ برائی کا تو ایک چھینٹا عابد کے دامن کو داغدار کردیتا ہے۔ ہم تو پور پور غلاظت میں بھر گئے تھے۔ عرصہ ہوا عزت، ناموس، شرم وحیا جیسے لفظوں کے معنی ہم سے کھو گئے ہیں۔ اب تو بس کالے دل والی، کالے کرتوت والی میڈم کے لیے کام کررہے ہیں۔ ان کی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ بدلے میں وہ ہمیں سر چھپانے کی جگہ، کھانا، کپڑا لتا دیتی ہیں۔ ہماری ہر ضرورت کا بغیر کہے خیال رکھتی ہیں۔ بس ہماری یہی زندگی رہ گئی ہے...... اور میں، میں تو آبرو باختہ ہونے کے بعد تو جیسے سارے زمانے ہی نہیں بلکہ آپ کے لیے بھی مرچکی ہوں۔ اب تو میں صرف ایک لاش کی صورت زندہ ہوں۔ آپ خود سوچیں کہ مرنے والے کو یہ احساس کہاں...... اب تو میں وہ لاش ہوں کہ مجھے زندہ دفن کرکے گنگا میں بہادیا جائے۔

پروشہ آہوں اور سسکیوں کے درمیان اپنی داستانِ بربادی سُنا کر خاموش ہوگئی تھی۔ اب وہ اپنی آپ بیتی سنانے کے بعد بغیر کسی تاثر کے سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔

دردانہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کررہی تھی اور نوشابہ...... وہ تو جیسے پتھر کا بت بن گئی تھی۔ اور شاید وہ کوئی رسپانس نہ پاکر ہی اُن لڑکیوں کو اُن کے کمروں میں پہنچانے کے لیے چلی گئی تھی۔

پھر تنہائی ملتے ہی نوشابہ جیسے سسک اٹھی تھی۔ احساسِ ندامت نے اس کے دل کو جیسے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ اُسے لمحہ لمحہ یاد آرہا تھا۔ بھلا وہ کیسے اُس وقت کو بھول سکتی تھی، جب اُس کے شدید اصرار پر عمران زلزلے کا آنکھوں دیکھا حال دیکھ کر لوٹا تھا۔ اس عذاب ناگہانی نے نہ جانے کتنے خاندان نگل لیے تھے گلفام اور اس کے گھر والوں کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ شاید دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی پیوندِ خاک ہوگئے تھے۔ عمران اور نوشابہ نے ہفتوں گلفام کی فیملی کا دکھ منایا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ خود کو صبر دلانے میں کامیاب ہوئی تھی اور اُسی سال کے آخر میں اچانک اُس کی ساس کو بیٹے کے یہاں اولاد نہ ہونے کا صدمہ بھی شدت اختیار کرگیا تھا۔ اس کی وجہ وہ رپورٹس ٹھہری تھیں، جس میں انتہائی واضح اور صاف طور پر بتایا گیا تھا کہ یہ اُس کی کمزوری تھی، مگر کچھ بھی تھا عمران اُس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ اُس کا شوہر تھا، بھلا وہ کیسے اپنے شوہر کا بٹوارہ برداشت کرلیتی۔ وہ نہ صرف عمران بلکہ پورے سُسرال کے آگے ڈٹ گئی تھی۔ خود عمران بھی ماں کے آگے مجبور ہوگئے تھے۔ کیونکہ اُس کی پھوپو کی بیٹی بیوہ ہوکر گھر بیٹھی تھی اور اُس کی ساس کا خیال تھا کہ عمران آرام سے دو بیویوں کو افورڈ کرسکتا ہے۔

جب سے اس نے یہ بات اپنے کھلے کانوں سے سنی تھی نوشابہ کی تو جیسے جان پر بن آئی تھی۔ اُسے عمران کے بہلاوے، سمجھاوے، کھوکھلے محسوس ہورہے تھے۔

یہ تو محض اک بہانا تھا کہ اُس کے سُسر نے گھنٹوں بیٹھ کر شریعت کے اسرار ورموز اُسے سمجھائے تھے اور بڑی سہولت سے کہا تھا کہ اسلام بخوشی دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے۔ تم باشعور ہو، سب جانتی ہو، ابھی تو نہیں مگر زندگی کے آخر وقت میں تمہیں اور عمران کو شدت سے اولاد کی کمی محسوس ہوگی۔ مگر وہ نوشابہ تھی۔

یہ بات قطعاً درست بھی تھی کہ عمران اگر اُس سے کچھ بیزار ہورہا تھا تو وہ بھی اک کم فہم جھگڑالو، بدزبان بیوی کے طور پر سامنے آئی تھی۔ وہ شدید طور پر احساسِ محرومی کا شکار ہوچکی تھی۔ پھر یہ کہ وہ بھی تو سائے کی طرح عمران کے ساتھ چپک گئی تھی۔ اُس کے آنے جانے کے اوقات پر نظر رکھنا، اُس کے کپڑوں کو تلاشنا، والٹ کی تمام تر چیزوں کو چیک کرنا، موبائل چیک کرنا، غرض اُس نے عمران کو زچ کردیا تھا۔ اُسے وہ دن بھی خوب یاد تھا جب عمران بہت رسان سے، بڑے پیار سے اُسے سمجھا رہا تھا۔ اپنی صفائی پیش کررہا تھا۔ دوسری شادی جیسی حماقت سے باز آنے کا وعدہ کررہا تھا، جب اُسے انجان نمبر سے کال موصول ہوئی تھی۔ نوشابہ نے کسی شکاری کی طرح وہ نمبر ذہن میں محفوظ کرکے بڑی تیزی سے کال کاٹ دی تھی۔ اُس کے خیال میں یہ نیا نمبر اُس کی طالب امیدوار، اُس کی پھوپو زاد کا تھا۔ اور پھر ہر بار بلکہ بار بار نوشابہ نے اُس نمبر

کو کاٹا۔ ایک مرتبہ عمران نے ریسو بھی کر لیا مگر نوشابہ نے چیل کی طرح جھپٹ کر موبائل اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ اس کے باوجود آخر تک عمران اُسے یقین دلاتا رہا کہ یہ اُس کی پھوپوزاد کا نمبر نہیں ہے۔ یہ نامعلوم کون ہے؟ اور یہ بھی قدرت کی ستم گری تھی کہ جب بھی اُس نمبر سے کال آئی تھی تو نوشابہ کے سامنے آئی۔ اور آخری بار تو نوشابہ نے کال ریسو کر کے سخت سُست بھی کہا تھا۔

کیونکہ اُس کے بعد نوشابہ نے غصے میں موبائل ہی دیوار پر کھینچ مارا تھا۔ اس بات پر تو عمران نے اُسے ایک زور دار تھپڑ بھی رسید کر دیا تھا...... بس پھر کیا تھا۔ نوشابہ نے خود کو کمرے میں بند کر کے نیند کی گولیاں نگل لی تھیں۔

اور بس...... یہ ہی اُس ڈرامے کا ڈراپ سین تھا۔ عمران بروقت اسے اسپتال لے گیا تھا اور آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا اور اپنے ارادے سے بھی توبہ کر لی تھی کہ اُس سے انجانے میں کس قدر بڑی بھول ہو گئی تھی۔ اسی فاش غلطی سے، جس نے اُمید و یاس کے دامن کو تار تار کر دیا تھا۔ اک نہیں...... حوا کی کئی معصوم بیٹیوں کو گناہوں کے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ ہر چند کہ اُسے کچھ علم نہ تھا مگر اُس کی ایک چھوٹی سی غلطی، بنتِ حوا کے ماتھے پر کالک مل چکی تھی۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی نادانستگی میں ایک گناہ، گناہِ کبیرہ کی مرتکب ہو چکی تھی۔ شاید اُس کی تقدیر میں نہ چاہتے ہوئے بھی...... عذابوں کی گناہوں کی دلدل میں دھنسنا لکھا تھا۔

پروشہ تو اس حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر نوشابہ...... اب وہ سب کچھ جان گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود آپ...... اپنے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اک گنہگار کی صورت...... کاش اے کاش۔ وہ ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو چکی تھی۔ گھر جا کر پہلے اُس نے ساری بات بتا کر عمران سے معافی چاہی تھی جو ساری کہانی سننے کے بعد خود بھی دم بخود بیٹھا تھا۔

کافی دیر بعد وہ سکتے کی کیفیت سے باہر نکلا اور بولا۔

''نوشابہ یہ تو طے ہے کہ اگر وہ رابطہ ہو جاتا تم خود پر قابو رکھتیں اور مجھے فون سننے دیتیں تو ہم کچھ زیادہ نہیں مگر کچھ تو کر سکتے تھے ان لوگوں کے لیے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ اگر ہم چھوٹی سی ابتداء کرتے تو پھر بڑے پیمانے پر بھی امداد شروع ہو سکتی تھی۔ شرط صرف ابتداء کرنے کی تھی لیکن ہم نے تو......''

عمران ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ احساسِ ندامت نے نوشابہ کے آنسوؤں کی صورت اُس کا دامن تھام لیا تھا۔

اس صدمے کے سبب وہ پورے پندرہ دن آفس نہ جا سکی تھی۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ بیگم نیازی کو اُس کی طبیعت خراب ہونے کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ لیکن وہ اُن لڑکیوں کے معاملات میں مصروف تھیں کیونکہ اب وہ لڑکیاں دوبارہ گناہ آلود زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ لہٰذا بیگم نیازی کو اعلیٰ سطح پر کوشش کرنا پڑ رہی تھیں۔ وہ اس سلسلے میں بااثر افراد سے رابطے میں تھیں اور اکثر اس کام کے حوالے سے اِدھر اُدھر جانا پڑ رہا تھا۔ وقت کی قلت آڑے آ رہی تھی اور......

اس تمام کارروائی کے دوران نوشابہ ایک روز بھی آفس جا کر اُن معصوم لڑکیوں کا سامنا نہ کر سکی تھی۔ وہ اب سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا کرے کہ اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کر سکے۔ ہر چند کہ یہ کفارہ پروشہ کے دامن کے داغ کو دھو نہ سکے گا مگر اک کوشش...... اک قدم...... اور پھر...... نادانی میں کی گئی اُس نادانی، خطا کا کفارہ۔

آخر نوشابہ کو کچھ سجھائی دے گیا تھا۔ اُس نے تہجد پڑھ پڑھ کر اپنے رب سے معافی مانگی، اور اک مانگا...... اشارہ مانگا...... اور رب رحیم نے اُسے شاید معاف ہی کر دیا تھا۔ تبھی تو اک انوکھا خیال اُسے سوجھا۔ وہ احتساب کے کٹہرے میں ضرور کھڑی ہوگی۔ اس نے سنجیدہ ذہن سے سوچا۔ پھر اس نے اسلام کے دیے ہوئے شرعی حق کا استعمال کیا تھا۔ اُس نے بنتِ حوا کے سر پر اپنے سہاگ کی چادر ڈال کر...... پروشہ کو عمران کا نام دینے والی نوشابہ خود اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔

آج کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرا اٹھا تھا۔ بس قدرت کے گلزار میں چند پھول مہکنے کی دیر تھی۔ آج نوشابہ نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کیا تھا جس پر فلک بھی جھوم اٹھا تھا اور سحر بھی پھوٹ پڑی تھی۔ عمران نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ جنت بے نظیر کا ٹکڑا اس طرح اس کی جنت کو مہکا جائے گا اور وہ پھولوں کے مابین بھنورا بنا رہے گا۔ کاش کہ یہ کام ذرا پہلے ہو جاتا...... یہ جملہ بار بار ان تینوں کی زبان پر آ رہا تھا مگر...... ہوتا وہ ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

☆☆......☆☆

# آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!



آیئے! سچی کہانیاں کے قلم قبیلے میں شامل ہو جایئے۔

یہ کارواں آپ کو خوش آمدید کہتا ہے......

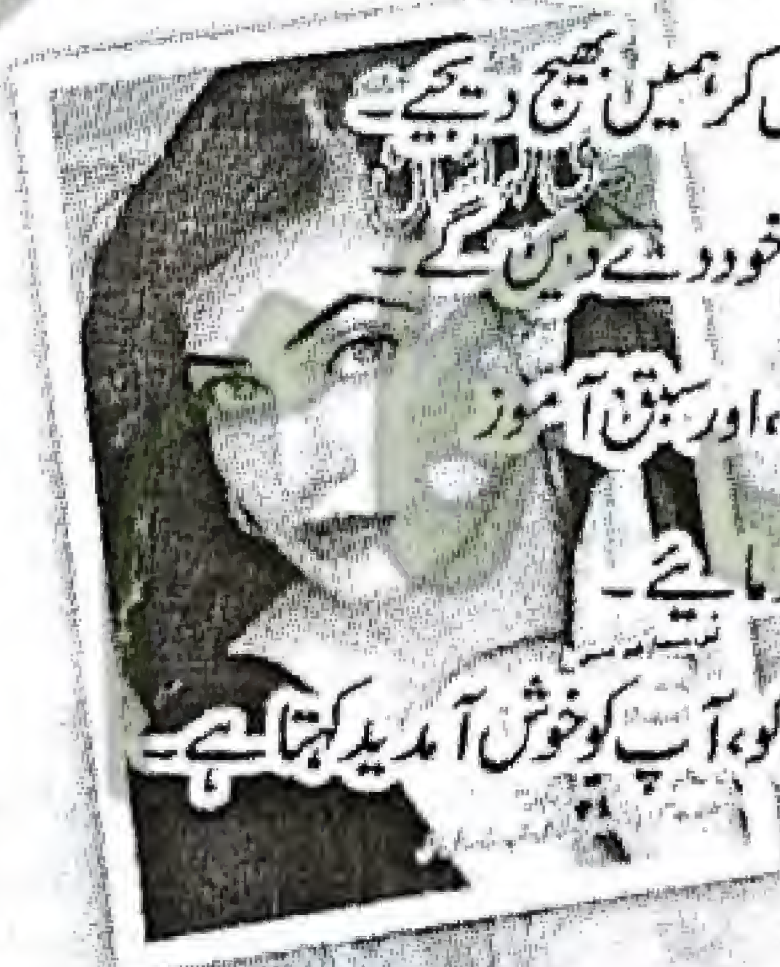
خود کو منوایئے، اپنے قلم سے......

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کو اپنے آس پاس ہوئے، انہونے اور لرزا دینے

والے واقعات یاد رہتے ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ ان

واقعات سے دوسرے بھی سبق سیکھیں، تو پھر فوری طور پر ان



واقعات و حادثات کو صفحہ قرطاس پر ڈھال کر ہمیں بھیج دیجیے۔

نوک پلک سنوار کر اُسے کہانی کی شکل ہم خود دے دیں گے۔

تو پھر قلم اٹھایئے اور کسی بھی عبرت ناک، اور سبق آموز

سچ کو کہانی میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمایئے۔

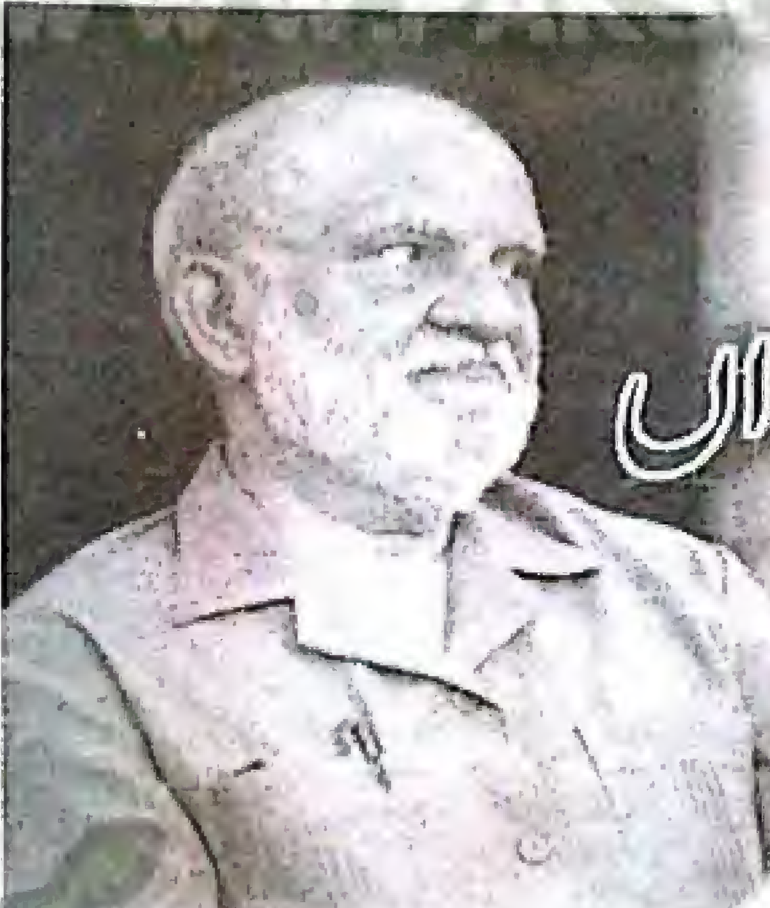
ماہنامہ سچی کہانیاں آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتا:

88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

ای میل :pearlpublications@hotmail.com

سفر نامہ



# برطانیہ میں خزاں

محمود شام

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر، عظیم صحافی اور شاعر محمود شام کے برطانیہ میں گزرے اُن لمحات کا ذکر جو اَمر ہو گئے
ایسا سفرنامہ جسے پڑھ کر قاری خود کو اُن ہی مناظر کا حصہ محسوس کرتا ہے

چھٹا حصہ

## سوہو کی سرخ روشنی

جوئے کی ان مشینوں پر نوجوان بہت ہی کم دکھائی دے رہے ہیں۔
وہ اپنی قسمت ان معمولی سکوں پر نہیں آزماتے۔ ان کی مصروفیات آج کل بہت مختلف ہیں۔

حبیب الرحمٰن آتے ہی زیر زمین ریل والوں کو گالیاں سناتے ہیں۔ بم الرٹ کی وجہ سے ایک روٹ کی گاڑیاں بند تھیں۔ دوسری روٹ کی ٹرین دیر لگاتی ہے۔ لابی میں ایک خالی جگہ بیٹھ کر آج کا پروگرام بناتے ہیں۔ ہم وہ سب کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو انسان کو مرنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے۔ جو انسان کو مرنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے۔ اور جس جس سے بھی عبرت حاصل ہو۔

ہم لندن کے سب سے مرکزی اور سب سے مہنگے علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ جہاں ایک چھوٹا سا کمرہ بھی بہت زیادہ کرائے پر ملتا ہے۔ اس کے پیچھے ہی 'سوہو' کا علاقہ ہے۔ جہاں جوا بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے، اور لندن کا بازار حسن بھی ہے۔ حسن کی قربت قیمتیں بڑھا دیتی ہے۔ یہیں اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کا اوورسیز دفتر واقع ہے۔ ایک خوب صورت عمارت کی وکٹورین لفٹ ہمیں پانچویں منزل پر اسٹیٹ لائف کے دفتر لے آئی ہے۔ استقبالیہ کی خاتون نے ہمیں اسٹیٹ لائف کے اوورسیز کے ڈائریکٹر میاں خورشید عالم کے دفتر کا رُخ دکھایا ہے۔

میاں خورشید عالم ہر دور میں اسی طرح ہنستے مسکراتے ملے ہیں۔ انہوں نے برطانیہ میں اسٹیٹ لائف انشورنس کا کاروبار ایک چیلنج کی طرح قبول کیا تھا۔ آج اس کے اتنے اثاثے ہیں کہ کاروبار مزید مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے یورپ میں پاکستانیوں کے لیے اس کاروبار کو فروغ دینے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔

ان کا دفتر لندن میں مقیم پاکستانی اخبار نویسوں کا مقام ملاقات بھی ہے۔ پاکستان کے تازہ ترین حالات یہاں معلوم ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے اخبارات بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ پاکستان سے کوئی وزیر آئیں یا سیاستدان وہ میاں صاحب سے ضرور ملنے آتے ہیں۔

میاں صاحب سے پھر بھی ملاقاتیں رہیں گی۔

ہم ان گلی کوچوں میں اُتر آئے ہیں۔ جنہیں عام طور پر 'سرخ روشنی والے علاقے' کہا جاتا ہے۔ 'سوہو' تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ کتنی ہی انگریزی فلموں میں اسے دکھایا گیا ہے۔ کتنے ہی انگریزی ناولوں میں اس کا ذکر ہے۔ لندن کی رات، یہاں سب سے زیادہ رنگینیاں پاتی ہے۔ ابھی تو شام کے سائے اُتر رہے ہیں۔ یہاں زندگی ابھی انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی ہے۔ ابھی دوسرے دفاتر مارکیٹیں کھلی ہیں۔ لیکن شٹر گرنے والے ہیں۔ یہ کاروبار رفتہ رفتہ بند ہوگا۔ دوسرا کاروبار شروع ہوگا۔ غمِ یار اور غمِ روزگار کے ستائے ہوئے اِدھر کا رخ کریں گے۔ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی یہاں لٹائیں گے۔ کچھ دیر دادِ عیش دیں گے۔ اور پھر اپنے اپنے گھروں کا رُخ کریں گے۔ جہاں اندھیرے ان کے منتظر ہوں گے۔

"زندہ بیڈ سین دیکھیے۔"

"صرف اڑھائی پاؤنڈ میں۔"

ایک سیڑھی کے پاس سیاہ منی اسکرٹ میں ملبوس ایک فرنگی حسینہ دعوت دے رہی ہے۔

"آپ مایوس نہیں ہوں گے۔"

"زندگی کا لطف اٹھائیے۔"

اس سے اگلے کلب میں اس سے بھی شوخ حسینہ یہی منظر 2 پاؤنڈ میں دکھا رہی ہے۔ لیکن لباس اس کا بھی سیاہ ہے۔ یہ شاید یہاں کا یونیفارم ہے۔

اس بازار میں اب پہلے جیسا رش نہیں رہا ہے۔ 1960ء کے عشرے تک بہت ہجوم رہتا تھا۔ اب 1980ء کے عشرے میں تو ایڈز کے بڑھتے ہوئے خطرے نے اس بازار کو ویران کر دیا ہے۔ کئی کلب اور کئی طوائفیں باقاعدہ تشہیر کرتی ہیں کہ یہاں ایڈز سے آزاد سیکس میسر ہے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹس تک کی تشہیر کی جاتی ہے۔

بعض کلبوں کے باہر ہی جوئے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ ان مشینوں کے سامنے بزرگ عورتیں اور مرد سکے ڈالنے میں مصروف ہیں۔ قسمت آزمانے میں کیا ہرج ہے۔ لیکن یہ انگریز بڑے میاں پریشان ہیں۔ صورت سے بھی زیادہ خوشحال نظر نہیں آتے۔

"کیا ہوا، کچھ ملا یا نہیں۔"

"میں تو برسوں سے یہاں آ رہا ہوں۔ ابھی تک تو نہیں جیت سکا ہوں۔"

مشین کی بڑی ٹرے سکوں سے بھری ہوئی ہے۔ آپ اپنا سکہ ایسے انداز سے ڈالیں کہ اُس ٹرے سے کچھ سکے ہلیں اور باہر آپ کے سامنے آ گریں جو بھی آپ کے سامنے گریں گے وہ آپ کے ہوں گے۔

یہ بڑے میاں نہ جانے کب سے اس انتظار میں ہیں۔ اپنی پنشن اور سوشل سیکورٹی کے کتنے سکے یہاں ڈال چکے ہیں۔ ایک مشین کے سامنے ایک اکیلی بڑھیا قسمت آزما رہی ہے۔ اس کی گردن ہل رہی ہے۔ بال سفید ہو کر غائب ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی خوشحالی اس مشین میں تلاش کرنے آئی ہے۔ جانے کب سے آ رہی ہے۔

جوئے کی ان مشینوں پر نوجوان بہت ہی کم دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ اپنی قسمت ان معمولی سکوں پر نہیں آزماتے۔ ان کی مصروفیات آج کل بہت مختلف ہیں۔ وہ چھدے ہوئے ایک کان میں بندے ڈالے سر کے بال ایک طرف سے تراش کر اپنی ٹولیوں میں پھرتے ہیں۔ جن ٹولیوں میں نوجوان لڑکیاں شامل ہوتی ہیں۔ وہاں یہ ایک کان میں بندے والے نہیں ہوتے ہیں۔

نوجوان جوڑے آپ کو بار میں نظر آتے ہیں۔ جن کے لب جام سے کم مس ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لبوں پر زیادہ پیوست ہو رہے ہوتے ہیں۔

"ایک پیگ بلیک لیبل۔"

"کاؤنٹر بوائے پیگ لے کر آتا ہے۔ تو اس گروپ کے دوسرے صاحب بھی کہتے ہیں کہ ایک پیگ لے آؤ۔"

کاؤنٹر بوائے پیگ لے تو آتا ہے۔ لیکن ناراض ہوتا ہے۔

"آپ ایک ہی بار مجھے نہیں کہہ سکتے تھے۔"

یہ کاؤنٹر کی بات ہے۔ بوتل زیادہ دور نہیں ہے۔ پھر غالب نے تو کہا تھا۔ ساقی شراب کے باب میں بخیلی نہ کر۔ اس دنیا میں تو جبیں پر شکن نہیں آنی چاہیے۔

وہ صاحب کہہ رہے ہیں کہ قدریں بہت تبدیل ہوگئی ہیں۔ ہر جگہ انحطاط ہے۔ زوال ہے۔ سوہو اب سوہو نہیں رہا ہے۔ 'سیکس شاپ' بھی ویران دکھائی دے رہی ہیں۔ کوئی گاہک تو کیا تماشائی بھی اُدھر کا رُخ کرتا نظر نہیں آتا ہے۔

لندن میں بھی بے روزگاری انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ بے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ پھر آج کل بموں کے دھماکوں کا خطرہ بھی ہے۔ اس علاقے کے ایک ریستوران والے نے بھی افسوس کا اظہار کیا کہ اب کاروبار بہت مندا ہوگیا ہے۔ اب لوگ زیادہ نہیں آتے ہیں۔ لوگ اپنی خوراک کی فکر کریں۔ یا اپنی دوسری خواہشات کی تسکین کے لیے بے تاب ہوں۔

یہ تو متمول ایشیائی ہوتے ہیں۔ یا مشرق وسطیٰ کے شیخ جن کے دم سے یورپ کے یہ عشرت کدے آباد ہیں۔ سیال سونے (تیل) کی کمائی تسکین ہوس کا سامان فراہم کرتی ہے۔ سوہو میں تو شیوخ کے کارندے اور ملازمین آتے ہیں۔ شیوخ تو بڑے بڑے کلبوں کا رُخ کرتے ہیں۔ یا اعلیٰ ہوٹلوں میں ان کے عالی شان کمروں میں حسن اپنی حشر سامانیوں اور عریانیوں سمیت خود پہنچ جاتا ہے۔

لندن ہر ذوق کی تسکین کا سامان رکھتا ہے۔ ڈراموں سے شغف رکھنے والوں کے لیے ہر نوع کے تھیٹر سال بھر ڈرامے اسٹیج کرتے رہتے ہیں۔ کلاسیکل ڈرامے بھی۔ جدید ترین بھی' کامیڈی بھی' ٹریجڈی بھی، کسی بھی ٹورسٹ انفارمیشن سینٹر سے آپ کو یہ سال بھر کا پروگرام مل سکتا ہے۔

فلمیں بھی ہر قسم کی دیکھی جاسکتی ہیں۔ خاموش بلیک اینڈ وائٹ، رنگین، ڈبل ایکس، ٹرپل ایکس، ٹور پیکیج بھی ہر قسم کے دستیاب ہیں۔ چند گھنٹوں کے پورے دن کے، ایک ہفتے کے، دو ہفتے کے، آپ کو کسی خاص نوعیت کا شوق ہے۔ اور آپ کے جیب میں پاؤنڈ ہیں۔ تو آپ کبھی بور نہیں ہوسکتے۔ خالصتاً اپنی مرضی کی مصروفیتیں حاصل کرسکتے ہیں۔

ہیر شاپ، یہ اسکوپو کے صدر شیر شاہ قریشی کا صدر دفتر ہے۔ وہ برطانیہ میں ہی پیدا ہوئے۔ برطانیہ کے ہی ہو کر رہ گئے لیکن کشمیر اور پاکستان کو نہیں بھولتے۔ پاکستان تقریباً ہر سال ہو آتے ہیں۔ کشمیر کی مکمل آزادی کا خواب ان کی متاع گراں بہا ہے۔ ایک آرزو ان کی یہ ہے کہ حکومت پاکستان، پی آئی اے کے ذریعے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی نئی نسل کو پاکستان سے متعارف کروانے کے لیے خصوصی دوروں کا اہتمام کرے۔ ٹکٹ اور پاکستان میں قیام میں خصوصی رعایت دی جائے تو برطانیہ میں مقیم پاکستانی خاندان اپنے بچوں کو چھٹیوں میں پاکستان بھیج سکتے ہیں۔ بچے اپنے والدین سے پاکستان کے بارے میں سنتے ہیں۔ لیکن انہیں اندازہ نہیں ہو پاتا کہ پاکستان ہے کیسا؟ وہاں مناظر کیسے ہیں، شہر کیسے ہیں۔ عمارتیں کیسی ہیں۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین سے نا آشنا ہیں۔ شیر شاہ قریشی کا کہنا ہے کہ ہر سال چھٹیوں میں حکومت پاکستان کو یا پی آئی اے کو ایسے پیکیج کا اعلان کرنا چاہیے۔ جس میں لاہور، اسلام آباد، مری اور شمالی علاقوں کی دو تین ہفتوں کی سیاحت کا پروگرام شامل ہو۔ اور یہ یہاں کے متوسط خاندانوں کی مالی استطاعت کے مطابق ہو۔ انہیں لوٹنے کی کوشش نہ کی جائے جو خاندان بے پناہ دولت رکھتے ہیں۔ وہ تو اپنے بچوں کو گھما کر لے آتے ہیں۔ لیکن اکثر خاندانوں کو یہ موقع نہیں ملتا۔ ان کے بچے پاکستان کو بالکل بھول جائیں گے۔ ان کا رشتہ اپنے وطن سے ختم ہوکر رہ جائے گا۔ اب بھی بعض خاندانوں کے بچوں کو پاکستان لے جایا جاتا ہے، لیکن صرف وہی جو سفارت خانہ کے پسندیدہ ہوں۔ رشتے دار ہوں۔ یہ انتخاب بھی کسی میرٹ کی بنیاد پر نہیں ہوتا ہے۔

شیر شاہ کے پاس ایک انگریز ڈینئل رضا کارانہ طور پر کام کرتا ہے۔ وہ اپنی مے نوشی کے ہاتھوں مجبور ہے۔ سوشل سکیورٹی سے اس کا وظیفہ بھی اس کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔ وہ شام کے بعد اک گونہ بے خودی کے لیے اِدھر اُدھر سونگھتا پھرتا ہے کہ اس کو چند پیگ مل جائیں۔ اس کے لیے وہ کاؤنٹر پر ڈیوٹی دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ کسی بھی کام کے لیے اسے کہیں بھی بھیج دیں۔ بڑی خوشی سے جاتا ہے۔ صرف واپسی پر اسے دو پیگ مل جائیں۔

لندن میں ایسے ہزاروں ڈینئل ہیں۔ جو نشے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور اپنی کمائی اور انا نشے کی نذر کر رہے ہیں۔ ان کی بحالی کے لیے حکومت برطانیہ کوششیں کرتی ہے۔ لیکن چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ پھر شیر شاہ قریشی جیسے ایشیائی جو ڈینئل کو روزانہ دو تین پیگ دے کر اپنے ہم وطنوں کی بے بسی کا انتقام لیتے ہیں۔ انگریزوں نے ہماری قوموں کو ایسے نشوں پر لگایا تھا۔ ہمیں تباہ کیا تھا۔ اب جب انگریز کو خراب کرنے کا موقع ملے تو ہاتھ سے کیوں جانے دیا جائے۔

ہمارا عارضی مستقر یہاں سے قریب ہی ہے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ یہ دکانیں 11 بجے رات بند ہو جاتی ہیں۔ ہم بھیگے ہوئے موسم کا لطف اٹھاتے سٹڈوک کورٹ پہنچ رہے ہیں۔

سرور، سنی، ناصر اور ناگرہ سب ہمارے انتظار میں ہیں۔ انہوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ آج انہوں نے ہمارے لیے خاص طور پر ساگ پکایا ہے۔ روٹی بھی پکی پکائی ملتی ہے۔

''وقت کیسے گزرتا ہے۔''

''کام میں پتا ہی نہیں چلتا۔''

''صبح کے اب واپس آئے ہیں ہم۔ دو تو گوگی شاپ پر کام کرتے ہیں۔ اور دو اپنا اپنا کام کر کے اس وقت پہنچتے ہیں۔''

''کھانا روز اکٹھے کھاتے ہیں۔''

''جی کوشش یہی ہوتی ہے۔''

سنی فیصل آباد سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں بہت کوشش کی۔ لیکن کوئی ڈھنگ کا کام ہی نہیں ملتا تھا۔ پھر سیاسی ہنگامے، ہر وقت خطرہ کبھی گرفتاری، کبھی گولی کا۔ یہاں فیصل آباد سے دوست آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہاں ملازمت کا انتظام کیا۔ تو یہاں آ گئے۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ دو تین ماہ بعد گھر کچھ معقول رقم بھیج دیتا ہوں۔ گھر کی حالت بدل گئی ہے۔ بہنوں کی شادی میں سرخروئی حاصل کی ہے۔ جہیز کی مانگ شادی میں رکاوٹ نہیں ڈال سکی ہے۔ تین چار سال اور کام کروں گا۔ پھر واپس چلا جاؤں گا۔ گھر والوں سے دور وقت گزارنا مشکل ہے۔ جی نہیں لگتا۔''

''ہاں جی۔ یہ تو ویک اینڈ روتے روتے گزارتا ہے۔ گھر والوں کو بہت یاد کرتا ہے۔''

ناگرہ بہت ہمت والا نوجوان ہے۔ لیکن گھر کی یادیں اس کی ہمت بھی توڑ دیتی ہیں۔ وہ چھٹی والے دن ہی نہیں ویسے بھی کسی کسی دن رو پڑتا ہے۔ اسے پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈرامے دیکھنے کا شوق ہے۔ جو بھی پاکستان سے آ رہا ہو۔ ان سے ڈراموں کے کیسٹ منگواتا ہے۔ بعض اوقات ان کیسٹوں پر لڑائی بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے ساتھی کوئی اور فلم دیکھنا چاہتے ہیں۔''

یہ چاروں ابھی یہاں کی زندگی میں اپنے آپ کو جذب نہیں کر سکے ہیں۔ چھٹیوں کے دن وہ دوسرے پاکستانیوں اور ایشیائیوں کی طرح نہ تو انگریز لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ نہ ہی نائٹ کلب کا رُخ کرتے ہیں۔ پاکستان ڈرامے دیکھ کر، ڈائجسٹ پڑھ کر وقت گزار لیتے ہیں۔

انہوں نے اپنے بیڈ روم ہمیں دے دیے ہیں کہ ہم مہمان ہیں۔ خود وہ ڈرائنگ روم میں گدے بچھا کر سو رہے ہیں۔ زیادہ تر پاکستانی اسی طرح رہتے ہیں۔ لیکن جو اپنے بیوی بچوں سمیت رہتے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ منظم انداز میں رہتے ہیں۔ ان 'چھڑوں' کے ہاتھ کا پکا ساگ،

اور گوشت کتنا لذیذ ہے۔ وہ کتنے خلوص سے کھلا رہے ہیں۔ ہمیں یہاں میزبانی کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ ناصر کہہ رہا ہے۔ لیکن جب بھی یہ موقع ملے۔ ہمیں بڑا لطف آتا ہے۔ لگتا ہے ہم اپنے خاندان والوں کی خدمت کررہے ہیں۔

''صبح ناشتے میں کیا چلے گا۔''

''آپ لوگ اپنے کام پر چلے جایئے گا۔ ہمارے ناشتے کی فکر نہ کریں۔''

''نہیں جی...... ہم نے ڈیوٹی لگالی ہے۔ دکان پر سردر پہلے چلا جائے گا۔ ناگرہ آپ کو ناشتا دے کر پھر جائے گا۔''

اسٹاک ویل کی صبح بہت ہی حسین ہے۔ چوتھی منزل کے اس فلیٹ میں سورج کی ہلکی ہلکی روشنی ہولے ہولے اندر آرہی ہے۔ فلیٹوں کے بلاکوں کے درمیان نیچے ہرے بھرے لانوں میں کچھ لوگ جاگنگ کررہے ہیں۔ مائیں بچوں کو اسکول بس تک چھوڑنے آرہی ہیں۔

مائیں ایشیائی ہوں یا فرنگی۔ اپنے بچوں کو اسکول کے لیے اسی پیار سے تیار کرتی ہیں۔ اور بسوں تک اسی طرح چھوڑنے آتی ہیں۔

بچے پاکستان میں ہوں۔ انگلینڈ میں، کراچی میں یا لندن میں، گلشن اقبال میں اسٹاک ویل میں۔ وہ ہماری امیدیں ہیں۔ آنے والے اچھے موسموں کی نوید ہیں۔ وہ پھولوں کی طرح سر اٹھاتے ہیں۔ خوشبو کی طرح بکھرتے ہیں۔ ان کے رنگ ہماری خوشیوں کے رنگ ہیں۔

Our Children Rise From "
The Earth Like Flowers Lifting
Their Face For Tomorrow`s
"Sun

''ہمارے بچے دھرتی سے اس طرح ابھر رہے ہیں۔ جیسے پھول آنے والے سورج کو دیکھنے کے لیے اپنا چہرہ اٹھاتے ہیں۔''

ناگرہ نے بہت ہی لذیذ ناشتا تیار کیا ہے۔

اورنج جوس کا گتے کا پیک بڑے سائز کا، مکھن، جام، شہد سب کچھ ہے، سب چیزیں پیک ملتی ہیں اور بہت لذت والی، کسی قسم کی ملاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ یہاں تنہا زندگی گزارنا بھی اسی لیے آسان ہے۔ ہر خوردنی شے تیار اور پیک زیادہ زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ کھولو اور کھالو۔

ہم تیار ہو کر نکلنے والے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ دروازہ کھولتے ہیں تو کوئی نہیں ہے۔ البتہ دروازے کے نیچے ایک چھپا ہوا ہینڈ بل اندر آیا پڑا ہے۔

''اپنا ووٹ مت ضائع کیجیے۔''

یہ ہینڈ بل الیکٹرول رجسٹریشن آفس والوں کی طرف سے ہے۔ انتخابی فہرستیں مکمل کی جارہی ہیں۔ اس میں تازہ ترین ووٹروں کے نام شامل کیے جارہے ہیں۔ بل میں لکھا ہے کہ ابھی آپ کے نام اور پتے پر ایک فارم 'اے' بھیجا گیا تھا۔ تاکہ انتخابی فہرستوں کو مکمل کیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ فارم ابھی تک ہمیں مکمل ہو کر نہیں ملا ہے۔ ہمارے دفتر سے ایک صاحب آپ کے ہاں آئے بھی...... لیکن آپ ملے نہیں۔

براہ کرم اس فارم کو فوراً بھر دیجیے۔ اور جلدی سے ہمارے دفتر بھجوادیں۔

یہ ہے ایک جمہوری ملک میں آپ کو آپ کے ووٹ کی اہمیت کا احساس دلانے کا طریقہ۔ انتخابی فہرستیں مکمل کرنے والا دفتر یوں گھر گھر رابطہ کرتا ہے۔ بار بار دلاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو عین انتخابات کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ نام درج کروانے ہیں۔ یہ بھی سیاسی پارٹیوں کی ذمہ داری سمجھ لی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے حامیوں کے نام درج کروائیں۔ حالانکہ یہ الیکشن کمیشن کے ضلعی دفاتر کا فرض ہے کہ وہ اپنی فہرستیں مکمل کرتے رہیں۔

ہم لفٹ سے نیچے اتر رہے ہیں۔ لفٹ میں سوار خاتون کہہ رہی ہے۔ ''آپ اس فلیٹ میں رہتے ہیں۔''

''ہم تو مہمان ہیں۔ کوئی خاص بات ہے۔''

''الیکٹرول رجسٹریشن والے آئے تھے۔ آپ کے فلیٹ والوں نے شاید نام درج نہیں کروایا۔''

''ہم نے وہ نوٹس دیکھا ہے۔ شام کو ہم بات کریں گے۔ اور آپ نے نام درج کروادیا ہے۔''

خاتون مسکرائی کہنے لگی۔ ''میرا تو ووٹ نہیں ہے۔ میں نے سیاسی پناہ کے لیے درخواست دے رکھی ہے۔ میری دوسری ساتھیوں نے ووٹ کا اندراج کروالیا ہے۔''

''آپ کہاں سے آئی ہیں۔''

''صومالیہ سے۔''

''وہاں تو حالات بہت خراب ہیں۔''

''قبائلی سیاستدانوں نے ہمارے ملک کو تباہ کردیا ہے۔ اب تو لوگ خوراک کو بھی ترس رہے ہیں۔''

''وہ یہیں مارکیٹ میں شاپنگ کے لیے جارہی ہے۔ ہم نے کہا کہ وقت ملا تو پھر ملیں گے۔''

سفارت خانے جانے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اس بار ہم نے اپنا پورا ارادہ کرلیا ہے کہ سفارت خانے ضرور جائیں گے۔ یہ سفارت خانہ مارشل لاء کے دور میں جمہوری احتجاجی مظاہروں کا مرکز رہا ہے۔

آج کل سفارت خانہ کسی سربراہ کے بغیر ہے۔ خالد شفیع قائم مقام ہائی کمشنر ہیں۔ یہی خالد شفیع، جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں اے ڈی سی رہے، پھر وہ وزارتِ خارجہ میں چلے گئے۔ ایک عرصہ برمنگھم میں قونصل جنرل رہے۔ اب وہ ناظم الامور تھے کہ جناب ہمایوں خان کا تبادلہ ہوگیا۔ اب تک کسی سفیر کا باقاعدہ تقرر نہیں ہوسکا۔

ہمارے سارے سفارت خانوں کا حال ایک سا ہے۔ ان سے اندرون ملک بھی شکایت رہتی ہے۔ اور جس ملک میں یہ سفارت خانہ موجود ہو وہاں کے پاکستانیوں کی اکثریت ناراض رہتی ہے۔ چند لوگ خوش




لندن کی مصروف زندگی کی چہل پہل اس تصویر میں بہت نمایاں ہے

پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی ایک گاڑی نکل گئی ہے۔ دوسری گاڑی کے انتظار میں پانچ منٹ اور لگیں گے۔

پاکستان ہائی کمیشن پہنچنے کے لیے ہمیں سائنٹس برج اسٹیشن پہنچنا ہے۔

پہلے بھی لندن آئے ہیں تو اتفاق ہے کہ ہمیں اپنے

ہوتے ہیں۔ جنہیں سفارت خانہ نوازتا رہتا ہے۔ لندن میں پاکستانی سفارت خانہ تو ہمارے لیے کسی وقت سب سے اہم سفارت خانہ تھا۔ اب واشنگٹن کا سفارت خانہ سب سے زیادہ اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ لیکن لندن کی اہمیت اب بھی اپنی جگہ ہے۔ یہاں سفارت خانے کو کسی

سربراہ کے بغیر چھوڑنا سیاسی دانشمندی نہیں ہے۔

''خالد شفیع قائم مقام ہائی کمشنر تو اس وقت نہیں ہیں۔''

''شفیق خان ہوں گے۔انفارمیشن کے انچارج۔''

''جی وہ ہیں۔''

پاکستان ہائی کمیشن کے استقبالیہ پر مامور خاتون سے ان مکالمات کے بعد ہم شفیق خان کے کمرے میں پہنچ رہے ہیں۔ایک عرصے سے اس اہم سفارت خانے میں اطلاعات کے منسٹر کی جگہ بھی خالی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے زمانے میں ایک ریٹائرڈ کرنل اسماعیل منسٹر انفارمیشن بنا دیے گئے تھے۔ وہ پاکستان کے پروٹوکول چیف بھی رہ چکے تھے۔آدمی بہت اچھے، بے تکلف لیکن اس عہدے کے لیے موزوں نہ تھے۔ یہ عہدہ تو ایک سینئر صحافی کے لیے مناسب رہ سکتا ہے۔جس کے برطانیہ میں اہم اور سینئر صحافیوں سے ذاتی تعلقات ہوں ان سے پیشہ وارانہ بنیادوں پر رابطہ رکھ سکے۔صحافیوں سے ریڈیو والوں سے ٹیلی ویژن والوں سے تعلقات ہوں۔ پاکستان کا موقف انہیں سمجھائے۔ ان کی بات سنے۔

کسی سفارت خانے میں جا کر سب سے پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنے وطن کے اخبارات پڑھے جائیں اور حالات سے آگاہی ہو۔شفیق الزماں خان کے کمرے میں بیٹھ کر ہم سب سے پہلے اپنی یہی خواہشیں پوری کر رہے ہیں۔

شکر ہے کہ ملک میں حالات ٹھیک ہیں۔وطن سے باہر ہوں تو سب سے زیادہ پریشانی یہی ہوتی ہے۔

میں جب بھارت کی آنجہانی وزیراعظم اندرا گاندھی سے انٹرویو کرنے دہلی گیا۔تو وہاں بلوچستان کی حکومت برطرف کیے جانے کی خبر سنی۔ اخبارات کے دفاتر کے باہر ڈیجیٹل انداز سے خبریں ڈسپلے کی جاتی تھیں۔ ہر جگہ ان خبروں کو نمایاں کیا جارہا تھا۔ پاکستان میں تازہ تازہ جمہوریت آئی تھی۔ ایوب خان اور یحییٰ خان کے طویل مارشل لاؤں کے بعد پھر ایک بار ہم چین میں تھے وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ تو اسلام آباد میں سلمان رشدی کی کتاب کے سلسلے میں ہونے والے مظاہرے پھر پولیس کی فائرنگ کا افسوسناک واقعہ ہوگیا۔

وطن کے اندر رہتے ہوئے یہ خبریں سن کر اتنی تشویش نہیں ہوتی ہے۔ جتنی تکلیف یہ خبریں وطن سے باہر پہنچاتی ہیں۔ وطن سے مستقل دور رہنے والوں پر نہ جانے یہ خبریں سن کر کیا گزرتی ہے۔ پاکستانی سفارت خانوں میں مصروف کار بھی وطن میں رہنے والوں کی طرح ان خبروں کے عادی ہوجاتے ہیں۔

برطانیہ میں رہنے والوں کو تو وطن کے حالات جاننے کے لیے پاکستانی اخبارات پڑھنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے 'کیوں کہ 'جنگ' لندن یہ کمی بہت حد تک پوری کر دیتا ہے۔ اور وطن کی خبریں دینے میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کرتا ہے۔ اب جنگ لندن کی کتابت جدید ترین اردو کمپیوٹر سے ہو رہی ہے۔ جنگ کے پاکستان کے سب مراکز سے اس کا رابطہ ہے۔اس لیے تازہ ترین خبریں روز کے روز پہنچ جاتی ہیں جو اگلی صبح برطانیہ کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے پاکستانیوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ برطانیہ میں جنگ کی تقسیم کا نظام بھی جدید ترین تیکنیک اختیار کر گیا ہے۔

خالد شفیع اب تک نہیں آئے ہیں۔اب ان کا مزید انتظار ممکن نہیں ہے۔

ہم شفیق الزماں صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہو رہے ہیں۔ سیڑھیاں اُتر رہے ہیں تو بشیر مرزا کی پینٹنگ نظر آتی ہے۔ بشیر مرزا ہمارے ملک کے مایہ ناز آرٹسٹ ہیں۔ ایسے صاحب طرز اور منفرد آرٹسٹوں کے فن پارے تو ہمارے سارے سفارت خانوں میں ہونے چاہئیں۔

بشیر مرزا نے اپنی محنت اور ندرت سے بڑا نام کمایا ہے۔ ان کی تنہا لڑکی والی تصاویر کی سیریز نے تو عالمی

شہرت پائی ہے۔ ان کے رنگ اپنے مخصوص ہیں۔ اور برش کے بعض نشانات بھی خاص ہیں۔ عوام کی جدوجہد، والی سیریز بھی ان کی ایک خاص اور مقبول سیریز تھی۔

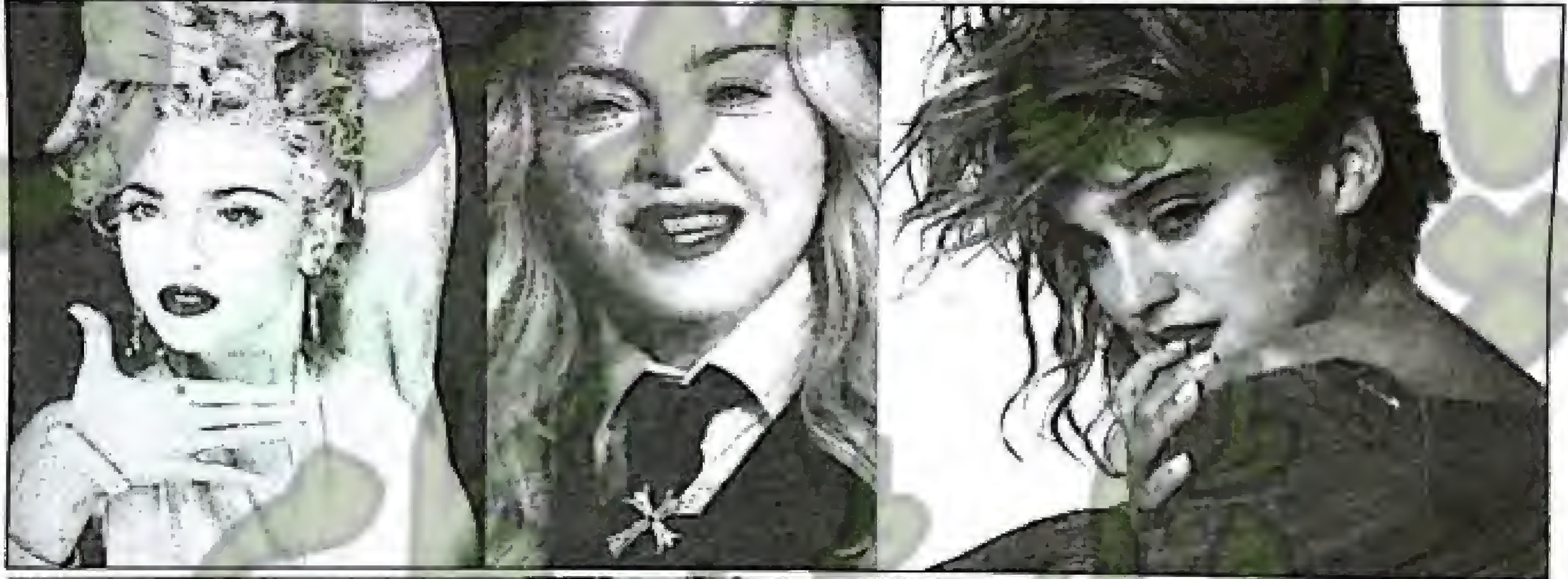
وہ بہت حساس مصور ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران تو جیسے ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا تھا۔ ان کی طبیعت پینٹنگ کی طرف مائل ہی نہیں ہوئی۔ لیکن جب مارشل لاء ختم ہوا۔ ملک میں سول حکومت قائم ہوئی تو ان کا برش پھر رواں ہو گیا۔ ایک بار پھر شہ پارے تخلیق ہونے لگے ہیں۔ مصوری کا یہ موسم ابھی عروج پر ہے۔

یہ ان کی انفرادیت ہے۔ اور بھرپور فن ہے کہ وہ لندن میں بھی موجود ہیں۔ اپنی پینٹنگز کے ذریعے اور ہمیں بھی یاد آ رہے ہیں۔

ہفتے بعد اس کی کتاب کی رونمائی ہونے والی ہے۔ میڈونا سے اس وقت پورے امریکہ اور یورپ کے نوجوانوں کو جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ اس کی آواز اس کا بدن، اس کے بول اس کی باتیں نوجوانوں کو زندگی سے محبت کرنا سکھا دیتے ہیں۔ وہ سیکس کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھتی۔ بلکہ سیکس کو ہی زندگی سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی بنیاد اسی پر ہے۔ اس کے اسرار و رموز سب کو جاننے چاہئیں۔

ایک جھلک دیکھنے کے لیے نوجوانوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ ٹی وی کے کمرے، اخبارات کے فوٹو گرافر اس کا ایک لمحہ بھی محفوظ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو یہ فلم بہت مہنگی بکے گی۔ اسی امید میں سب لوگ کھڑے ہیں۔

ہمارے ساتھ کھڑے لندن کے ایک نوجوان کا کہنا



میڈونا: کل اور آج، وہ سحر انگیز مغنیہ جس کے نام کا ڈنکا دنیا بھر میں بجتا تھا

## وہ میڈونا تھی بھی یا نہیں

تم جب بھی میرا نام پکارتے ہو
یہ ایک چھوٹی سی عبادت ننھی سی دعا محسوس ہوتی ہے
جیسے میں اپنے گھٹنوں پر جھکی ہوئی ہوں

یہ ہائیڈ پارک ہوٹل ہے۔ ہوٹل کے باہر ٹیلی ویژن کیمرے لائٹس نصب ہیں۔ سڑک کے اس طرف بھی لوگ کافی تعداد میں کھڑے ہیں۔

اس ہوٹل میں عالمی شہرت یافتہ مغنیہ میڈونا ٹھہری ہوئی ہے۔ اگلے روز اس کی پریس کانفرنس ہے۔ ایک

ہے کہ وہ اب تک خاصی کوششیں کر چکا ہے۔ ایک مرتبہ روم بھی جا چکا ہے۔ لیکن میڈونا کو نہیں دیکھ سکا۔ اس کی تصویریں تو اس کے پاس بہت ہیں۔ گیت بھی بہت سنے ہیں۔ صرف آڈیو کیسٹ، ویڈیو کیسٹ دیکھنے کے لیے ابھی اس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔

میڈونا کو ایک لمحے دیکھنے کی خواہش رکھنے والوں میں نوجوان لڑکیاں بھی ہیں۔ ایک کہہ رہی ہے۔ ”دیکھیں تو سہی آخر اس لڑکی میں کیا جادو ہے کہ دنیا دیوانی ہو رہی ہے۔“ اس کی ساتھی اس سے کہہ رہی ہے ”چلو وقت مت ضائع کرو ہمیں دیر ہو جائے گی۔“

ایک گورے بڑے میاں کن اکھیوں سے ہائیڈ پارک ہوٹل کے گیٹ کی طرف بھی دیکھ رہے ہیں اور ادھر سب کو مخاطب بھی کر رہے ہیں۔ "تم سب جنونی دیوانے..... کیا تم نے کبھی کوئی مغنیہ یا رقاصہ نہیں دیکھی۔

ایک دم شور مچتا ہے۔ سب ہوٹل کی طرف ایسے اشارے کر رہے ہیں۔ جیسے ہم لوگ عید کے چاند کی جھلک دیکھ کر انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ وہ رہا وہ رہا۔

کچھ اسی طرح کا شور مچا وہ رہی۔ وہ رہی اور چشم زدن میں دو تین باڈی گارڈز کے..... نرغے میں ایک خاتون ہوٹل سے نکلی۔ تیزی سے گاڑی میں بیٹھ یہ جا وہ جا۔ معلوم نہیں کہ میڈونا تھی بھی یا نہیں۔ سب نے دور سے یہی طے کیا کہ وہ میڈونا تھی اور پھر اسی میں خوش خوش چل نکلے۔ ہم نے بھی سوچا کہ ہم وطن واپس جا کر یہ کہہ تو سکیں گے کہ ہم نے تیس فٹ قریب سے میڈونا جی کو دیکھا۔ کیا قیامت تھی۔ کیا آنکھیں تھیں۔ بالکل آہو کی طرح، کیا کمر تھی۔

سنا ہے کہ صنم کی بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

ساق سیمیں کا تو جواب نہیں۔ زلفیں، سب اسی زلف کے اسیر ہوئے۔ ہم ہوئے تو تم ہوئے کہ میر ہوئے۔

میڈونا آج کی عظیم مغنیہ ہے۔ امریکہ یورپ کے نوجوان اس کے دیوانے ہیں تو اس میں ضرور کچھ بات ہوگی۔ ہمارے شیخ رشید، جو وزیر ثقافت ہیں انہوں نے تو اپنی سی کوشش کی تھی کہ مائیکل جیکسن اور میڈونا کے پاکستان میں شو کروا کے پاکستان کو اکیسویں صدی میں لے جائیں۔ لیکن برا ہو جماعت اسلامی کا اور ہمارے علماء کا کہ انہوں نے پاکستان کے لاکھوں نوجوانوں کو اس شرف سے محروم کر دیا۔ کراچی، لاہور کے نوجوانوں اسلام آباد کے وزراء اگر میڈونا اور مائیکل جیکسن کو اتنے ہی قریب سے دیکھ لیتے جتنے قریب سے امریکہ اور یورپ کے نوجوانوں نے انہیں دیکھا ہے تو ایمان خطرے میں تو نہ پڑ جاتا۔

ہم نے بھی اگر شیخ رشید کے توسط سے میڈونا کو پاکستان میں دیکھ لیا ہوتا تو آج اس بجلی کی ایک لپک دیکھنے کے لیے یوں دو اڑھائی گھنٹے تو ضائع نہ کرتے۔ ہم اس وقت ظاہر ہے کہ پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ہمیں اپنے اس فرض کا احساس تھا کہ ایک موقع ملا ہے میڈونا کو دیکھنے کا۔ ہمیں اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ آخر میں ہم وطن واپس، جا کر نوجوانوں کو بالخصوص اپنے جواں سال کنوارے وزیر ثقافت کو کیا منہ دکھائیں گے۔

میڈونا آج کے یورپ کی آواز ہے، جو امریکہ میں بھی اسی طرح مقبول ہے۔ آج کی مادی دنیا میں انسان جن تنہائیوں کا شکار ہے۔ اور مشینیں جس طرح انسان کو مغلوب کرتی جا رہی ہیں۔ جہاں زندگی سب سے کم تر متاع بن کر رہ گئی ہے۔ وہاں میڈونا زندگی سے پیار کرنا سکھاتی ہے۔ محبت کی عظمت کا احساس دلاتی ہے۔

غزل کے عوامی شاعر عدم نے بہت پہلے یہ کہا تھا۔

جملہ اسباب جہاں پر ہے تغیر حاوی
اک محبت ہے کہ ہر وقت جواں رہتی ہے

میڈونا بھی اسی احساس کو لے کر چلتی ہے۔ وہ جنت کا تصور پیش کرتی ہے۔ جہاں محبت ہی محبت ہے۔ محبت کو وہ عبادت سمجھتی ہے۔ خواہشوں کو دعاؤں کا درجہ دیتی ہے۔ انسان ہی سب کچھ ہے۔ کائنات کا مرکز وہ ہے۔ انسان نہ ہو تو زمانے کی گردش رک جائے۔

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے
قتیل وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

یہ منزل، سوچ کا یہ مقام بڑی ریاضت کے بعد ملتا ہے۔ قتیل شفائی نہ جانے کتنا خون جگر جلانے کے بعد یہ شعر کہہ سکے ہوں گے۔ ہم اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک کھلی چھت کی ڈبل ڈیکر بس میں بیٹھے ہیں۔ ڈبل ڈیکر بسیں کسی زمانے میں لاہور میں بھی ہوتی تھیں۔ یہ دنیا کو بلندی سے دیکھنے کا موقع دیتی ہیں۔

میڈونا کی آواز گونج رہی ہے۔
"زندگی ایک دھند ہے۔
ہر ایک کو اپنے سہارے کھڑا ہونا چاہیے۔
میں سن رہی ہوں کہ تم میرا نام پکار رہے ہو۔
بالکل لگتا ہے کہ میں
اپنے گھر میں اپنوں کے
درمیاں ہوں۔
تم جب بھی میرا نام
پکارتے ہو۔
ایک چھوٹی سی
عبادت، ننھی سی دعا محسوس
ہوتی ہے۔
جیسے میں اپنے گھٹنوں
پر جھکی ہوئی ہوں۔
میں تمہیں جانے نہیں
دوں گی۔
اس سکوت نیم شب
میں۔
میں تمہاری قربت
محسوس کر رہی ہوں۔ جو میرے لیے ایک تقویت ہے۔
یہ ایک عبادت ہے۔
ایک دعا ہے۔
تم جانتے ہو۔ میں تمہیں واپس نہیں جانے دوں
گی۔
میں تمہاری آواز سنتی ہوں۔
یہ ایک فرشتے کی سانس کی مانند ہے۔
میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے۔
میں تمہاری آواز سنتی ہوں۔
اور محسوس کرتی ہوں کہ میں ہوا کے دوش پر ہوں۔
میں اُڑ رہی ہوں۔
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔
او خدایا! لگ رہا ہے کہ میں گر رہی ہوں۔

آسمانوں کی بلندیوں سے۔
میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔
آسمانوں سے مجھے مدد ملتی ہے۔
جب تم میرا نام لے کر پکارتے ہو۔



پاکستان ہائی کمیشن۔ لندن کا بیرونی منظر

عین سکوت نیم شب کے درمیاں۔
ایسا لگتا ہے کہ کوئی بچہ میرے کانوں میں نرمی سے
سرگوشی کر رہا ہے۔
تم ایک بچے کی طرح گرفت پا رہے ہو۔
تم جانتے ہو کہ میں رقص کر رہی ہوں۔
یہ سب کچھ ایک خواب حسین کی طرح ہے۔
نہ ابتدا معلوم ہے نہ انتہا۔
تم میرے ساتھ ہو۔
یہ سب کچھ ایک خواب حسین کی مانند ہے۔
ایک خواب حسین کی مانند۔
زندگی بھی ایک حسین خواب ہے۔
خوابوں کی طرح دھند پھیلی ہوئی ہے۔
زندگی ایک دھند لکا ہے۔"

کیسے میٹھے لفظ ہیں۔ کتنی رس بھری آواز ہے۔ زندگی سے کتنا رومانس پیدا کرتی ہے۔ کتنا تجسس ابھارتی ہے کہ زندگی کی دھند کے قریب جائیں۔ دھند چھٹتی جائے۔ زندگی کی حقیقتیں واضح ہوتی چلی جائیں۔

میاں خورشید عالم بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ حبیب الرحمان صاحب قدرے خفگی سے بتا رہے ہیں۔

اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن کے دفتر میں ہماری میاں صاحب سے باقاعدہ ملاقات طے ہے۔ انہیں انتظار کرتے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔ لیکن جب ہم باعث تاخیر کا اظہار کرتے ہیں۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا تو میاں خورشید عالم اور حبیب الرحمان بھی مجسم اشتیاق بن جاتے ہیں۔ ہمیں تاخیر کی معافی مل جاتی ہے۔ میڈونا کے نام پر۔

میاں صاحب کے دفتر سے آدھے لندن سے ٹیلی فون پر رابطہ ہو جاتا ہے۔

بلوچستان کے سابق وزیر صابر بلوچ بھی لندن میں آئے ہوئے ہیں۔ ان سے تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ ملاقات کا وقت ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ ہمارے پاس بھی نہیں۔ اس لیے پاکستان میں ملنے ہی کا طے ہوتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں کے مرکز و محور عاشور کاظمی کے ہاں پیغام چھوڑ دیتے ہیں۔

کسی زمانے میں لندن پاکستانی پناہ گزینوں اور جلا وطنوں کا مرکز ہوتا تھا۔ اب تو اکثر لوگ واپس جاچکے ہیں۔ اب اپنے وطن میں جمہوریت کا موسم ہے۔ اب کیسی جلا وطنی۔ کیسی سیاسی پناہ۔ سول حکومت کے دور میں تو سیاسی جدوجہد اور طرز کی ہوتی ہے۔ مارشل لاء میں تو محاذ آرائی اور تصادم کے علاوہ کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اسی سے مارشل لاء کے قدم اکھڑتے ہیں۔ لیکن جمہوری دور میں۔ منتخب حکومت کے زمانے میں تصادم ملک اور جمہوریت دونوں کے لیے نقصان دہ رہتا ہے۔ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ منتخب حکومت کے قدم اکھڑیں تب بھی مناسب نہیں ہے۔ یا وہ سختی پر اتر آئے۔ وہ بھی موزوں نہیں ہے۔ نہ مسئلے کا حل ہے۔ اس لیے ایسا ماحول ہی کیوں پیدا کیا جائے جس سے اختلافات شدید ہوں۔ تصادم کی راہ ہموار ہو۔

اب لندن میں سیاسی لوگوں میں سے وہی رہ گئے ہیں۔ جن کے خلاف اب بھی کوئی مقدمات باقی ہیں۔ یا جنہیں لندن میں کوئی مناسب اور معقول روزگار مل گیا ہے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ اپنے اپنے وطن واپس جاچکے ہیں۔

لندن آئیں اور ریاض دولی سے ملاقات نہ ہو۔ حبیب الرحمان صاحب کے توسط سے ریاض دولی سے ہماری ملاقات پہلی بار 1975ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ آکسفورڈ اسٹریٹ جیسے اہم علاقے میں کافی بڑا فلور لیے ہوئے تھے۔ اور الیکٹرانک کا کاروبار کرتے تھے۔ بہت یادگار ملاقات تھی۔ اس وقت بھی ان کا کچھ کر گزرنے کا عزم تھا۔ بعد میں درمیان میں مارشل لاء کا وقفہ آگیا۔ یا جمہوریت کا وقفہ ختم ہوگیا۔ اور مارشل لاء پھر اپنے پر پھیلائے ہوئے مسلط ہوگیا۔ تو ریاض دولی نے ٹریول کا کاروبار شروع کیا۔ اس کاروبار میں بھی اس نے اپنی جارحیت پسند طبیعت سے نئے نئے راستے تلاش کیے۔ وہ کنگ آف بکٹ شاپ کہلانے لگا۔ مختلف فضائی کمپنیوں کے ٹکٹ وہ انتہائی کم قیمت پر دینے لگے جس پر کئی کمپنیوں نے احتجاج کیا کہ یہ قواعد کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن وہ ایاٹا کے ممبر نہیں تھے۔ اس لیے ایاٹا کے قواعد وضوابط کی زد میں بھی نہیں آتے تھے۔ ان سے دوبارہ ملاقات 1989ء میں ہوئی۔ ان کا بزنس اور ترقی کر گیا تھا۔ پھر وہ کراچی آئے ان کی سب سے عزیز ہستی چل بسی تھی۔ ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ ہر وقت مسکرانے اور خوش رہنے والا ریاض دولی اس وقت حزن وملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ والد کی جدائی کسی بیٹے کے لیے کسی بھی عمر میں

ایک ناقابل برداشت صدمہ ہوتی ہے۔

ریاض دولی شہر کے انتہائی اہم علاقے میں اپنی بکٹ شاپ لگائے ہوئے ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی آپ کو جانا ہے تو وہ آپ کو سب سے سستا ٹکٹ لے کر دیں گے۔ آپ کی بکنگ اور سفر کی تمام سہولتیں ان کے ذمے ہوں گی۔

بکٹ شاپ چلانے والوں کی اپنی دنیا ہے۔ اپنے قواعد ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ان کے آپس میں رابطے ہیں۔ اور خوب چل رہا ہے یہ کاروبار۔

ریاض دولی سے ملاقات کافی طویل ہوگئی ہے۔ اپنے نئے میگزین The Destinations کے باعث اب ٹریول کی دنیا سے ہماری دلچسپی بھی بڑھ گئی ہے۔ اس لیے تبادلہ خیال کچھ پھیل گیا ہے۔ پی آئی اے سے مسافروں کو شکایتیں۔ پاکستانیوں کو شکایتیں۔ بکنگ میں مسائل، بکٹ شاپ کی پاکستان میں ابھی کوئی شاخ نہیں کھل سکتی۔ یہاں ابھی تک توانین سخت ہیں۔ پی آئی اے اپنی اجارہ داری ختم نہیں کرنا چاہتی ہے۔ کمرشلائزیشن کے باوجود مشکلات ہیں۔ غیر ملکی کرنسی لانے لے جانے پر کوئی پابندی نہیں رہی ہے۔ لیکن دو سال میں اگر ایک سے زائد بار بیرون ملک سفر کرنا ہے تو وہ پی آئی اے سے ہی کرنا ہوگا۔ اسٹیٹ بینک سے تو اب آتے جاتے وقت بہت کم لوگ زرمبادلہ کنٹرول سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے پی آئی اے سے سفر کی شرط بے معنی ہو جاتی ہے۔

وہ کہہ رہے تھے کہ اب کراچی کی فضائیں آزاد ہوگئی ہیں۔ کوئی بھی کمپنی اطلاع دے کر اپنا جہاز لا سکتی ہے۔ اس شرط کے ہوتے ہوئے فضائی کمپنیوں کو عام پروازوں میں سواریاں کم ملتی ہیں۔ چہ جائیکہ کوئی کمپنی اپنی چارٹرڈ جہاز لے کر اترے۔ پھر پتا چلے کہ انہیں کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت نہیں ہے۔

## موت کا حسن

**میں حیرت زدہ ہوں کہ موت کو ڈیڑھ سال سے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے ایک انسان۔ وہ بھی خاتون اتنے تحمل۔ ٹھہراؤ اور پُرسکون لہجے میں اتنے میٹھے لفظوں میں بات کرسکتی ہے۔**

ریاض دولی مصر تھے کہ ہم رکیں رات کا کھانا ان کے ساتھ ان کے نئے قائم کردہ ریستوران میں کھائیں۔ جہاں پاکستانی رقص بھی ہوتا ہے۔ دعوت تو انکار کرنے والی نہیں تھی۔ لیکن ہمیں اپنے کچھ دوستوں سے ملنے کے لیے گھر واپس پہنچنا ہے۔ ورنہ اس دعوت سے لطف اندوز نہ ہونا تو کفرانِ نعمت ہے۔ ہم اس دعوت سے محروم رہتے ہیں۔ اور پھر ملنے کا وعدہ کرکے اجازت لیتے ہیں۔



کنگ آف بکٹ شاپ کہلانے والے ریاض دولی، لندن کی ایک اہم شخصیت

اسٹیشن یہاں سے دور ہے۔ اس لیے پھر بس...... ٹریول پاس ہمارے پاس ہے اس لیے لندن میں سفر کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس بس میں کنڈیکٹر نہیں ہے۔ اس لیے درمیان کے دروازے بند ہیں۔ ڈرائیور کے پاس دروازہ کھلا ہے۔ ہم تو پاس دکھا

کر خالی سیٹ پر جا بیٹھتے ہیں۔ ٹکٹ والے ڈرائیور کو پیسے دیتے ہیں اور ٹکٹ لیتے ہیں۔ کوئی بھی ڈرائیور کو جل دینے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔ ہر بس اسٹاپ پر یہی ہوتا ہے۔ بس بھی انتہائی صاف ستھری۔ ہر شیشہ اپنی جگہ موجود ہے۔

بس میں سوار نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی ناول پڑھنے میں مصروف ہیں۔ ناول کے بارے میں میرا تجسس بڑھ جاتا ہے۔ تو میں ساتھ بیٹھی خاتون سے پوچھ ہی لیتا ہوں۔ آج کل کون سا ناول زیادہ پڑھا جا رہا ہے۔ وہ کہنے لگیں۔ میں تو 'بیل جار' پڑھ رہی ہوں۔ سلویا پلاتھ کا ناول۔ سلویا پلاتھ نے ناول ایک ہی لکھا۔ اور بہت مقبول ہوگیا۔ اصل میں تو وہ شاعر تھی۔ بہت ہی سحر انگیز نظمیں لکھتی تھی بے چاری۔

''بے چاری کیوں۔'' میں پوچھتا ہوں۔

''اس نے خودکشی کر لی تھی۔''

''اسے موت کا حسن دریافت کرنے کا شوق تھا۔ پہلے بھی کئی بار کوشش کر چکی تھی۔''

''کس عمر میں اس نے اپنی جان لی۔''

''صرف تیس سال کی عمر میں۔''

''اوہ خدایا۔ کتنی جرأت مند خاتون تھی۔''

وہ میری بات سن کر حیران ہوتی ہے۔ ''اس میں کیسی جرأت؟''

''زندگی جیسی پیاری چیز سے ناتا توڑنے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے۔ خودکشی بہادر لوگ ہی کرتے ہیں۔ بزدل تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''آپ بھی مجھے شاعر لگتے ہیں۔''

''کبھی کبھار...... لکھ لیتا ہوں۔''

اس موقع پر مجید عباسی درمیان میں بولتے ہیں۔'' ان کی شاعری کی کئی کتابیں آ چکی ہیں۔''

''آپ نے سلویا پلاتھ کو پڑھا ہوگا۔''

''چند نظمیں پڑھی ہیں۔ اس کے مجموعے کی تلاش میں ہوں۔''

''اس کے سابق خاوند نے اس کی تمام نظمیں یکجا کی ہیں۔ یہ کتاب آپ کو پکاڈلی میں مل جائے گی ضرور پڑھیں۔''

''آپ بھی کچھ لکھتی ہیں۔''

''نہیں صرف پڑھتی ہوں۔''

''عام طور پر ناول اس طرح سفر میں آپ کتنے دن میں ختم کر لیتے ہیں۔''

''یہ تو صرف ایک دن کی بات ہے۔ آتے جاتے ناول تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ رہ گیا تو گھر جا کر پڑھ لیا۔''

''آپ ہر روز ناول خریدتی ہیں۔''

''نہیں ہفتے میں دو یا تین۔''

''گھر میں تو بڑا انبار لگ گیا ہوگا ناولوں کا۔''

''نہیں جی پڑھ کر ہم ایک آدھ ناول ہی پاس رکھتے ہیں۔ زیادہ تر تو ڈسٹ بن میں پھینک دیتے ہیں۔''

ہماری منزل آ رہی ہے۔ ہم خاتون کا شکریہ ادا کر رہے ہیں کہ اس نے اتنی دیر بات کر لی ہے۔ سٹرڈک کورٹ میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔

صومالیہ والی کو سیاسی پناہ مل گئی ہے۔ اس لیے اس نے پارٹی دے رکھی ہے۔ ہمیں بھی جانا ہے۔ پارٹی میں زیادہ تر سیاسی پناہ گزین ہی ہیں۔ لیکن آج کوئی سیاست کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ صرف بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

سیاسی پناہ کے بعد اب یہ فلیٹ سرکاری طور پر اسے مل جائے گا۔ بہت ہی کم کرایہ دینا ہوگا۔ اور چاہے تو وہ یہ فلیٹ خرید بھی سکتی ہے۔ یہ کرایہ فلیٹ کی قیمت کی ماہانہ قسط بن جائے گا۔

اس کی منزل سیاسی پناہ تھی۔ وہ اسے مل گئی ہے۔ لیکن اس کے ملک کا کیا ہوگا۔ اس کے ہم وطنوں کو تو اپنے ملک میں پناہ نہیں مل رہی ہے۔ کھانے کو نہیں مل رہا ہے۔ ان کا کیا ہوگا۔

☆......☆......☆

آج صبح کچھ اُداس اُداس ہے۔

ایک تنہائی ہے کہ بار بار حملے کر رہی ہے۔

رات کو نیند بھی ٹھیک سے نہیں آئی ہے۔ کمرے میں شاید گرمی زیادہ ہوگئی ہے۔ ہیٹر تیز ہوگیا ہے۔ باہر بھی ابھی اندھیرا ہے۔ زندگی موت کی امانت ہے۔ یا موت زندگی کے تعاقب میں رہتی ہے۔ زندگی تو ایک وقفہ ہے۔ اصل حقیقت تو موت ہی ہے۔

لیکن موت کے بعد کیا ہے۔ یہ تو کسی نے نہیں دیکھا نہ بتایا ہے۔ زندگی تو سب دیکھتے ہیں۔ سب زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویریں کھینچتے ہیں۔ زندگی کے گیت گاتے ہیں۔

ایک عجیب کشمکش ہے۔ جو میری ذات کے اندر جاری ہے۔ اس کشمکش پہ کیسے قابو پاؤں۔

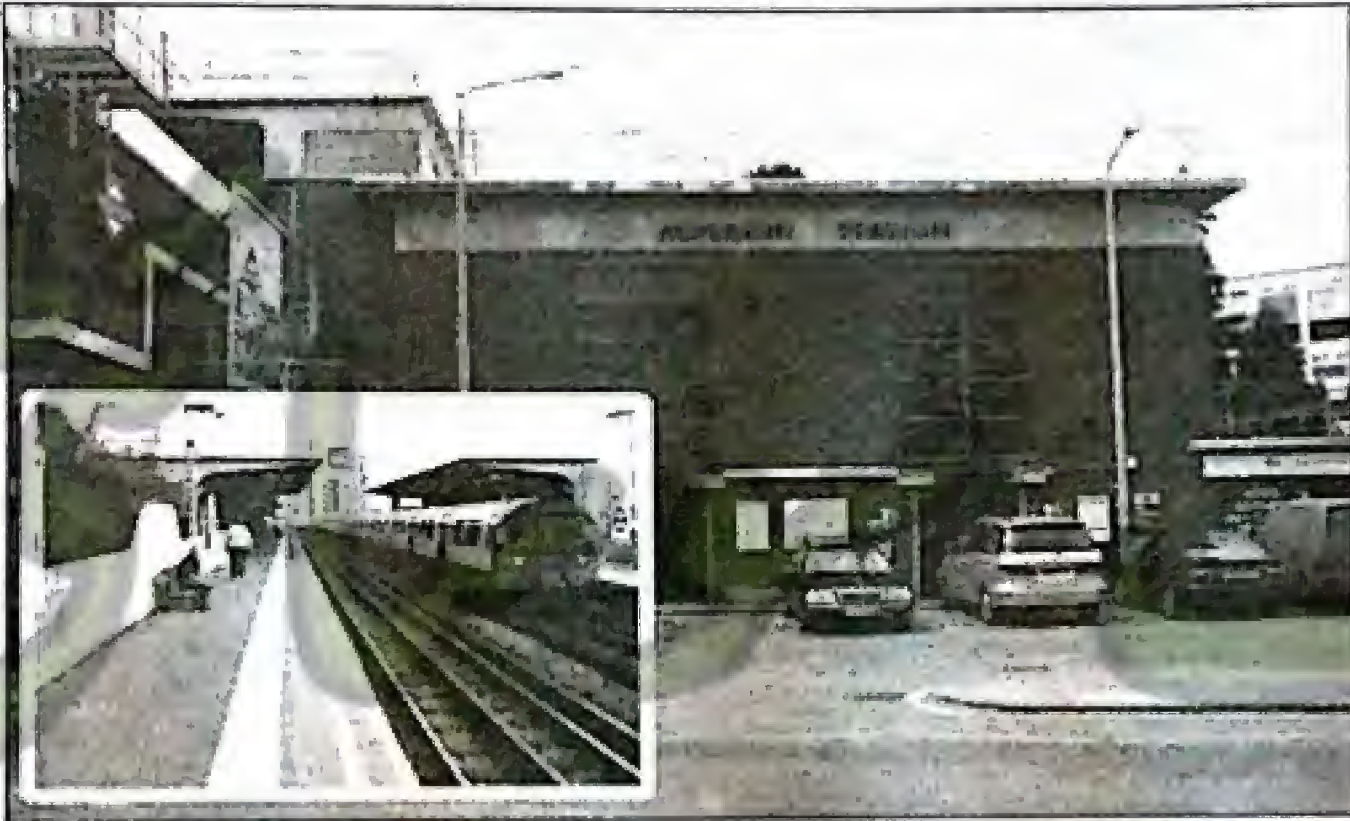
یہ حملے پہلے بھی مجھ پر ہوتے رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ میرے چاروں طرف نیست ہے۔ ایک ہست میں ہی ہوں۔ لیکن اتنے دور دور تک پھیلے ہوئے نیست میں ایک مختصر سی ہست کیا حیثیت رکھتی ہے۔ ہر طرف پھیلا ہوا خلاء میری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ شاید مجھے نگل لے گا ایک سناٹا ہے ہر طرف۔

ایسے میں میرے لیے راہ نجات صرف کوئی کتاب یا میگزین ہوتا ہے۔ جس کے مطبوعہ حروف ان خلاؤں سے اُٹھا کر میرا بازو تھام کر مجھے کسی اور دنیا میں لے جاتے ہیں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ الماری کے اوپر کتاب میں کوئی چیز پڑی ہے۔ اسے دیکھ کر جیسے ایک خوشی کی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی ہے۔ یہ ایک ڈائجسٹ ہے نہ جانے کتنا پرانا۔

میں بیڈ کے کنارے پڑا لیمپ روشن کرتا ہوں۔ اور ڈائجسٹ کی ایک کہانی میں کھو جاتا ہوں۔ ایک خاتون کی کہانی۔ جرأت مند خاتون کی کہانی جو کینسر جیسے نا قابل علاج مرض سے جنگ لڑ رہی ہے۔ اور بالآخر اسے شکست دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ہلکی ہلکی روشنی پردوں سے چھن کر میرے بستر سے سرگوشی کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ روشنی جیسے مجھے زندگی کی نوید دیتی ہے۔ میں تیزی سے پردے ہٹا دیتا ہوں۔ روشنی نے اندھیرے کو شکست دے دی ہے۔ زندگی نے موت کو مات دے دی ہے۔



الپرٹن اسٹیشن لندن کا اندرونی اور بیرونی منظر

یہ ایک اذیت ہے۔ اس سے نہ جانے کتنی بار گزر چکا ہوں۔ کتنی بار گزرنا ہے۔

ہماری منزل ومبلے ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں الپرٹن اسٹیشن پہنچنا ہے۔

زیر زمین ریلوے کی حدود ختم ہوگئی ہیں۔ ٹرین باہر آ گئی ہے۔ جیسے سیاسی لوگ روپوشی ختم کر کے باہر آ جاتے ہیں۔ یہ لندن کے مضافات ہیں۔ لندن سے زیادہ حسین۔ لندن کتنا پھیلا ہوا ہے۔ کتنی آبادی ہے کتنے لوگ ہیں۔ الپرٹن اسٹیشن آ گیا ہے۔ پلیٹ فارم بالکل پاکستان کے چھوٹے اسٹیشنوں جیسے ریل کا نظام

انگریزوں ہی نے تو برصغیر میں قائم کیا تھا۔
الپرٹن اسٹیشن ہمارے ٹریول پاس کی حدود سے باہر ہے۔ صرف ایک اسٹیشن زیادہ۔ ایک فرق کی قیمت ادا کرنے کے لیے ایک کھڑکی بنی ہوئی ہے۔ ہمارا پاس زون تین تک کے لیے ہے۔ الپرٹن سے چوتھا زون شروع ہو جاتا ہے۔

پلیٹ فارم سے باہر نکلتے ہیں۔ علی کیانی اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں۔ علی کیانی ہمارے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حروف و قلم کا رشتہ جوڑ کر نان جویں حاصل کرنے والوں سے۔ ایک طویل عرصے سے لندن میں ہیں۔ مختلف رسائل اور اخبارات سے وابستہ رہے ہیں۔ 1988ء میں جمہوریت کے قیام سے قبل لندن میں 'نوائے وقت' کے نمائندہ خصوصی تھے۔ پھر پاکستان چلے آئے۔ جمہوریت آئی تو محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہو گئے۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے انہیں وفاقی محکمہ اطلاعات میں اشتہارات کا انچارج بنایا۔ انہوں نے کروڑوں روپے کے اشتہارات تقسیم کیے۔ لیکن خود 'ملاح کے حقے' کی طرح سوکھے رہے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے قائل ہی نہیں تھے۔ آزاد کشمیر کے انتخابات ہوئے تو ٹیکنو کریٹ کے لیے مخصوص نشستوں پر انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے اور آزاد جموں کشمیر اسمبلی کے رکن بن گئے۔ وزیراعظم ممتاز راٹھور کو جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ یوں کیانی صاحب پھر صحافی کے صحافی رہ گئے۔ اور وہ بالآخر پھر لندن چلے آئے۔ جہاں ان کی رفیقہ حیات ان کی دل و جان سے عزیز ننھی بیٹی ان کے انتظار میں تھی۔ اب وہ پھر لندن میں حرف و قلم کا رشتہ جوڑ رہے ہیں اور عزت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

''آپ آسانی سے پہنچ گئے۔ کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی۔''

''دعا دیں اس شخص کو جس نے بھی یہ ٹیوب ایجاد کی۔ ہم جیسے اجنبی لوگوں کو بھی کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔''

''فاصلہ بہت تھا۔ اس لیے میں گاڑی لے کر وہاں نہیں آیا۔ بہت دیر لگ جاتی۔ انڈر گراؤنڈ سب سے تیز اور اچھا ذریعہ ہے۔''

''پاکستان کے کیا حالات ہیں۔''

''آج کل تو امن و امان ہے۔ اپوزیشن اور حکومت میں کسی حد تک کشیدگی ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہیں رہے گی۔''

''منو بھائی کا کیا حال ہے۔''

''بہت دنوں پہلے فون پر بات ہوئی تھی۔ ٹی وی کے لیے نئی ڈرامہ سیریز لکھ رہے ہیں۔''

''رفیع بٹ سے ملاقات ہوئی ہے۔''

''اے پی این ایس کے الیکشن کے لیے آئے تھے۔ اس وقت ملاقات رہی۔''

ہم بشیر ریاض صاحب کے گھر کی طرف رواں ہیں۔ بشیر ریاض اردو کے اچھے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ لیکن وہ بھی صحافت اور سیاست کے دشت میں نکل گئے۔ افسانے سے رشتہ چھوٹ گیا۔ وہ بھی ایک طویل عرصے سے لندن میں ہیں۔ انہوں نے بڑی جرأت اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ جب محترمہ بینظیر بھٹو لندن میں تھیں تو وہ ان کے پریس ترجمان تھے۔ ان کے ساتھ ہی وہ پاکستان آئے اور غیر ملکی اخبار نویسوں ملکی اخبار نویسوں سے ایسے تعلقات رکھے کہ ہر طرف محترمہ بے نظیر بھٹو کا ذکر ہی ہوتا تھا۔ پھر محترمہ بے نظیر بھٹو نے حکومت قائم کی تو وہ فارن پریس کے لیے پریس ترجمان بنے۔ اپنے اصولوں کے پکے، مصلحت کے قائل نہیں ہیں۔ جو ایک بار نظریاتی مخالف، وہ ہمیشہ نظریاتی مخالف۔

اپنے کام سے کام رکھنے کے اتنے قائل کہ پاکستان آئے تو اکیلے۔ اپنی بیگم کو پاکستان نہیں لائے۔ وہ جہاں مصروف کار تھیں۔ انہیں وہیں ملازمت کرنے دی کہ پاکستان میں جمہوریت کے موسم کا کچھ پتا نہیں کہ کب

تک رہے۔ اسی دوران میں یہ پریشان کن خبر آئی کہ ان کی بیگم کو کینسر کی مہلک بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ ایک دو بار وہ لندن آئے تھے گئے۔ اُداس بھی تھے پریشان بھی۔ پھر جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ لندن مستقل چلے آئے۔

پہلے وہ مارشل لاء کا مقابلہ کرتے رہے۔ جاسوسوں سے نمٹتے رہے۔ ایجنٹوں سے نبرد آزما رہے۔ اپنی صفوں میں موجود مخالفین کو بھی بے نقاب کرتے رہے۔ لیکن یہ جنگ جوان کی بیگم لڑ رہی تھی۔ یہ ایک عجیب جنگ تھی۔ جس میں جیتنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ صرف مہلت کی بات تھی کہ قدرت کتنے مہینے اور دن دیتی ہے۔

بشیر ریاض اپنے خوبصورت گھر کے باہر اسی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ گھر لندن کے آئیڈیل گھروں میں سے ہے۔ باہر چھوٹا سا لان۔ ڈرائنگ روم کے شیشے میں سے جھانکتے گلدان۔ خوبصورت پردے۔

مختصر سا ڈرائنگ روم...... آتشدان۔ اس کے اوپر محترمہ بے نظیر بھٹو کی بلاول کو گود میں لیے ہوئے خصوصی تصویر۔ جو خود محترمہ نے انہیں اپنے دستخطوں کے ساتھ دی ہے۔ ایک طرف بھٹو صاحب کی خوبصورت پینٹنگ۔ یہ آشیانہ سجانے میں بشیر ریاض کا کوئی ہاتھ نہیں ہے سب بیگم بشیر ریاض کے سلیقے اور قرینے کا مظہر ہے۔ انہوں نے بھی بڑی جرأت سے زندگی گزاری ہے۔ بشیر ریاض تو زیادہ تر سیاست اور صحافت میں اُلجھے رہے۔ جہاں ان جیسے بااصولوں کے لیے یافت تو کچھ نہیں۔ مگر کھونے کو بہت کچھ ہے۔ بیگم جہاں آراء بشیر نے اپنی اس کائنات کو تعمیر کیا۔ آراستہ کیا۔ برقرار رکھا، اور اب وہ اس کائنات میں نہیں ہیں۔ وہ قریب ہی ایک اسپتال میں موت سے جنگ لڑ رہی ہیں۔ اس وقت ان کی والدہ وہاں عیادت کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ بشیر ریاض جائیں گے تو وہ گھر آئیں گی۔ اس بیماری کے مقابلے میں انسان کتنا بے بس ہے۔ سارے تعلقات، سارے وسائل بے وقعت ہیں۔ لندن جیسے ترقی یافتہ شہر میں رہتے ہوئے بھی اس بیماری کا علاج دریافت نہیں کیا جاسکتا۔

''چیئرمین صاحب کا کیا حال ہے۔''

(بشیر ریاض، واجد شمس الحسن کو چیئرمین کہتے ہیں۔ یہ ایک سوا سال نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین رہنے کا خمیازہ ہے)

''چیئرمین صاحب حسب معمول ہیں۔ اپنے اصولوں پر قائم ہیں۔ 'میگ' کے لیے لکھ رہے ہیں۔''

''اور دوست احباب۔''

''سب آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ اور آپ کی خیریت جاننا چاہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے لیے پریشان تھے۔''

''اللہ کی مرضی، کبھی کبھی حالت سنبھل جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر وہی۔''

''اور دوست احباب۔''

''چلیے کہیں لنچ کرتے ہیں۔''

''ایسے تکلف کی کیا ضرورت ہے۔''

''شام جی۔ آپ نے کہیں روز روز لندن آنا ہے۔ کیسا کھانا پسند کریں گے۔''

''یہیں کا مقامی کھانا ہو تو اچھا ہے۔ ایشیائی کھانے تو وطن پہنچ کر کھانے ہی ہیں۔''

سڑکیں کتنی صاف ستھری ہیں۔ دونوں طرف سبزہ، کھپریل کی جھکی چھتوں والے ایک جیسے گھر۔ تھوڑی دیر بعد کھلے کھلے پارک۔ بچوں کے لیے جھولے۔ فوارے۔ کتنا پُرسکون علاقہ ہے۔

ریستوران کا نام ہے۔ 'بیف ایٹرز' باہر پارکنگ کے لیے بہت وسیع جگہ ہے۔ خدمت گزار فرنگی خواتین، لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی ہوئی، یہاں ہم ان کے کرم فرما ہیں۔ مہمان جو کھائیں گے اور بل ادا کریں گے۔ یہاں نہ رنگ کا مسئلہ ہے۔ نہ زبان کا۔ وہ اپنی روایات اور اقدار کے مطابق ہماری خدمت کر رہی ہیں۔

برطانیہ کی دیگر دلچسپیوں کا
حال ماہ اگست میں ملاحظہ فرمائیں۔

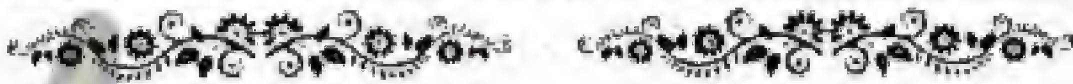
کارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت سامان دل سوز تحریریں، جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

# اِک ذرا سی بات تھی...



جاوید راہی



اُس کی ہوس ناکی نے اُسے جیل کا قیدی بنا دیا

''بابا جی! میرے لیے بچہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی انسانی زندگی کے لیے ہوا اور پانی۔ دو بیویوں کو ملک صاحب نے اسی وجہ سے طلاق دی تھی کہ ان میں کئی کئی سال کے انتظار کے بعد بھی دونوں کی گود ہری نہیں ہو پائی تھی۔ نہ ان میں کوئی کمی تھی اور نہ مجھ میں کوئی ایسا نقص ہے، ملک صاحب کے بھی ٹیسٹ پوزیٹو ہیں۔'' رضیہ بیگم نے پریشانی کے عالم میں کالے علم کے ماہر برکت مسیح کے حجرے میں صف پر دوسرے کئی لوگوں میں سے باری آنے پر بڑی بیچارگی سے اپنی بپتا بیان کرتے کوئی سدباب کی التجا کی۔

''دیکھو بیٹی! تمہیں نوچندی اتوار تک انتظار کرنا ہوگا، کچھ چیزیں حاضرات کی مَد میں مجھے درکار ہوں گی۔ کوئی ساڑھے سات ہزار روپے تک کا خرچہ ہوگا۔''

''جی بابا۔ یہ لیں دس ہزار۔'' رضیہ بیگم نے اپنے بڑے سے پرس کی زپ کھولتے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکالتے بابا برکت مسیح کے آگے رکھ دیے۔

''ٹھیک ہے بیٹا رابطہ نمبر چھوڑ جاؤ تمہیں آگاہ کر دوں گا۔'' نوٹ سنبھالتے اس نے رضیہ بیگم کو جانے کی اجازت دے دی۔ رضیہ سعادت مندی سے اُٹھی اور آستانہ سے باہر آ کر ڈرائیور کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا حکم دیا جو باہر درخت کی چھاؤں میں بیٹھا رضیہ بیگم کا انتظار کر رہا تھا۔ برکت مسیح کا اَتا پتا بھی اسی ڈرائیور نے دیا تھا۔

جی بی جی ڈرائیور نے اُٹھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور رضیہ بیگم پیچھے سیٹ پر آ بیٹھی۔ تمام راستے وہ خاموش بیٹھی طرح طرح کے خیالات میں اُلجھی رہی۔

ملک کرامت کا شمار علاقہ کے بڑے لوگوں میں ہوتا تھا خاندانی رئیس تھے کئی فیکٹریاں، زمینیں اور بہت کچھ مگر ان کے نصیب میں اولاد نام کی نعمت شاید نہ تھی۔ اپنا خود کا علاج، بیویوں کا علاج مگر نتیجہ صفر نکلتا تیسری شادی بھی کی مگر وہی بدنصیبی۔ اپنے طور پر رضیہ بیگم کئی ڈاکٹروں، پیروں فقیروں کے دروازوں پر چکر لگاتی رہتی مگر لاحاصل، کچھ بھی ہاتھ نہ آتا۔ اس عیسائی کے بارے میں ملک صاحب کے نجی ڈرائیور امجد نے بتایا تو آج وہ اس کے آستانہ چک دس فور ایل میں موجود تھی۔

رضیہ بیگم گاڑی سے اُتر کر سیدھی اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ ملازمہ کو چائے لانے کا کہہ کر مسہری پر دراز ہو گئی۔

اس کے ذہن میں ایک ہی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کی گود بھر دے ورنہ اسے بھی اپنی فراغت نظر آ رہی تھی۔

رضیہ بیگم برکت مسیح کے آستانہ کے اندر بیٹھی وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی جو وہ اسے بتا رہا تھا۔

''بیٹی میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ اگر تم اس عمل

میں کامیاب ہو گئیں تو سمجھ لو تمہاری مراد پوری ہو گی۔ یہ عمل تم نے تین دن تک رات کے پہلے پہر قبرستان میں کسی بھی بچے کی قبر پر سرہانے بیٹھ کر کرنا ہے۔ یہ رہا وہ عمل۔'' برکت مسیح نے کاغذ کا ایک ٹکڑا رضیہ بیگم کی طرف بڑھا دیا۔

''بابا جی یہ چند الفاظ تو میں آسانی سے دہرا لوں گی مگر قبرستان میں جا کر، کسی بچے کی قبر رات کے اندھیرے میں تلاش کرنا اور پھر میں ٹھہری عورت ذات...... میں یہ سب کر سکوں گی کیا؟''

بیٹا! یہ آپ کا مسئلہ ہے اگر یہ میرے کرنے والا کام ہوتا تو میں آپ کو کہتا ہی نہ۔'' یہ کہہ کر اس نے رضیہ بیگم کو اجازت دے دی۔

باہر ڈرائیور امجد علی گاڑی میں بیٹھا رضیہ بیگم کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنی مالکن کو دیکھ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ رضیہ بیگم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاڑی میں پھیلی خاموشی کو رضیہ بیگم نے امجد علی کو مخاطب کر کے توڑا۔ ''جی بی بی جی۔''

''امجد علی تم میرے بھائیوں جیسے ہو اور میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم کو اپنا راز دار بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''بی بی جی آپ بے فکر رہیں میری جان کی بھی ضرورت پڑے تو میں حاضر ہوں'' امجد علی ڈرائیور نے بڑے اعتماد سے رضیہ بیگم کو جواب دیا۔

بابا جی نے ایک چلہ لکھ کر دیا ہے جو تین دن تک قبرستان میں کسی بچے کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر رات کے پہلے پہر کرنا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو میں یہ کر سکتی ہوں۔''



''بی بی جی آپ کمزور دل ہو کر بھی رات کے وقت قبرستان میں جانے کے لیے تیار ہو تو میں کیوں نہیں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے اگلے ہفتے ملک صاحب کام کے سلسلہ میں دبئی جائیں گے اور ہم یہ عمل دہرائیں گے۔'' رضیہ بیگم نے پرس سے کچھ روپے نکال کر امجد علی ڈرائیور کے سپرد کر دیے جو اس نے لے کر اپنی جیب میں رکھتے کہا ''بی بی جی آپ بے فکر ہو جائیں۔''

☆......☆......☆

ملک صاحب پانچ روز کے لیے دبئی چلے گئے اور رضیہ بیگم نے امجد علی کو ساتھ لیا، قبرستان میں گھوم پھر کر ایک چھوٹے سے بچے کی قبر کا انتخاب کر لیا یہ قبر بھی نسبتاً ذرا آمد و رفت سے ہٹ کر درختوں کی اوٹ میں بنی قبروں میں سے ایک تھی۔

رات آٹھ بجے کا پروگرام طے پا گیا گاڑی پر جانے کی بجائے امجد علی کی موٹر سائیکل پر جانے کا کہا رضیہ بیگم نے۔

''ٹھیک ہے بی بی جی میں موٹر سائیکل لے کر پارک کے کونے پر پورے آٹھ بجے آپ کا انتظار کروں گا آپ آٹو میں بیٹھ کر آ جایئے گا۔''

ٹھیک آٹھ بجے رضیہ بیگم گھر سے نکلی اور آٹو پکڑ کر پارک کا کہتے بیٹھ گئی، امجد علی کو باہر کھڑے پایا تو آٹو چھوڑ کر امجد علی کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ اس نے قبرستان والی سڑک کی جانب موٹر سائیکل موڑ لی۔

جنازگاہ کے اندر کوئی جنازہ پڑھایا جا رہا تھا اور ویسے بھی قبرستان میں اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے۔ امجد علی نے موٹر سائیکل قبرستان کے اندر جانے والی پگڈنڈی پر ڈالتے احتیاط سے اس بچے کی قبر پر جانے والی سائیڈ منتخب کی تھی۔

قبرستان میں جگہ جگہ بلدیہ نے پول لگوا دیے تھے جن پر بلب روشن تھے ویسے بھی موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی بدولت قبروں کے اِدھر اُدھر جاتا راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا آخر کار امجد علی نے موٹر سائیکل چھوٹی سی قبر کے قریب آ کر روکی۔

رضیہ بیگم نے اُتر کر کانپتے قدموں سے بچے کی قبر کی طرف چلنا شروع کیا۔ امجد علی موٹر سائیکل کھڑی کر کے اس کے اوپر دونوں ٹانگیں سمیٹ کر جم گیا۔ رضیہ بیگم نے برکت مسیح کا بتایا ہوا عمل اچھی طرح ازبر کر لیا تھا۔ اس لیے پڑھنے میں اسے کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس عمل کو شروع کرنے سے پہلے اس کے پورے وجود میں ایک عجیب طرح کی سنسناہٹ گونج رہی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبے قبرستان کا ماحول دل دہلا دینے والا تھا۔ امجد علی بھی سہما ہوا رضیہ بیگم سے چند منٹ دور موٹر سائیکل پر جما اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

مقررہ تعداد پوری کرنے کے بعد رضیہ بیگم اُٹھی اور قبروں سے بچتی ہوئی ڈرائیور امجد علی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور رضیہ بیگم کے بیٹھتے ہی قبرستان سے باہر جانے کے لیے بڑھا دی۔

☆......☆......☆

تین دن تک رات کے پہلے پہر جا کر رضیہ بیگم امجد علی کی موٹر سائیکل پر وہ عمل جو بابا برکت مسیح نے بتایا تھا بچے کی قبر کے سرہانے دہراتی رہی۔ دو ماہ بیت گئے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اسے برکت مسیح پر بہت غصہ آیا۔ ڈرائیور امجد علی کو گاڑی نکالنے کا کہا اور اس کے ساتھ برکت مسیح کے آستانہ پر آئی اس سے اس بات کا تذکرہ کیا تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ تمہیں تو اکیلی جانے کا کہا تھا اور تم اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ بھی لے گئیں۔ میرے پاس اس کا کوئی حل نہیں، غلطی تمہاری تھی اس لیے اب تم جاؤ میرے پاس جو اس معاملہ کا توڑ تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا اب کوئی اور دروازہ دیکھو۔'' کہتے وہ دوسرے حاجت مندوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رضیہ بیگم مایوس ہو کر واپس امجد علی کے ساتھ گھر آ گئی تمام راستے دونوں خاموش رہے۔ دونوں کے درمیان کوئی بات چیت بھی نہ ہوئی۔

☆......☆......☆

زندگی کی گاڑی اسی رفتار سے رواں دواں تھی کہ رضیہ بیگم کی ملاقات ایک سٹور پر کام کرنیوالے لڑکے سخاوت سے ہو گئی۔ پہلے پہل تو وہ اسے صرف چرب زبان ہی تصور کرتی رہی مگر اس کی باتوں نے اس کے اندر کسی کونے میں گھر کر لیا۔ اکثر فون پر بات ہونے لگی اور رضیہ بیگم نے اسے اس کی بہن کی شادی کے لیے پچاس ہزار روپے کی رقم بھی بطور مدد دے دی جس پر

سخاوت رضیہ بیگم کا بہت احسان مند ہو گیا۔

بات آگے بڑھتے بڑھتے بے تکلفی پر پہنچ گئی اور آخر کار رضیہ بیگم کے قدم ڈگمگا گئے اور ملک صاحب کی غیر موجودگی میں سخاوت چپکے سے رضیہ بیگم کے بیڈروم تک پہنچ جاتا۔

آخر کار وہ ہو گیا جس کی توقع ہی نہیں تھی۔ رضیہ بیگم کی ملک صاحب سے بے وفائی رنگ لے آئی اور رضیہ بیگم کی گود ہری ہو گئی۔

رضیہ کی بے وفائی گناہ کی صورت اس کی کوکھ میں پھوٹ چکی تھی۔ جہاں اس کے دل میں ملک صاحب سے بے وفائی کی خلش تھی تو ایک بے پناہ خوشی بھی اس کے رگ و پے میں سرائیت کر رہی تھی۔

جب دوسرا ماہ شروع ہوا تو رضیہ بیگم نے دبی زبان میں ملک صاحب کے کان میں یہ خبر ڈال دی۔ پہلے تو انہیں اس امر کا یقین نہ ہوا، فوراً ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور بھاگم بھاگ شہر کے معروف پولی کلینک میں رضیہ بیگم کا ٹیسٹ کروایا۔ رپورٹ پوزیٹو دیکھ کر ملک صاحب نے خیرات کی شروعات کر دی، آس پڑوس کے جو بھی غریب غربا گھر تھے ان پر دستک دے دے کر راشن اور نقد رقم خیرات کی گئی۔ رضیہ بیگم کو دس تولے کا خوبصورت طلائی سیٹ بطور تحفہ پیش کیا۔

اُدھر رضیہ بیگم نے سخاوت پر اپنی عنایات کے دروازے کھول دیے۔ نئی موٹر سائیکل اور جیب نوٹوں سے بھر دی۔ جہاں سخاوت خوش تھا وہاں اس کے دل میں اُٹھنے والی خلش بھی اس کو پریشان کر رہی تھی کہ رضیہ بیگم کی کوکھ میں پلتا اس کا اپنا جگر گوشہ جس کو وہ شاید تمام عمر اپنا کہہ کر مخاطب بھی نہ کر پائے گا۔ جس کا اظہار اس نے رضیہ بیگم سے بے دھڑک کر دیا تو اس نے کہا کہ تم کو تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارا بچہ ہزار نعمتوں میں پرورش پائے گا آگے چل کر کیا ہوگا یہ تم اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔'' رضیہ بیگم کی تسلی پر وہ مطمئن ہو گیا۔

☆......☆......☆

بیٹے کی خوشی میں ملک ہاؤس روشنیوں کے سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ آج چاروں جانب خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سخاوت کے اندر بھی اپنے بیٹے کی آمد پر ایک مسرت کا احساس ہو رہا تھا رضیہ بیگم کی قدر و منزلت ہزار گناہ بڑھ گئی تھی۔ ملک صاحب کی نظر میں جو وہ دونوں نہ کر سکیں رضیہ بیگم نے کر دکھایا۔

ملک صاحب کا تو صرف نام تھا مگر در پردہ وہ سخاوت ملک صاحب کی بھومی نبھا رہا تھا بیٹے کے بعد ایک بیٹی کا جنم سونے پر سہاگہ بن کر ثابت ہوا۔ ملک صاحب دونوں بچوں پر جان چھڑکتے۔ رضیہ بیگم نے ایک اچھا فلیٹ سخاوت علی کو کرایہ پر دلا دیا تھا اس کی تمام تزئین اور سخاوت پر اس نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا تھا۔ اکثر وہ دونوں بچوں کو لے کر چوری چھپے سخاوت کو ملاتی رہتی تھی۔ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ اپنی زبان سے کوئی بات ادا کر پاتے سخاوت اپنے دونوں بچوں کو مل کر بے حد خوش ہوتا تھا۔

ڈرائیور امجد کو اس ساری صورت حال کی خبر تھی اور وہ رضیہ بیگم سے ایک دو بار قریب آنے کا اظہار کر چکا تھا مگر رضیہ بیگم اسے ٹال مٹول کر کے اس کی جیب نوٹوں سے بھر دیتی۔ بظاہر وہ خاموش ہو جاتا مگر اندر سے اس کے دل میں رضیہ بیگم اور سخاوت علی کے بارے میں سخت نفرت کی دیوار بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

ملک صاحب اپنے وسیع کاروبار کے سلسلہ میں کئی کئی ماہ تک ملک سے باہر رہتے پیچھے کا نظام ملازموں کے سپرد تھا یا امجد علی گھر کے تمام ضروری امور سر انجام دیتا۔ اس لیے ملک صاحب ان سارے معاملات سے بے خبر اپنے کاموں پر جتے رہتے انہیں کیا خبر کہ ان کی غیر حاضری میں پیچھے کیا کیا ہو رہا تھا؟۔

☆......☆......☆

یہ سب کچھ مجھے جیل میں ملاقات کے دوران ڈرائیور امجد علی سے معلوم ہوا۔ رضیہ بیگم سے لے کر سخاوت، بابا برکت مسیح، رضیہ بیگم کے شوہر ملک صاحب کی ساری روداد جو مجھے لفظ لفظ سننے کو ملی یہ آپ نے میری وساطت سے ریڈ کر لی۔ اب میں آپ کو امجد علی ڈرائیور کی زبانی اس کی سفاکیت کے بارے میں آگاہ کرنے جا رہا ہوں۔

تو پھر تمہارے اندر جو نفرت رضیہ بیگم اور سخاوت کے لیے موجود تھی اس کی بھینٹ تم نے دو پھول جیسے بچے بھی چڑھا دیے؟۔''

امجد علی نے بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا اور بولا۔

''جناب بات دراصل میرے ضمیر کی تھی جو مجھے اپنے مالک سے نمک حرامی کرنے پر دن رات کوستا۔ میرا مالک تو مجھے گھر کی ذمہ داری سونپ کر گیا تھا، پیروں فقیروں اور چلہ کشی تک تو ٹھیک تھا مگر مالکن نے جو رشتہ سخاوت کے ساتھ استوار کیا اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میرا اپنا ذہن بھی مالکن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شطانیت کے جال میں پھنس کر میں نے مالکن کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ میرے سوا کسی کو مالکن کی گھناؤنی زندگی کے بارے میں کچھ علم نہ تھا میں ہی واحد ذریعہ تھا ان دونوں کے درمیان جو رضیہ بیگم کی بے غیرتی پر پردہ ڈالے ہوئے تھا۔

رات بھر میں اس بات پر سوچتا رہا کہ رضیہ بیگم کو اپنی طرف متوجہ کروں۔ صبح میں نے اُٹھ کر کوارٹر بند کیا اور اندر بنگلہ کی طرف آ گیا رضیہ بیگم اپنی ناجائز بیٹی گود میں لیے فون پر سخاوت علی سے ہی بات کر رہی تھی، میں اندر سے بل کھا کر رہ گیا۔ دوسری طرف سے سخاوت اپنے بچوں سے ملنے کی ضد کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر رضیہ بیگم نے اسے کل ملنے آنے کا کہتے اپنی بیٹی کو اٹھانے کا اشارہ کیا جو بار بار فون کو اس کے کان سے کھینچ رہی تھی۔ میں نے اندر کی نفرت پر قابو پاتے اس کو اُٹھایا اور باہر نکل کر لان میں آ گیا۔

کافی دیر بعد وہ باہر نکلی اور بچی کو میرے ہاتھوں سے لیتے اندر جانے لگی تو میں نے اسے روک کر اپنا مطالبہ دہرایا۔ ''دیکھو امجد! میں تمہیں باقاعدہ تمہارے کام کا معاوضہ دیتی آ رہی ہوں اور ویسے بھی میں تمہیں شروع دن سے بھائی سمجھتی آ رہی ہوں یہ سب کچھ میری مجبوری تھا۔ نہ بدکرداری تھی اور نہ ہی میں نے ملک صاحب کی امانت میں خیانت کرنے کا سوچا تھا جو ہوا اس میں میری بے حد مجبوری کا عمل دخل تھا۔ میں بہت جلد یہ سلسلہ بھی ختم کرنے والی ہوں اور جب تک میری زندگی رہی میں تمہاری خدمت کرتی رہوں گی۔ اگر تم پھر بھی اس حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمہیں ملک صاحب سے کہہ کر نوکری سے فارغ کروادوں گی یہ سب کہتے وہ اندر چلی گئی۔

میں کوارٹر میں آ کر اس کے کھرے جواب پر کڑھتا رہا میرے ذہن کی پستی نے اس کی باتوں پر غور کرنے کی بجائے اپنے اندر انتہائی فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے کچن سے گوشت کاٹنے والا چھرا اُٹھا کر اپنے کوارٹر میں رکھ لیا۔

ساری رات میں نفرت کی آگ میں جھلستا رہا۔ رہ رہ کر کانوں میں رضیہ بیگم کے جملے کہ تمہیں نوکری سے نکلوا دوں گی گردش کرتے رہے۔ میں نے چھرا گاڑی کی سیٹ کے نیچے رکھتے جو فیصلہ کیا تھا اس پر عمل کرنے کی پختگی پر غور کرنے لگا۔

رضیہ بیگم تیار ہو کر دونوں بچوں کو سنبھالتی باہر نکلی اور کوئی بات کیے بغیر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک بار پھر اپنے فیصلہ کو بدلتے اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی مگر اس کا جواب نفی میں ہی ملا۔ میرے ارادے کی دیوار مزید بلند ہو گئی جسے عبور کرنا اب میرے اپنے بس میں بھی نہیں تھا۔

گاڑی فلیٹ کے نیچے آ رکی، اوپر بیٹھا سخاوت بے صبری سے انتظار میں تھا اسے کیا معلوم کہ میرے اندر کیا چل رہا تھا؟۔ رضیہ بیگم دونوں بچوں کو لے کر اوپر فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

میں حسب سابق گاڑی کے اندر بیٹھا اس کی واپسی کے منتظر کا ڈرامہ رچا رہا تھا۔ جب مجھے چاروں جانب سے یقین ہو گیا کہ کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں ہے تو میں نے سیٹ کے نیچے پڑا چھرا نکالا اور اسے قمیض کے نیچے چھپائے سیڑھیاں چڑھ آیا۔

ہلکی سی دستک پر دروازہ کھولنے والا سخاوت تھا جس نے اپنا ناجائز لڑکا اُٹھا رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا میں نے بجلی کی رفتار سے چھرا نکالا اور ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ میرے سر پر خون سوار ہو گیا دونوں بچوں سمیت میں نے رضیہ بیگم کا بھی قصہ پاک کر دیا۔ باہر سے فلیٹ کا دروازہ لگاتے گاڑی اسٹارٹ کی اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ ابھی تک پیشی کی تاریخ نہیں نکلی''۔ بتا کر امجد علی نے سر جھکا لیا۔

مالک سے وفاداری یا اپنی ہوس کی ناکامی نے اُسے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ جو بھی تھا شیطان نے امجد علی کو اُس کے مقام تک پہنچا دیا تھا۔ میں یہ سب سوچتا اگلی کہانی کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆......☆☆

پلیٹ فارم

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے

# عید مبارک



ممتاز احمد

اُس ریلوے افسر کی سچی کہانی، جس کی رحم دلی نے اُسے اُس کا سب کچھ واپس دلا دیا تھا

بے شمار برکتوں اور رحمتوں بھرے ماہ مقدس رمضان المبارک کی آمد آمد تھی۔ ویسے تو ہمارے گھر کی شروع سے یہی یہ روٹین رہی ہے کہ ہر مہینے کے آغاز میں ہی تنخواہ ملنے کے بعد پورے مہینے کا راشن ڈال دیا جاتا ہے مگر استقبالِ رمضان کے سلسلے میں خاص اہتمام کے ساتھ راشن جن میں ایک درجن شربت کی بوتلیں، بیسن، کوکنگ آئل، دہی بھلوں کا، فروٹ چاٹ کا سامان اور کھجوریں وغیرہ ایک یا دو دن پہلے ہی گھر میں لے آتا تھا تو اس بار بھی ایسا ہی کیا۔

اِس کے ساتھ ہی میمونہ (میری بیوی) نے الٹی میٹم دے دیا کہ عید سے پہلے اُس کے اور سب بچوں کے نئے کپڑے اور جوتے بھی لینے ہیں۔ میں نے کہا کہ ابھی سے کپڑے جوتے خرید لو مگر بچوں کا اصرار تھا کہ پاپا جانی شاپنگ کا جو مزہ چاندرات کو ہوتا ہے وہ پہلے نہیں۔ چنانچہ میں نے ہتھیار ڈال دیے اور عید کی شاپنگ چاند رات تک مؤخر کردی۔

میں محکمہ ریلوے میں STE (اسپیشل ٹکٹ ایگزامینر) کی پوسٹ پر ہوں اور میری ڈیوٹی ٹرین میں سوار مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنا اور بغیر ٹکٹ مسافروں کو ٹکٹ بنا کر دینا ہے۔ میرے شب و روز ٹرینوں میں گزرتے ہیں اس طرح پلیٹ فارم، ریلوے اسٹیشن اور ٹرین کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ پانچوں بچے اپنی اپنی پڑھائی میں مگن رہتے ہیں۔ جس مکان میں ہماری رہائش ہے۔ وہ محکمہ ریلوے کی سرکاری کالونی کا مکان ہے، جسے میمونہ نے اپنے سگھڑپن سے ایک خوبصورت گھر بنا رکھا ہے۔ پیار بھری ہماری یہ زندگی رواں دواں تھی۔

میرے والدین کی صرف دو اولادیں تھیں۔ ایک بھائی عنایت علی، جو مجھ سے چار سال بڑا تھا اور دوسرا میں سیف علی۔ بچپن گاؤں میں گزرا والد صاحب کی گاؤں میں زرعی زمین تھی۔ گھر کا اناج تھا۔ ایک ڈیرہ بھی تھا جہاں دو تین بھینسیں، چارہ کاٹنے والا ٹوکہ اور ایک گنے سے رس نکالنے والا بیلنا بھی لگا تھا۔ گنے کے رس سے گڑ بنایا جاتا تھا۔ فصلوں کی کاشت اور کٹائی وغیرہ کے لیے مزارعے تھے۔ بھینسوں کی دیکھ بھال اور دودھ دوہنے کے لیے الگ ملازم تھا۔ تو اس طرح خالص دودھ، مکھن، لسی اور گڑ وغیرہ کی گھر میں بہتات تھی۔ گاؤں میں ہماری ایک بہت بڑی حویلی تھی جہاں ہم رہتے تھے۔ مجھے شروع سے ہی پڑھنے اور سرکاری افسر بننے کا شوق تھا تو اپنے اسی شوق کی تکمیل میں اپنے گاؤں سے مڈل اور پھر

ساتھ والے گاؤں کے ہائی اسکول سے میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کیا۔

میرے پڑھائی کے شوق کو دیکھتے ہوئے والد صاحب نے مجھے شہر کے ایک کالج میں داخلہ دلوایا جہاں میری رہائش ہوسٹل میں تھی۔ میں مہینے میں ایک بار گاؤں آتا اور ایک دو دن رہ کر واپس شہر چلا جاتا۔ والد صاحب مجھے ہر ماہ ایک معقول رقم خرچے کے لیے دیتے ساتھ ہی دیسی گھی کی بنی انواع و اقسام کی سوغاتیں، جن میں دال کا گاجر کا حلوہ سوجی کی پنجیری، گڑ وغیرہ والدہ صاحبہ بنا کر دیتیں، جو ہم سب دوست، کلاس فیلو مل کر کھاتے تھے۔

میرے بڑے بھائی عنایت علی کو پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بھائی اپنی اکڑفوں، پھوں پھاں اور ٹھاٹ باٹ سے رہتا۔ قیمتی کپڑے بوسکی، کرنڈی وغیرہ پہننا، دوسروں کو مرعوب کرنا، پرندوں کا شکار کرنا اُس کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ جب میں ایف اے کا امتحان دے کر گاؤں آیا تو بھائی عنایت علی کی شادی کی بات چل رہی تھی بلکہ شادی طے پا چکی تھی اور ایک ماہ بعد شادی کی تاریخ تھی۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں کیونکہ یہ ہمارے گھر کی پہلی خوشی تھی۔

جب شادی کی تاریخ نزدیک آ گئی تو ہماری حویلی میں رشتہ دار مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ پوری حویلی کو برقی قمقموں اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا دیا گیا۔

مہندی کی رات بھائی کے دوست یار شہر سے گلوکار اور رقاصائیں لے آئے تو ساری رات ناچ گانا اور ہوائی فائرنگ، آتش بازی کا دور چلتا رہا۔ اگلے دن بارات تھی اور اُس سے اگلے دن انتہائی شاندار ولیمہ کیا گیا الغرض دل کھول کر پیسہ خرچ کیا گیا۔

زہرا بھائی کی دلہن اور میری بھابی بن کر حویلی میں آ گئی۔ بھابی زہرا ایک بہت بڑے زمیندار کی بیٹی تھی۔ بے تحاشا جہیز جس میں پانچ بھینسیں بھی شامل تھیں لے کر



آئیں۔ بھابی زہرا ایک نک چڑھی مغرور اور خود پسند عورت تھی۔ چنانچہ اُس نے آتے ہی بھائی کو مکمل اپنے کنٹرول میں کرلیا۔ گھر میں نوکر چاکر تھے تو بھابی کوئی کام نہ کرتی، ہروقت بنی سنوری رہتی۔ جو بھابی کی تعریف کرتا تو اُسے وہی اچھا لگتا تھا۔ والدہ صاحبہ ایک کم گو خاتون تھیں وہ صبح سویرے اُٹھ کر نماز فجر کی ادائیگی کے بعد دودھ بلوتیں پھر مکھن کے پراٹھے پکاتیں جو سب ناشتے میں کھاتے۔ اس کے بعد اُن کا زیادہ وقت تلاوتِ کلام پاک اور جاء نماز پر گزرتا۔ وہ بھابی زہرا کے ساتھ کوئی روک ٹوک نہ کرتی تھیں جس کی وجہ سے گھر کا ماحول ٹھیک تھا۔ والد صاحب بھی اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔ اُن کا زیادہ وقت زمینوں کے معاملات کو دیکھنے میں گزرتا تھا۔ بھابی زہرا کے ساتھ اُن کا برتاؤ اچھا تھا وہ ہمیشہ بھابی کو بیٹی کہہ کر بلاتے تھے۔

ایف اے کا رزلٹ آنے کے بعد میں نے گریجویشن کے لیے دوبارہ شہر میں داخلہ لے لیا اور اپنی پڑھائی میں مشغول ہوگیا۔ مجھے ہر ماہ ایک معقول رقم اپنے اخراجات کے لیے مل جاتی۔ جب میں گریجویشن کا امتحان دے کر گاؤں آیا تو میں نے ایک تبدیلی محسوس کی۔ وہ یہ کہ زمینوں کا تمام حساب کتاب بھائی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور تقریباً ہر معاملے میں والد صاحب کو بے دخل کردیا تھا۔ والد صاحب کی صحت قابلِ رشک تھی وہ خالص خوراک کھاتے اور پھر خوب محنت مشقت کرتے، جس کی وجہ سے وہ ایک چاق وچوبند زندگی گزار رہے تھے۔ مگر جب سے انہیں بھائی نے زمینوں کے معاملات سے دور کیا تو وہ کچھ بیمار رہنے لگے۔

جب میں گاؤں آیا تو والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے بتایا کہ انہوں نے میرا رشتہ طے کردیا ہے، اب وہ جلد از جلد شادی کر کے حج کا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے ایم اے کر لینے دیں کیونکہ میرا شوق تھا کہ مقابلے کا امتحان دوں اور CSP افسر بنوں مگر والد صاحب کا کہنا تھا کہ بہت پڑھ لیا بس اب بھائی کے ساتھ مل کر زمینیں سنبھالو۔ دراصل والد صاحب کو بھائی اور بھابی کے جو تیور نظر آرہے تھے وہ اچھے نہ تھے کیونکہ بھائی زمینوں کا بلا شرکت غیرے مالک بننا چاہتا تھا۔ اُسے کسی کی مداخلت پسند نہ تھی وہ اپنی من مانی کرنے والا انسان تھا۔

اب ہوا یہ کہ والد صاحب اور والدہ صاحبہ دوسرے گاؤں میں ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تو وہاں انہیں میمونہ پسند آگئی اور انہوں نے اپنے کچھ رشتہ داروں کی وساطت سے میرے رشتہ کی بات چلادی۔

''کوئی دو ہفتے کے بعد میمونہ کے والدین بھائی بہنیں لڑکا دیکھنے یعنی مجھے دیکھنے ہمارے گاؤں آئے جب وہ مجھے پسند کر کے چلے گئے تو بھابی زہرا نے ایک ہنگامہ کھڑا کردیا کہ ہاں ہاں مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی اور چپکے چپکے سیف علی کا رشتہ بھی دیکھ لیا۔''

والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے بڑے پیار اور آرام سے زہرا بھابی کو سمجھایا کہ بیٹی ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ تمہارے بغیر ہم رشتہ طے کردیں۔ امی کہنے لگیں کہ زہرا بیٹی میں تو تمہیں پچھلے ایک سال سے کہہ رہی ہوں کہ سیف کے لیے کوئی لڑکی تلاش کرو، مگر تم نے ابھی تک اپنے دیور کے لیے کوئی لڑکی نہیں ڈھونڈی۔ وہ تو بس ہمیں شادی میں میمونہ اچھی لگی تھی۔''

جس پر بھابی زہرا نے جل کر کہا کہ مجھے لڑکی دکھائی نہیں اور خود ہی پسند کرلی اور آج وہ لڑکا بھی دیکھ گئے ہیں۔''

اسی بات پر گھر میں بہت شور شرابا، لڑائی جھگڑا ہوا۔ بالآخر بڑی منتوں کے بعد بڑی مشکل سے بھابی زہرا بادل نخواستہ میری شادی کے معاملات میں شامل ہوئی۔ قصہ مختصر میمونہ کے ساتھ میرا رشتہ طے ہوگیا۔ میں نے مزید پڑھنے کے لیے والد صاحب کی بہت منت سماجت کی مگر اُن کا حکم تھا کہ اب تمہاری شادی ہوگی اگر بہت پڑھنے کا شوق ہے تو شادی کے بعد پرائیویٹ پڑھ لینا۔

دو ماہ کے بعد میری شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔ بھائی عنایت علی کی شادی کے برعکس میری شادی بہت سادگی سے انجام پائی، گو بھابی زہرا اور اُس کے میکے والوں نے شادی میں شرکت ضرور کی مگر انتہائی بے دلی سے بس صرف رسمی سا شرکت کا فریضہ ادا کیا۔

میمونہ میری دلہن بن کر گھر آگئی۔ میمونہ کی ایف اے تعلیم تھی۔ وہ بہت سگھڑ، خوبصورت، سمجھدار اور پیار

کرنے والی بیوی ثابت ہوئی مگر بدقسمتی سے پہلے دن سے ہی میمونہ کی بھابی زہرا سے اچھی نہ بن سکی۔ وجہ یہ تھی کہ شادی سے پہلے ہی ایک تو بھابی زہرا کے دل میں گرہ بندھ گئی تھی، دوسرا یہ کہ میمونہ بھابی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ میمونہ میں بہت رکھ رکھاؤ تھا۔ ہنس مکھ اور اچھے اخلاق کے ساتھ ہر کسی کے ساتھ اُس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ تیسرا یہ کہ بھابی چونکہ بہت مغرور تھی تو وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ کوئی کام کاج نہ کرتی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بہت موٹی ہوگئی بلکہ گوشت کا پہاڑ بن گئی۔ بھابی زہرا کا مزاج حاکمانہ تھا، جس کی وجہ سے گاؤں کی کسی عورت کے ساتھ اُس کے اچھے اور دوستانہ مراسم نہ تھے جبکہ اس کے برعکس میمونہ کے اچھے اخلاق اور تمیزداری کے چرچے پورے گاؤں میں ہونے لگے اور یہ بات بھابی زہرا کو کسی بھی حال میں گوارا نہ تھی۔

گھر کی فضا بہت مکدر ہوگئی۔ آئے روز چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ والد صاحب کے کہنے اور میری لاکھ کوشش کے باوجود بھائی عنایت نے مجھے زمینوں کے معاملات میں شامل نہ کیا۔ بس میں بیکار میں زمینوں اور ڈیرے کے چکر لگا تا رہتا۔

اسی اثناء میں میرا گریجویشن کا رزلٹ بھی آ گیا تھا۔ آگے پڑھنے کی اجازت والد صاحب نے نہ دی تھی وہ ہر حال میں مجھے زمینوں کے معاملات اور دیکھ بھال میں شامل کرنا چاہتے تھے جبکہ بھائی ہر ممکن طریقے سے مجھے دور رکھتا۔

والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی حج کی درخواستیں منظور ہوچکی تھیں۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز مقدس روانہ ہوگئے۔ بھابی زہرا بہت ہوشیار اور مزاج کی تیز عورت تھی چونکہ خود پسند تھی تو اُسے صرف اپنی تعریف سننا اچھا لگتا جبکہ میمونہ کی تعریف انہیں سننا ہرگز گوارا نہ تھا۔ بھابی زہرا میں جھوٹ بولنے اور لگائی بجھائی کی عادت بھی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ دیورانی اور جیٹھانی کی آپس میں نہ بن سکی۔ شروع شروع میں میمونہ خاموشی سے بھابی کی کڑوی کسیلی بات سن لیتی مگر اب اُس نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دینا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے گھر میں حالت جنگ کی سی کیفیت رہتی۔ میمونہ اور بھابی زہرا میں دوریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ بھابی کا مکمل کنٹرول بھائی پر تھا اور وہ اپنی ہر جائز ناجائز خواہش منوالیتی۔ گھر کے انہی حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ والدین کی حج سے واپسی کے بعد زمینوں کا بٹوارا کر کے اپنے حصے کی زمینوں پر خود کاشت کاری کروں گا تاکہ آئے روز کے فسادات اور جنگ و جدل سے جان چھوٹے۔

اُدھر جب والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے حج کا فریضہ ادا کر لیا اُن کی واپسی ایک ہفتہ بعد تھی تو وہاں ایک حادثہ ہوگیا۔ جس کے نتیجے میں کچھ حجاج کرام شہید ہوگئے۔ جن میں میرے والدین بھی تھے۔ انہیں سعودی عرب میں ہی سپرد خاک کردیا گیا۔

والدین کی موت میرے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔ کچھ دن گزرے تو بھائی بھابی کی نظریں بدل گئیں۔ ایک دن میں نے بھائی سے بات کی کہ میں سارا سارا دن فارغ رہتا ہوں تو مجھے بھی اپنے ساتھ زمینوں کے معاملات میں شامل کرو۔'' تو بھائی نے کہا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ تم کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ میں نے کہا کہ اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔ بہرحال اگر آپ ایسا سمجھتے ہو تو پھر زمینوں کا بٹوارا کرو جو میرا حصہ بنتا ہے وہ مجھے دے دو۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔

میری اس بات سے بھائی اور بھابی آگ بگولہ ہوگئے۔

وہ دونوں کہنے لگے کہ زمینوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے کیونکہ بہت ساری رقم میری پڑھائی پر خرچ ہوچکی ہے۔ میں شروع سے عیش و آرام کر رہا ہوں۔ بھائی کا یہ کہنا تھا کہ ساری محنت مشقت وہ کرتا ہے۔ تو اسی بات پر بات بڑھ گئی اختلافات تو پہلے ہی تھے جب زمینوں کے بٹوارے کی میں نے دوبارہ بات کی تو بہت لڑائی جھگڑا ہوا۔ بھائی مرنے مارنے پر اُتر آیا اور اُس نے پستول نکال لیا۔ بڑی مشکل سے کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا۔

''اگلی صبح پھر یہی ڈرامہ ہوا۔ بھائی نے اور بھابی نے مجھے اور میمونہ کو خوب بُرا بھلا کہا، شرمناک گالیاں دیں اور ہمیں دھکے دے کر حویلی سے نکال دیا گیا۔ میں نے میمونہ کو ساتھ لیا اور اُس کے میکے آ گئے۔ میمونہ بہت

رو رہی تھی اُس کا کہنا تھا کہ وہ اب کبھی لوٹ کر اُس حویلی میں نہیں جائے گی۔

اگلے روز میں نے کچھ بندے ساتھ لیے اور حویلی سے میمونہ کے جہیز کا سامان ایک ٹرک پر لوڈ کیا تو بھائی عنایت اپنے کچھ غنڈوں اور بدمعاش دوستوں کے ساتھ اسلحہ لے کر آ گیا اور مجھے خبردار کیا کہ اب اگر دوبارہ گاؤں میں قدم رکھا تو تمہیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔"

میں ایک صلح جُو اور لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والا انسان ہوں تو خاموشی سے سامان لے کر میمونہ کے میکے آ گیا۔ میمونہ کے ماں باپ کا بہت بڑا مکان تھا۔ انہوں نے خوش دلی سے ہمیں رہنے کی اجازت دے دی۔ میمونہ اُمید سے تھی تو اُسے کسی بھی ٹینشن میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اُسے مکمل سکون کی ضرورت تھی۔ میں نے بھائی کے خلاف قانون چارہ جوئی کا فیصلہ کیا تو اس سلسلے میں، میں شہر وکیل سے ملنے آیا۔ وکیل نے مقدمہ لڑنے کی بھاری فیس مانگی جو کہ سر دست میرے پاس نہیں تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ دیوانی مقدمات کا فیصلہ سالہا سال نہیں ہوتا مقدمہ لڑتے کئی کئی سال گزر جاتے ہیں۔ ہر تاریخ پر وکیل اور اُس کا منشی کسی نہ کسی بہانے پیسے لیتے رہتے ہیں۔ ہر اہلکار کی مٹھی بھی گرم کرنا پڑتی ہے جبکہ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا ادھر میمونہ کی زچگی کا وقت بھی قریب تھا۔ میں انہی سوچوں اور پریشانی میں کچہریوں سے نکلا تو ایک کلاس فیلو دوست سے ملاقات ہو گئی۔ جب اُس نے مجھ سے کچہری آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اُسے اپنے مکمل حالات بتا دیے۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد اُس نے بتایا کہ محکمہ ریلوے میں کچھ آسامیوں کا اشتہار اخبار میں آیا ہوا ہے۔ تو اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ سر دست نوکری کے لیے اپلائی کر دو پھر باقی معاملات بعد میں دیکھ لینا۔ اُس کا مشورہ مجھے پسند آیا اور میں نے فوراً نوکری کے لیے درخواست دے دی۔ کیونکہ میں بھی چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ میں اپنے سسرال والوں پر نہ تو بوجھ بننا چاہتا تھا اور نہ ہی کوئی احسان لینا چاہتا تھا۔ اس طرح انسان کی کوئی عزت نہیں رہتی۔ لوگ الگ باتیں بناتے ہیں اور مقولہ بھی مشہور ہے کہ 'سسرال کے گھر داماد کتا'۔

چونکہ میرا تعلیمی کیریئر بہت اچھا تھا تو جلد ہی مجھے انٹرویو کی کال آ گئی اور اللہ کی مہربانی سے بغیر کسی سفارش کے میرٹ پر مجھے ایس ٹی ای کی نوکری مل گئی اور میں نے فوراً ڈیوٹی جوائن کر لی۔ میمونہ اپنے میکے میں آرام اور سکون سے رہ رہی تھی۔ میں ویک اینڈ پر گھر آتا اور پھر میمونہ نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا جس کا نام ہم نے بلاول رکھا۔

اب میں جلد از جلد میمونہ اور بلاول کو اپنے سسرال سے لے جانا چاہتا تھا۔ میری تھوڑی سی بھاگ دوڑ اور کوشش سے مجھے ریلوے کالونی میں ایک بہترین مکان الاٹ ہو گیا۔ میں نے اپنے کولیگز سے تھوڑا قرض لے کر مکان میں رنگ روغن کروایا۔ نئے پردے لگوائے اور صفائی کے بعد سامان کے ساتھ ہم شہر میں شفٹ ہو گئے۔ کالونی کا ماحول بہت اچھا تھا۔ سب مل جل کر بہن بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ جب ہم کالونی میں شفٹ ہوئے تو پہلا پورا ہفتہ ہماری ویلکم دعوتیں ہوتی رہیں۔ میمونہ نے بہت جلد اپنے آپ کو کالونی کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا۔ کیونکہ کالونی کا ماحول بہت اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ وقت اچھا گزرنے لگا۔ میں چونکہ ریلوے کا ملازم تھا تو مجھے فیملی کے ہمراہ ایئر کنڈیشنڈ سلیپر میں مفت سفر کی سہولت حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ میں میمونہ اور بلاول بہت سارے شہروں میں گھوم پھر چکے تھے۔ میری چونکہ محدود سی تنخواہ تھی جس سے گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔

بھائی کے خلاف مقدمہ کرنے اور اپنے حصے کی زمین لینے کی خواہش آہستہ آہستہ ماند پڑتی گئی۔ اصل میں میرا دل نہیں مانتا تھا کہ خود بھی عدالتوں کے چکر لگاؤں اور بھائی کو بھی لگواؤں۔ دوسرا میری طبیعت اور عادت اس قسم کی ہے کہ میں ہر قسم کے جھگڑوں، عداوت وغیرہ سے دور رہتا ہوں باقی اللہ کی ذات پر بھروسہ اور یقین تھا کہ میرا حق مجھے ضرور ملے گا بس میں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور خاموشی اختیار کیے رکھی۔ وقت کا کام ہے گزرنا اور وقت پر لگا کر اُڑتا رہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی سال کا عرصہ بیت گیا۔

☆......☆......☆

بلاول کے بعد اللہ پاک نے دو اور بیٹے اور دو بیٹیوں کی نعمت سے نوازا۔ پانچوں بچے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ میری ڈیوٹی بھی چل رہی تھی۔ زندگی سکون سے رواں دواں تھی۔ بھائی بھابی سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ انہیں ہمارے حالات کا علم نہ تھا اور ہمیں اُن کے حالات کا قطعی علم نہ تھا۔ میرے دل میں اکثر کسک اُٹھتی تھی کہ میرا ایک ہی سگا بھائی ہے اور وہ بھی مجھ سے دور ہے۔ بہت دل تڑپتا تھا۔ کئی بار اِرادہ کیا کہ گاؤں جاؤں مگر جب وہ وقت یاد آتا تو دل خون کے آنسو روتا تھا کہ بھائی بھابی نے کس طرح ذلیل اور بے عزت کر کے گالم گلوچ کے ساتھ گھر سے نکالا تھا۔ مجھ پر پستول بھی تان لیا تھا اور کہا تھا کہ خبردار اگر گاؤں کا دوبارہ رُخ کیا تو گولیوں سے بھون کے رکھ دوں گا۔ زمینوں اور حویلی سے بھی بے دخل کر دیا تھا۔ جب وہ حالات یاد آتے تو گاؤں جانے کا اِرادہ مؤخر کر دیتا۔

☆......☆......☆

ایک دن ٹرین میں ہمارے گاؤں کا ایک آدمی سفر کر رہا تھا۔ اُس سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں بھائی عنایت کے حالات کا علم ہوا تو معلوم ہوا کہ بھائی اور بھابی کچھ عرصہ سے بیمار ہیں۔ بھائی زیادہ بیمار ہے، تو یہ سُن کر مجھ سے رہا نہ گیا اور دو دن کے بعد چپکے سے گاؤں پہنچ گیا۔

حویلی میں ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ بھائی چیک اپ کے لیے لاہور گیا ہوا ہے جبکہ بھابی گھر میں ہی تھی۔ بھابی زہرا رحمی سے انداز سے ملیں۔ بھائی کی تین بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا تھا۔

میں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہاں سے آ گیا اور اگلے روز لاہور جا کر بھائی سے ملا۔ اُن کو دل کی تکلیف تھی تو ڈاکٹر نے تمام ضروری ٹیسٹ کروانے کے بعد انہیں دوائی کا نسخہ لکھ دیا تھا۔ میرے گاؤں جانے اور بھائی کو ملنے کے بعد بھی حالات جوں کے توں رہے۔ وہی سرد مہری کیونکہ بھائی بھابی کی طرف سے مجھے کوئی اچھا رسپانس نہ ملا تھا چنانچہ میں نے بھی چپ سادھ لی۔

☆......☆......☆

زندگی اپنی ڈگر پر چل رہی تھی۔ کوئی تین یا چار مہینے کے بعد ایک دن مجھے عدالت کی طرف سے ایک نوٹس ملا جس کے مطابق کسی کیس میں میری گواہی مطلوب تھی۔ مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی تو خیر میں مقررہ تاریخ کو عدالت میں پہنچا تو وہاں جا کر کیس کی نوعیت کا پتا چلا۔

کیس کچھ یوں تھا کہ ہماری تمام زمینیں والد صاحب کے نام تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد وراثت میں وہ بھائی اور میرے نام ہوئی تھیں۔ بھائی نے زمین کا ایک ٹکڑا اپنے نام کروا کر آگے کسی کو فروخت کر دیا تھا۔ خریدار پارٹی کے علم کے مطابق ساری زمینوں کا وارث بھائی عنایت تھا۔ انہوں نے وہ زمین خرید لی تھی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد جب اُس پارٹی نے وہ زمین کسی اور کو فروخت کی تو جب وہ اپنے نام لگوانے لگے تو اُن کو پتا چلا کہ زمین کا وارث صرف بھائی عنایت ہی نہیں میں بھی برابر کا حصے دار ہوں۔ بہر حال معاملہ کچھ پیچیدہ ہوا تو کیس عدالت میں چلا گیا۔ اب اصل صورتِ حال سامنے آنے پر بھائی کو وہ رقم بھی لوٹانی پڑتی اور جیل کی سزا بھی ہو جاتی۔ مجھے بھائی کی زیادتیاں یاد آئیں اب یہ میرے لیے سنہری موقع تھا کہ میں اپنا حق بھی وصول کر لیتا اور بھائی کو سزا بھی دلوا دیتا۔

جب مجھے گواہی کے لیے کٹہرے میں بلایا گیا تو سامنے بھائی مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ میرے خون نے جوش مارا اور میں نے بھائی عنایت کے حق میں گواہی بھی دی اور لکھ کر دیا کہ جو ٹکڑا زمین کا بھائی بیچ چکا ہے وہ بھائی کا تھا۔ میں اُس سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ مجھے نہ کوئی اعتراض تھا، نہ ہے اور نہ ہی ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کیس کلیئر ہو گیا اور بھائی سزا سے بھی بچ گیا۔ میں چپکے سے عدالت سے واپس آ گیا۔ یہ تمام باتیں میں نے میمونہ اور اپنے پانچوں بچوں سے پوشیدہ رکھیں۔

☆......☆......☆

چند دنوں کے بعد رمضان المبارک کا مقدس مہینہ آ گیا۔ ہم سب اپنی استطاعت کے مطابق روزے کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی عبادت کرنے لگے۔ بچوں کو زیادہ دلچسپی افطاری میں ہوتی۔ میمونہ بھی مزے مزے کی ڈشیں اور افطاری کے کئی لوازمات روزانہ بناتی۔ بیس روزے گزر گئے تو اب بچوں کا روزانہ شاپنگ کا پلان بنتا اور مجھے روزانہ یاد دلایا جاتا کہ پاپا جانی چاند رات کو شاپنگ کرنی ہے۔ عید

کی تو میں ہنس کر پیار سے کہتا ہاں بچو ضرور۔ پھر ستائیسواں روزہ آ گیا۔ مسجد میں نماز تراویح میں ختم قرآن کی محفل ہوئی ساری رات عبادت نوافل ادا کیے گئے۔

اگلے روز میں نے آفس جا کر سب سے پہلے اپنی تنخواہ وصول کی کیونکہ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ عید سے پہلے تمام ملازمین کو تنخواہ ادا کر دی جائے۔ تنخواہ وصول کرنے کے بعد میں ٹرین میں سوار ہو گیا اور اپنی ڈیوٹی میں مشغول ہو گیا۔

دوپہر ایک بجے ٹرین ایک اسٹیشن پر پہنچی۔ میری ڈیوٹی اسی اسٹیشن تک تھی۔ اب میں نے واپس ٹرین جو کہ ایک گھنٹے بعد آنی تھی اُس میں ڈیوٹی کرنی تھی اور وہ ٹرین ہمارے شہر تک آتی تھی۔ میں نے آفس میں جا کر جو ٹکٹ مسافروں کو جاری کیے تھے اُن کا حساب کتاب دیا اور رقم جمع کروا کر پلیٹ فارم پر بنی مسجد میں نماز ظہر ادا کی۔ نماز ادا کرنے کے بعد میں پلیٹ فارم پر چل کر آفس کی طرف جا رہا تھا کہ میری نظر ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچے پر پڑی جو کہ انتہائی پریشان حالت میں فرش پر بیٹھے تھے۔ عورت رو رہی تھی جبکہ مرد انتہائی کسمپرسی اور لاچاری کی حالت میں بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

میں نے رُک کر اُن کی پریشانی کا سبب جانا تو معلوم ہوا کہ دوران سفر اُن کے پیسے اور ٹکٹ گم ہو گئے ہیں۔ مرد جس کا نام اشرف تھا وہ ایک دفتر میں چپڑاسی تھا۔ عید کے تیسرے روز اُن کی بیٹی کی شادی تھی تو اُس نے کچھ قرض لیا۔ اپنی تنخواہ اور کچھ جمع پونجی جو کہ مجموعی طور پر چالیس ہزار روپے کی رقم تھی انہوں نے بیٹی کے جہیز کے لیے زیور کا آرڈر دیا ہوا تھا اور عروسی جوڑا بھی لینا تھا۔ وہ یہ چیزیں لینے آئے تھے مگر ٹرین کے سفر میں اُن کی رقم گم ہو گئی تھی۔ اب اُن کے پاس نہ تو ٹکٹ تھے اور نہ ہی پھوٹی کوڑی۔ اب وہ ریلوے اسٹیشن سے باہر بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ٹکٹ کلکٹر اُن کو بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے چند لمحے اُن تینوں کو دیکھا تو میرے دل نے گواہی دی کہ یہ سچ بول رہے ہیں اور مصیبت زدہ ہیں۔

میں نے اپنے پاس سے اُن کے ٹکٹ بنا کر اُن کی ٹکٹ کلکٹر سے گلو خلاصی کروائی اور پھر اُن کو ساتھ لے جا کر ریلوے پولیس چوکی میں ان کی گم شدہ رقم کی رپورٹ درج کروائی۔

''اشرف کی بیوی بار بار کہتی کہ اب کیا بنے گا اگر بیٹی کو زیور نہ ڈالا تو اُس کی بارات واپس چلی جائے گی۔ اب کیا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ زار و قطار روتی۔ میں اُس غم زدہ خاندان کو دیکھ رہا تھا تو مجھے رات ختم قرآن پاک کی محفل میں مولوی صاحب کی تقریر کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ رمضان کا مہینہ صبر، ہمدردی اور غمگساری کا مہینہ ہے۔ اس مہینے اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے ایک روپے کا بدلہ آخرت میں ستر ملے گا۔ میری کل تنخواہ بیالیس ہزار روپے تھی اور یہ بیالیس ہزار روپے میری جیب میں تھے۔ بچوں کا تنخواہ کا انتظار، چاندرات کی شاپنگ اور عیدی سب کچھ میرے سامنے تھا۔ دوسری طرف یہ لٹا پٹا غم زدہ مصیبت کا مارا خاندان میرے سامنے تھا۔ میرے دل و دماغ میں ایک کشمکش چل رہی تھی۔ تو میرے اندر سے آواز آئی'' ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا''

اُسی لمحے میں نے اُن کو تسلی اور دلاسا دیا اور اپنی جیب سے بیالیس ہزار روپے نکال کر اُن کو دیئے اور کہا کہ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ آپ یہ رقم رکھ لیں اور اپنی بیٹی کی خوشیاں لے جائیں۔''

وہ حیران پریشان میری طرف دیکھنے لگے۔ الغرض بڑی مشکل سے انہوں نے وہ پیسے لیے پھر اشرف نے مجھے اپنے دفتر اور گھر کا ایڈریس دیا اور بیٹی کی شادی میں شرکت کی دعوت دی اور رقم اس شرط پر وصول کی کہ بطورِ قرض لے رہا ہے۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی وہ مجھے ضرور لوٹائے گا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے بازار کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میری ٹرین بھی آ گئی اور میں اُس میں سوار ہو کر اپنے فرائض کی بجا آوری کرنے لگا۔

افطار سے ایک گھنٹہ پہلے ٹرین ہمارے شہر پہنچ گئی۔ میں نے ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں عصر کی نماز ادا کی، آفس کے معاملات نپٹائے اور گھر کی طرف چل پڑا۔ اب مجھے پتا تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی بچوں نے پہلا سوال یہی کرنا ہے کہ پاپا جانی تنخواہ مل گئی؟ تو بچوں کو کیا جواب دیتا۔

میرے قدم بوجھل ہونے لگے کہ عید کیسے گزرے گی۔ اگلا پورا مہینہ کس طرح گزرے گا۔ انہی سوچوں میں جب

گھر داخل ہوا تو آج خلافِ معمول گھر میں چہل پہل کچھ زیادہ نظر آئی۔ جب دوسرے کمرے میں جہاں ہم فرش پر دسترخوان بچھا کر سب مل کر بیٹھ کر افطاری کرتے ہیں تو کیا دیکھا بھائی عنایت علی، بھابی زہرا میری تینوں بھتیجیاں اور بھتیجا بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بھائی اُٹھ کر آگے بڑھا اور مجھے اپنے گلے سے لگا کر گھٹ کر بھینچ ڈال لی۔ بھابی زہرا بھی اُٹھ کر آئیں، مجھے سلام کیا پھر چاروں بچوں کے سر پر میں نے پیار سے ہاتھ پھیرا اور ہم بیٹھ گئے۔

بلاول کے چہرے پر بہت خوشی چھلک رہی تھی اور وہ کچھ بتانے کے لیے بیتاب تھا۔ میں ابھی تک بھائی بھابی کی آمد پر حیران تھا کہ بلاول سے نہ رہا گیا اور اُس نے بتایا کہ اُس کا میٹرک کا رزلٹ آج ہی آیا ہے اور اُس نے بورڈ میں پوزیشن لی ہے۔"

یہ سُن کر میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے اور میں نے بلاول کو گلے سے لگا کر پیار کیا اور مبارکباد دی۔ میرا دل آج خوشی سے سرشار ہو رہا تھا کہ بچھڑا بھائی بھی مل گیا اور بیٹے نے بورڈ میں پوزیشن لی ہے۔

تھوڑی دیر بعد روزہ افطار کیا پھر سب نے نماز مغرب ادا کی۔ کھانے کے بعد بھائی عنایت نے جیب سے دو لاکھ روپے نکال کر مجھے دیے اور کہا سیف یہ وہ رقم ہے جو میں نے زمین فروخت کی تھی۔ تو یہ دو لاکھ روپے تمہارا حصہ ہے۔ باقی تم نے میرے حق میں گواہی دے کر مجھے خرید لیا ہے۔"

پھر بھائی عنایت مجھے گلے لگا کر زار و قطار رونے لگا۔ بھابی زہرا نے میمونہ کو گلے لگا کر اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی۔ ہم نے کھلے دل سے انہیں معاف کر دیا۔ پھر بھائی عنایت نے بلاول کو دس ہزار روپے بطور انعام پوزیشن لینے پر دیے۔ ساری رات خوب باتیں ہوئیں پھر سحری کھا کر نماز فجر کی ادائیگی کے بعد ہم سب سو گئے۔

دن گیارہ بجے سب بیدار ہوئے بھائی عنایت اور بھابی زہرا نے واپسی کی اجازت مانگی اور ہمیں حکم دیا کہ کل 29 واں روزہ ہے۔ ہماری افطاری حویلی میں ہو گی اور عید بھی حویلی میں ہی ہم سب منائیں گے۔"

اب اتنے پیار، خلوص، چاہت سے ہمیں حکم دیا گیا تھا تو ہماری کیا مجال تھی کہ انکار کرتے۔ بھائی اپنے بیوی بچوں کو لے کر گاؤں چلا گیا۔ تو اب میمونہ نے فوراً کہا کہ اب ذرا تنخواہ بھی نکالیں نا، کل سے آپ نے جیب کو ہوا نہیں لگوائی ہے۔ تو اس پر میں نے اپنے بچوں اور میمونہ کو ساری بات بتا دی جسے سن کر پانچوں بچے مجھ سے لپٹ گئے اور یک زبان بولے۔

"پاپا جانی! آپ بہت عظیم انسان ہیں اور سب نے مجھے سلیوٹ کیا۔ میمونہ بھی بہت خوش ہوئی کہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ بدلے میں اللہ نے ہمیں بچھڑا بھائی ملا دیا۔ بلاول نے پوزیشن حاصل کی ہے۔"

پھر ہم سب نے نماز ظہر کے بعد شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ پھر افطاری کے بعد ہم سب نے عید کی ڈھیروں شاپنگ کی۔ بھائی عنایت، بھابی زہرا اور بھتیجے بھتیجیوں کے لیے بھی شاپنگ کی اور ہاں اشرف کی بیٹی جس کی شادی عید کے تیسرے روز تھی اُس کے لیے بھی شادی کا تحفہ اور کپڑے وغیرہ خریدے۔

☆......☆......☆

اگلے روز 29 واں روزہ تھا۔ ہم سب گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج ہم اُس حویلی میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے ہمیں بے عزت اور ذلیل کر کے نکالا گیا تھا۔

حویلی کو خوبصورت جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ بھائی عنایت علی، بھابی زہرا اور بچوں نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا۔ پھر ہم گاؤں میں سب کو ملے۔ آج اتنے سالوں بعد ہم آئے تھے۔ افطاری کا خوب اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک جشن کا سا سماں تھا۔ نماز عشاء سے پہلے رویت ہلال کمیٹی نے اعلان کر دیا کہ چاند نظر آ گیا ہے، کل عید الفطر ہو گی۔

اگلے روز عید تھی۔ نمازِ عید کے بعد حویلی میں خوب چہل پہل ہونے لگی۔ گاؤں کے لوگ ہمیں جوق در جوق ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ ہر طرف پیار اور خلوص تھا۔ بچوں کی خوشی دیدنی تھی۔ عید کا اصل اور حقیقی لطف آج ملا تھا۔

بھائی عنایت بار بار کہتا کہ آج حویلی کی خوشیاں اور رونقیں لوٹ آئی ہیں۔ ہر طرف سے عید مبارک، عید مبارک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہماری یہ عید ایک یادگار عید تھی آج سب بچھڑے مل گئے تھے۔

☆☆......☆☆

تین مرد

تین کہانیاں

سچی کہانیاں کا وہ سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

# کس طرح لوٹاؤں یقیں



حنا بشریٰ

مرد ذات پر سے اعتبار کھوتی، ایک اندوہناک کتھا

''سلام بی بی جی!''

آواز پر میں نے نظریں اٹھائی تھیں گویا دوبارہ ہٹانا بھول گیا تھا۔

''تم؟'' رانیہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں چاندنی ہوں۔ خالہ رشیدہ نے بھیجا ہے۔'' وہ اپنی مدھر آواز میں بولی۔ میرے دیکھنے پر وہ بھی متوجہ ہوئی تھی۔

''سلام صاحب جی!'' اب وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ میں اس کے یوں دیکھنے پر گڑبڑا سا گیا تھا اور سر ہلا کر دوبارہ اخبار کی جانب دیکھنے لگا تھا۔

مگر دل چاہ رہا تھا اس دلربا کو پھر سے دیکھوں مگر رانیہ کے سامنے بے احتیاطی ناممکن تھی۔

''اچھا تم چاندنی ہو؟'' رانیہ اس سے مخاطب ہوئی۔ ''گھر کا کام تو کر لو گی نا؟'' رانیہ بولی۔

''جی بی بی جی! سب کام کر لیتی ہوں کھانا بھی بنا دوں گی۔'' چاندنی مدھم سا ہنستے ہوئے بولی۔ ہنستے ہوئے اس کے گال پر پڑنے والے ڈمپل مجھے متاثر کر گئے تھے۔ اتنا بے نیاز حسن تھا اس کا، وہ جانتی نہ تھی کہ وہ کتنی پرکشش ہے گو کہ رانیہ بھی بے حد خوبصورت تھی مگر

چاندنی، واقعی چاندنی تھی۔

''اچھا تم ایسا کرو آج سے کام شروع کر دو!'' رانیہ نے اسے کہا۔

''جی بی بی جی! جیسا آپ کہیں۔'' چاندنی کہہ کر چلی گئی۔

''احمر! ماسی رشیدہ نے اسے بھیجا ہے۔ پہلے والی ملازمہ نجانے کہاں غائب ہو گئی کہ اس کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔'' رانیہ میری مسلسل خاموشی پر خود ہی بولی۔ اسے عادت تھی ہر چھوٹی چھوٹی بات مجھے بتانے کی۔

''اچھا!'' میں غائب دماغی سے بولا۔ ذہن تو صرف چاندنی چاندنی کر رہا تھا اور دل اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیتاب تھا۔

میرا نام احمر ہے۔ رانیہ سے میں نے محبت کی اور پھر شادی کر لی۔ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں آیا تھا۔ میں ہمیشہ سے شوخ طبیعت کا ہوں۔ وہ ایک الگ بات ہے کہ رانیہ سے میں اپنا یہ پہلو چھپا لیتا ہوں۔

رانیہ مجھے بہت سیدھا اور سلجھا ہوا سمجھتی ہے اور وہ میں بہت حد تک ہوں بھی مگر جہاں تک بات حسن کی آ جائے وہاں میرا کیا قصور ہے؟

باہر میری بہت سی دوستیاں ہیں۔ مگر رانیہ کو بھنک

تک نہیں پڑنے دیتا۔ میں ان مردوں میں سے ہوں جو سب سے اچھا دکھنا چاہتے ہیں گھر میں بھی ان رہنا اور باہر بھی۔ اسی لیے میں تھوڑا بہت ہیر پھیر کر لیتا ہوں۔ آخر کو مرد ہوں اتنا تو حق بنتا ہے میرا۔

☆......☆......☆

''ناشتا تیار ہے!'' چاندنی نے رانیہ کو اطلاع دی



تھی۔

''اچھا تم چلو ہم آتے ہیں!'' رانیہ اٹھتے ہوئے بولی'' آپ بھی فریش ہو کر آجائیں!'' رانیہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

آج چھٹی کا دن تھا میں ابھی تک بستر پر لیٹا ہوا تھا مگر چاندنی کی آواز سن کر میری نیند ہوا ہو گئی تھی۔ ناشتے کی میز پر حمزہ اور ثانیہ بھی تھے۔

''گڈ مارننگ پاپا!'' مجھے دیکھتے ہی دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

''مارننگ بیٹا!'' میں انہیں دیکھتے مسکراتے ہوئے بولا۔ رانیہ خاموشی سے جوس پی رہی تھی۔

رانیہ نے چاندنی سے میرے لیے پراٹھے بنوائے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میں ہمیشہ سے یہی ناشتا کرتا ہوں۔ پراٹھے بہت خستہ تھے میں بڑی رغبت سے کھا رہا تھا وہ ایک الگ بات ہے کہ رغبت اس وجہ سے زیادہ تھی کہ یہ چاندنی نے بنائے تھے۔

رانیہ کی غیر موجودگی میں ضرور تعریف کرتا مگر اب!

آج میں سارا دن گھر پر ہی تھا۔ عمران دوست کی بار بار کال آرہی تھی کہ میرے گھر آؤ مگر آج میں نے تمام پروگرام کینسل کر دیے تھے۔ کیوں کہ آج کا پروگرام صرف چاندنی پر مبنی تھا۔ وہ پری پیکر کیسے چلتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ کیسی لگتی ہے وغیرہ۔

میں نہا کر آیا تو ٹی لاؤنج سے گزر رہا۔

''پاپا آئیں نا دیکھیے کتنی اچھی مووی ہے! ثانیہ مجھے دیکھتے ہوئے چلائی۔ قریب آنے پر اندازہ ہوا کہ محترمہ چاندنی صاحبہ بھی موجود ہیں۔ میں جو انکار کرنا والا تھا اسے دیکھتے ہی ارادہ بدل لی اور بچوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ Tom and Jerry کی اچھل کود جاری تھی۔ چاندنی کارٹون کی طرف متوجہ تھی۔ میرے آنے پر اس نے سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر میرا دھیان اس کی طرف تھا۔

لمبے بالوں کی چوٹی بنائے وہ سادہ سے حلیے میں بھی زبردست لگ رہی تھی۔ وہ قالین پر بیٹھی تھی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کارٹون پسند ہیں۔ اس نے ایک بار بھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ایک دم غصہ آیا تھا۔

''چاندنی ذرا پانی تو پلا دو!'' میں نے پیاس نہ ہونے کے باوجود پانی مانگا تھا۔

''اچھا صاحب جی!'' وہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے جان بوجھ کر پانی مانگا تھا یعنی اُس سے سزا دی تھی کہ وہ مجھے اگنور کرے گی، وہ بھی احمر علی کو۔

اب اتنی سزا ملنے چاہیے تھی اسے۔ یعنی میں کافی دیر سے اسے احمقوں کی طرح دیکھ رہا ہوں اور اسے مجھ سے زیادہ Tom and Jerry بھا رہے تھے۔ Very insulting۔

مردوں کی ایک عادت ہوتی ہے۔ حسن پرست! حسن کے اچھا نہیں لگتا مگر بے نیاز حسن تو گویا گھائل کر دیتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہو رہا تھا۔ وہ جتنا مجھے نظر انداز کر رہی تھی میری بے تابی بڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے چالاک لومڑی لگتی تھی، جو میرے سامنے انجان بننے کی اداکاری کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''آج چاندنی نہیں آئی۔'' صبح صبح چاندنی کو نا پا کر میں نے پوچھا۔

''ہاں وہ اس کے بیٹے کی طبیعت خراب ہے۔'' رانیہ نے میرے سامنے ناشتا رکھا۔

''سب بہانے ہوتے ہیں ان ہڈحراموں کے!'' میں نے اس کے نہ آنے کا غصہ نکالا۔

''ارے نہیں چاندنی ایسی نہیں ہے۔ واقعی اس کے بیٹے کی طبیعت خراب ہے۔'' رانیہ اس کی حمایت میں بولی۔

میں بے دلی سے ناشتا کرنے لگا تھا۔

''اصل میں احمر وہ بے چاری بہت دکھی ہے۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ کوئی بہن بھائی بھی نہیں ہے۔ شوہر پرلے درجے کا ہڈحرام اور کام چور ہے۔ سارا دن گھر پڑا رہتا ہے۔ بے چاری کما کر نہ لائے تو بھوکی مر جائے۔'' رانیہ دکھی لہجے میں بولی۔

مجھے اس کہانی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ چاندنی نے چھٹی کر کے گویا میرے غضب کو آواز دی تھی۔ میں ناشتا کر کے خاموشی سے آفس آگیا تھا۔

آفس آکر بھی میرا موڈ خراب رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو گھر فون کرڈالا۔

فون چاندنی نے اٹھایا تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''تم! رانیہ کہاں ہیں؟' میں پوچھنا تو یہ چاہ رہا تھا کہ چھٹی کیوں کی تھی؟ مگر یہ پوچھ بیٹھا تھا۔

''ابھی بلاتی ہوں۔'' چاندنی اپنی مدھر آواز میں بولی۔ ''نہیں نہیں رہنے دو۔'' میرے دل کو قرار آ گیا تھا اس لیے فون رکھ دیا۔ تو محترمہ پہنچ چکی ہیں۔ بس میرا موڈ خراب کرنا تھا۔ اب میرا بگڑا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا۔ دل ہی دل میں 'او میری محبوبہ' کا گانا گانے میں مصروف ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

''تمہارا بیٹا کیسا ہے؟'' میں کچن میں پانی پینے کے بہانے آیا تھا۔

مقصد تو صرف چاندنی کا دیدار تھا۔ لمبے گھنے بالوں کا جوڑا بنائے وہ ایک نئے انداز میں میرے سامنے تھی۔

''اب ٹھیک ہے صاحب جی!'' روٹیاں ڈالتے ہوئے وہ مصروف انداز میں بولی تھی۔

''یہ کچھ روپے رکھ لو کام آئیں گے!'' میں نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں صاحب جی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگ پہلے ہی میرا خیال رکھتے ہیں۔'' چاندنی کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

ویسے آپس کی بات ہے میں اس کے لہجے میں ممنونیت کے بجائے محبت دیکھنا چاہتا تھا۔ نجانے مرد کے ذہن میں کیا سودا سما جاتا ہے کہ خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے بھی ہر حسین چہرے پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے ہی سہی، کسی کی حسین آنکھیں، اپنے چہرے پر بھا جاتی ہیں۔ مگر یہاں چاندنی کی بے نیازی میری جان جلا رہی تھی۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے پھر میں نے اس کے لاکھ نانا کرنے کے باوجود اسے روپے دیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے حد شکر گزاری تھی۔

میں ابھی آفس سے گھر آیا تھا۔ کھانا کھا کر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا۔

''احمر ایک بات کہوں!'' رانیہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بولو!'' میں نے چینل بدلتے ہوئے کہا۔

''آج کل آپ آفس سے سیدھا گھر آ جاتے ہیں۔ بڑی اچھی تبدیلی ہے۔'' رانیہ کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے میں گڑبڑا سا گیا تھا۔

''ہاں بس میں نے سوچا تم لوگوں کے ساتھ ٹائم Spend کیا کروں۔ مصروفیات میں اکثر مرد گھر کو نظر انداز کر دیتے ہیں!'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بودا سا بہانا تراشا۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے۔ کیسا چالاک انسان ہے۔ مگر آپ بھی تو میری مجبوری سمجھیں، میں یہ بھی تو نہیں بتا سکتا کہ جلدی آنے کی وجہ چاندنی ہے۔

ناشتا کرتے ہوئے میری نگاہوں کا مرکز چاندنی تھی۔ جو بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ اتنا خوبصورت اور اسمارٹ انسان سامنے ہے اور اسے کاموں کی پڑی ہے۔

''چاندنی ذرا گرم چائے لا دو۔ ٹھنڈی ہوگئی ہے۔'' میں نے اس کی بے نیازی کی جھیل میں کنکر پھینکا تھا۔

''اچھا صاحب جی!'' چاندنی کہہ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ رانیہ کی دوست کا فون آیا تھا۔ تو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

''لیں صاحب جی!'' چاندنی نے چائے میرے سامنے رکھی۔

''سنو!'' میں نے اسے پھر سے پکارا۔

''جی صاحب جی!'' چاندنی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''تمہارا بیٹا کیسا ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''جی اب تو بالکل ٹھیک ہے!'' چاندنی کے لہجے میں ممتا کا رنگ نمایاں تھا۔

''اور تمہارا شوہر؟'' میرے لہجے میں نامعلوم سی جلن تھی۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ صاحب جی! بس نکما کام چور

ہے۔'' چاندنی کے لہجے میں بیزاریت سی گھل گئی تھی۔
مجھے نجانے کیوں ایک کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔ چاندنی جا چکی تھی اور میں ان چند لمحوں میں بے حد خوش ہو رہا تھا۔
ضرور چاندنی کے دل میں بھی میرے لیے جگہ بن رہی ہے۔ میرا دل خوش فہم ہوتا چلا گیا۔ خوش فہمی کا شکار صرف عورتیں ہی نہیں، مرد بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عورتیں، اپنی خوش فہمی اور غلط فہمی کو چھپاتی نہیں ہیں، مگر مرد اپنے احساسات کو چھپانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

☆......☆......☆

''بس بی بی جی میری قسمت ہی خراب ہے۔'' چاندنی روتے ہوئے بولی۔
''کس قدر جنگلی انسان ہے تمہارا شوہر۔'' رانیہ درد مندی سے بولی۔ چاندنی کے چہرے پر زخم کا نشان تھا۔ ہاتھ اور بازو پر بھی زخم آئے تھے۔
''ارے یہ کیا ہوا؟'' میں جو کمرے کی جانب آ رہا تھا اسے دیکھ کر رُک گیا تھا۔
''احمر دیکھیں نا چاندنی کا شوہر کس قدر ظالم ہے۔ دیکھیے کتنی بے دردی سے مارا ہے اس بیچاری کو۔'' رانیہ مجھے دیکھتے ہی بولی تھی۔
''اور تم دونوں ابھی تک باتیں کر رہی ہو۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں۔ دیکھو کتنا گہرا زخم ہے۔'' میں کچھ غصے سے بولا تھا۔
''ہاں مجھے بھی خیال نہیں آیا۔'' رانیہ کے لہجے میں شرمندگی کا عنصر نمایاں تھا۔
''چلو ابھی ڈاکٹر کے پاس۔'' میں چاندنی سے بولا۔
''نہیں صاحب جی! ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔
میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ چاندنی نے گھبراتے ہوئے کہا۔
''کیوں ضرورت نہیں ہے، کیا تم انسان نہیں ہو؟' میں مزید غصے سے بولا۔
''چلی جاؤ چاندنی احمر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' رانیہ بھی میری حمایت میں بولی تھی۔ چاندنی خاموش ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس سے واپسی پر میں نے راستے سے اس کے لیے دوائیاں بھی لی تھیں۔
''اب تم آرام کرو گی اور اپنے گھر مت جاؤ۔'' میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اسے کہا۔
''نہیں صاحب جی! میرا بیٹا میرے بغیر بالکل نہیں رہے گا۔'' چاندنی جلدی جلدی بولی تھی۔
میں جواباً خاموش رہا تھا۔
گھر آ کر بھی چاندنی بہت خاموش رہی تھی۔ رانیہ کو دیکھتے ہی بولی تھی۔
''بی بی جی! آپ دونوں بہت اچھے ہیں۔ اللہ آپ دونوں کو خوش رکھے۔'' چاندنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ میرے سامنے تو بالکل خاموش رہی تھی حالانکہ موقع بھی تھا اور دستور بھی تھا کہ وہ مجھے کہہ سکتی تھی کہ صاحب جی! آپ بہت اچھے ہیں، اور مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' مگر نہیں سارا موقع ضائع کر دیا تھا بے وقوف نے۔ میں نے غصے میں تکیہ پٹخا تھا۔

☆......☆......☆

''پاپا کل میری برتھ ڈے ہے!'' ثانیہ نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی میری جان پاپا کو بالکل یاد ہے۔'' میں خوش دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔
پاپا میں اپنے تمام دوستوں کو بلاؤں گی۔'' ثانیہ کی آواز میں جوش تھا۔ اسی دوران چاندنی نے ہمارے سامنے جوس رکھا تھا۔ چاندنی کے سامنے آتے ہی میری توجہ اس کی طرف مرکوز ہو جاتی تھی۔ ثانیہ کو وہ مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی دونوں بچیوں سے بہت دوستی ہو گئی تھی اگر نہیں پروا تھی تو میری نہیں تھی۔

☆......☆......☆

سالگرہ بہت بارونق رہی۔ رانیہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ مگر میری نگاہیں چاندنی کو تلاش کر رہی تھیں۔ کافی دیر تک نظر نہ آئی تو میں اسے ڈھونڈتا ہوا کچن میں جا پہنچا تھا۔ بے بی پنک کلر کے لباس میں ملبوس وہ برتن دھو رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تھا۔

''رانیہ!'' میری آواز پر وہ پلٹی تھی بلکہ ڈر گئی تھی۔
''جی صاحب جی کوئی کام تھا؟'' اس کی آواز میں ابھی تک گھبراہٹ تھی۔
''اوہ تم ہو۔ سوری میں سمجھا تھا کہ رانیہ ہے۔'' میں شرمندگی سے بولا۔
میری وضاحت پر وہ مطمئن ہوگئی تھی۔
اصل میں اس نے رانیہ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ چاندنی ہے مگر اس کے قریب رہنے کا کوئی بہانا بھی تو چاہیے تھا۔
بے بی پنک کلر ہمیشہ سے میرا فیورٹ رہا ہے۔ رانیہ کے پاس بے شمار پنک کلر کے سوٹ تھے۔ مگر چاندنی تو بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ کوئی اتنا بھی خوبصورت لگ سکتا ہے۔ لمبے گھنے بال کمر پر آبشار کی طرح بکھرے تھے۔ سادہ سے حلیے میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ رانیہ کے بال ہرگز لمبے نہیں مگر مجھے تو موقع چاہیے تھا اور وہ مل گیا۔
برتھ ڈے کے بعد مہمانوں کے جانے کا سلسلہ شروع ہوا تو رات کافی گزر گئی تھی۔
''بی بی جی!'' چاندنی اپنے آنچل سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔
''ہاں! چاندنی کیا بات ہے؟'' رانیہ کیو ٹکس صاف کر رہی تھی۔
''بی بی جی! رات بہت ہوگئی ہے۔ اب تو سواری بھی مشکل سے ملے گی۔ چاندنی پریشانی کا شکار تھی۔
''ہاں رات تو بہت ہوگئی ہے۔'' رانیہ نے پُرسوچ انداز میں بولی تھی۔ میں اس سارے معاملے سے لاتعلق رہا تھا یا بن رہا تھا۔
''احمر پلیز چاندنی کو گھر چھوڑ دیں۔ پریشان ہے بے چاری؟'' رانیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تو یہ رات یہاں رک جائے۔ کیا مسئلہ ہے!'' میں بے نیازی سے بولا۔
''نا صاحب جی! میرا میاں مار مار کر میری ہڈی پسلی توڑ دے گا۔ بڑا ظالم ہے وہ!'' چاندنی نے گھبراتے ہوئے کہا۔
''جائیں احمر! مزید باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے اور ہاں چاندنی جاتے ہوئے کھانا اور کچھ فروٹ بھی گھر لیتی جاؤ۔'' رانیہ نے فراخدلی سے بولی تھی۔
''اچھا جی بی جی! اللہ پاک آپ کو بہت دے۔ خوش رکھے۔'' چاندنی اب دعائیں دے رہی تھی۔
گاڑی میں ہم دونوں تھے۔ چاندنی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی میرے کہنے کے باوجود وہ آگے بیٹھنے پر نامانی تھی۔
''نہیں صاحب جی ہم نوکر لوگ ہیں اور آپ مالک ہو ہماری کیا اوقات کہ ہم آپ کے برابر میں بیٹھیں!'' چاندنی خاصی عاجزی سے بولی تھی۔
''چاندنی تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہو؟'' میں نے وقت گزاری کے لیے یوں ہی بات چھیڑ دی۔
''بس جی بھلا غریب کی خوشی کیا ہوتی ہے۔ اسے تو سہارا چاہیے ہوتا ہے۔ ورنہ اکیلی عورت کو درندے چھوڑتے نہیں ہیں۔'' چاندنی کا اپنا فلسفہ تھا۔ مجھے لگا اس نے مجھے بھی درندہ کہا ہے۔ وہ ایک الگ بات ہے کہ اس نے مجھے کچھ نہیں کہا یہ میرے اپنے دل کا چور تھا جو یہ سمجھا تھا۔
''چاندنی تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' میں نے مڑ کر اس کے حسین چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔
''مجھ غریب کو بھلا محبت سے کیا مطلب۔ ہمیں تو پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ یہ محبت کا روگ کون پالے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد شوہر کا گھر ہی میرا سب کچھ ہے۔ کوئی بہن بھائی تو ہے نہیں۔ پڑھنے کا شوق تھا نویں کے بعد شادی ہوگئی تھی۔ اب بس زندگی مزدوری میں گزر رہی ہے۔'' چاندنی کھوسی گئی تھی۔
اُف اتنے خوبصورت سوال کا اتنا طویل جواب بس موڈ خراب کر دیا تھا اس چاندنی صاحبہ نے میرا۔
میں سوچ رہا تھا کہ میرے اس قدر خوبصورت سوال پر وہ شرما جائے گی اور میں اس کی شرم وحیا سے ہی جان جاؤں گا مگر یہاں تو اور ہی فلسفہ ہے ڈفر!
نجانے کن راستوں سے ہوتے ہوئے آخر چاندنی کا گھر آ گیا تھا۔
''صاحب جی! آپ کا بہت شکریہ۔'' چاندنی

ممنونیت سے بولی تھی۔
دروازہ کیا کھلا گویا گالیوں اور کوسنوں کا طوفان آ گیا تھا۔
''کہاں مرگئی تھی جو اس وقت آ رہی ہے تو؟'' آنے والے نے آتے ہی اسے بالوں سے پکڑ لیا تھا۔
میں شاید اسے اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا اور اس نے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔
''نذیر کیا کر رہا ہے؟ اندر چل سب بتاتی ہوں۔'' چاندنی اس اچانک افتاد پر گھبرا گئی تھی۔
''کیا بتائے گی کمینی، حرافہ، عیش کرتی پھر رہی ہے۔ گھر کا تو کوئی خیال ہی نہیں ہے تجھے۔ چل اندر مر۔'' نذیر کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔
مجھے دیکھ کر اُسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا کہ نذیر کی عمر تقریباً 50 سال تھی اور چاندنی صرف 19 سال کی تھی۔ یہ کیا جوڑ تھا؟ مجھے چاندنی پر رحم آیا تھا۔
اُس دن کے بعد سے چاندنی پر میرے التفات زیادہ ہونے لگے۔ ایک دن میں اُس کے لیے ایک بہت مہنگا سوٹ لے آیا۔ اُس اللہ کی بندی نے رانیہ کو بتایا کہ صاحب جی نے دیا ہے۔ رانیہ میرے سر ہوگئی۔

☆......☆......☆

''احمر میں پوچھ سکتی ہوں کہ چاندنی کے لیے اس کی کیا ضرورت تھی؟'' رانیہ کی آنکھوں میں شک اور لہجے میں ناراضگی تھی؟ رانیہ کی آنکھوں میں شک اور لہجے میں ناراضگی تھی۔
''...... کیوں کیا ہوگیا ہے؟'' میں جانتے ہوئے بھی اس کی کیفیت کا مزہ لے رہا تھا۔ رانیہ نے رُخ موڑ لیا شاید وہ رو رہی تھی۔
''اوہ کم آن رانیہ! ڈونٹ بی سلی۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ اتنی سی بات پر یوں ناراضگی؟'' میں نے اس کا رُخ اپنی طرف کیا تھا۔
''احمر مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔'' رانیہ نے ہنوز ناراض تھی۔
''رانیہ! میرا ایک دوست ہے، عرفان، اس نے زکوٰۃ کی کچھ رقم دی تھی کہ کسی غریب کو کپڑے لے دوں سو میں نے چاندنی کے حالات دیکھتے ہوئے اس کے لیے سوٹ لے لیا۔ باقی مزید کسی کو دے دوں گا۔ اتنی سی بات تھی اور تم نے......'' میں ناراضگی سے اسے دیکھا تھا۔
''تو آپ پہلے بتا دیتے۔ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' رانیہ نے مطمئن ہو کر بولی۔
''میں اصل میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں مجھ پر کتنا اعتبار ہے۔'' میں نے اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔
''یقین تو ہے مگر ڈر تو لگتا ہے ناں۔'' رانیہ نے مطمئن ہو کر میرے شانے پر سر رکھ دیا تھا۔
''دیکھا میں نے کیسے سوچ سمجھے منصوبے کے تحت رانیہ کو مطمئن کر دیا تھا۔ سچ تھوڑی بتا سکتا تھا۔ عورتیں بھی بہت شکی ہوتی ہیں بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔ اب بھلا میری اتنی معصوم سی خواہش میں کیا قباحت ہے کہ میں ایک دوسری عورت کو اپنے پسندیدہ لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ انصاف کریں کہ مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں مرضی سے کچھ کر سکوں ذرا سوچیے......

☆......☆......☆

''احمر عید پر امریکہ سے امی آ رہی ہیں اور ساتھ میں حارث اور ندا بھی ہیں۔'' رانیہ نے ٹی وی دیکھتے ہوئے مجھے پکارا تھا۔
''گڈ نیوز! یہ تو اچھی بات ہے۔ خالہ جان ہمارے ساتھ عید منائیں گی۔'' میں خوشی سے بولا۔ ''مجھے ٹائم بتا دینا میں انہیں ایئرپورٹ سے لے لوں گا۔'' میں نے کہہ کر ٹی وی آف کر دیا۔
''جی اچھا!'' رانیہ بھی بے حد خوش تھی۔ دیکھا آپ نے کتنا ذمہ دار شوہر ہوں۔ ہر ذمہ داری بخوبی ادا کر رہا ہوں۔ تھوڑی بہت بددیانتی اگر کر لیتا ہوں تو کوئی برائی تو نہیں ہے۔

☆......☆......☆

عید پر چاندنی نے میرا لایا ہوا سوٹ ہی پہنا تھا۔ سوٹ اس نے پہنا تھا گویا سوٹ کی قیمت وصول ہوگئی تھی۔ میری نگاہیں اسی کے تعاقب میں رہی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل لگائے چاندنی حسین لگ رہی تھی۔ بس رانیہ کی وجہ سے خود کو سنبھال رکھا تھا۔
رانیہ بھی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ مگر وہ کہاوت تو آپ نے سنی ہوگی کہ بیوی دوسرے کی اور بچے

اپنے اچھے لگتے ہیں۔ بس میرا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ جب جب چاندنی کی نگاہیں میری طرف اٹھتی تھیں ان نگاہوں میں ممنونیت اور احسان مندی کے جذبات ہوتے تھے۔ میرے خیال میں وہ آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ میری طرف راغب ہو رہی تھی۔ بھلا اس بوڑھے نذیر اور میرا کیا مقابلہ۔ چاندنی کا رجحان میری طرف ہی ہونا تھا۔

''رانیہ یہ لڑکی کون ہے؟'' رانیہ کی امی نے حیرت سے چاندنی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

''امی چاندنی ہے ہماری ملازمہ!'' رانیہ نے وضاحت کی۔

''اچھا تو ماسی ہے!'' خالہ جان بولیں۔

''جی امی!'' رانیہ نے جواب دیا۔

''مگر دھیان رکھنا، ماسی کو ملکہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔'' خالہ جان رازداری سے بولیں۔ میں اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ اُف یہ بڑی بوڑھیوں کے اندازے۔

''نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چاندنی اچھی لڑکی ہے۔ پھر شادی شدہ ہے ایک بیٹا ہے۔'' رانیہ چاندنی کی حمایت میں بولی۔

میں چاندنی کی نہیں احمر کی بات کر رہی ہوں۔ لڑکی بے شک اچھی ہے۔ مگر مرد کا کیا بھروسہ؟ خیال رکھا کرو!'' خالہ جان نے اب میری ذات پر حملہ کیا تھا۔

''امی آپ فکر نہ کریں۔ احمر ایسے نہیں ہیں اور اگر ایسا ہوا تو جان سے مار دوں گی دونوں کو۔'' رانیہ مضبوط لہجے میں بولتی ہوئی میرے ہوش اڑا گئی تھی۔ اور میں جو کمرے میں داخل ہونے لگا تھا ان کی گفتگو سن کر واپس پلٹ گیا تھا۔ ٹیرس پر آ کر ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے میں اپنا غصہ دور کرنے لگا تھا۔ خالہ جان کے سو فیصد اندازے پر میرا غصہ تو لازمی تھا۔ وہ کون ہوتی تھیں میری ذات پر الزام لگانے والی۔ میں جو بھی کروں، جو میرا دل چاہے گا۔ آخر کو مرد ہوں۔ ایک ماحول میں رہتے رہتے تنگ آ جاتا ہوں۔ ایک چہرہ دیکھ دیکھ کر تھک جاتا ہوں۔ اگر کچھ دیر کے لیے ماحول بدل لیتا ہوں تو اس میں کیا برائی ہے۔ مگر یہ جاہل عورتیں ان کو کون سمجھائے؟

☆......☆......☆

''چاندنی حارث کے لیے پراٹھا لا دو!'' رانیہ لاڈلے بھائی کے خوب لاڈ اٹھا رہی تھی۔

چاندنی نے پراٹھا لا کر حارث کے آگے رکھ دیا تھا۔

وہ ایک الگ بات تھی کہ حارث پراٹھے سے زیادہ چاندنی کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی گہری نگاہیں چاندنی کے چہرے پر تھیں۔ میں اپنی جگہ بل کھا کر رہ گیا تھا۔ چاندنی پر کوئی بری نگاہ ڈالے مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کو ہماری ملازمہ تھی۔ میری ذمہ داری تھی کہ اس کی حفاظت کروں۔

جہاں تک میری بات ہے تو مجھے چاندنی پسند کرتی تھی۔ میں نے صاف دیکھا ہے کہ حارث کے دیکھنے پر چاندنی کے چہرے پر ناگواری ہوتی ہے۔ مگر میرے لیے چاندنی کی آنکھوں میں ناگواری نہیں ہوتی بلکہ ایک نرمی سی ہوتی ہے اب نرمی کو محبت کہہ دوں تو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا......

''خالہ جان! میں سوچ رہا تھا جب تک آپ یہاں ہیں حارث میرے ساتھ آفس چلا جایا کرے۔'' میں نے خالہ جان سے کہا۔

''ارے بھئی کیا ہوا؟'' رانیہ حیرت سے بولی۔ یعنی جب کچھ ہوگا تب ہم کچھ کریں گے۔ مجھے رانیہ کی مداخلت بری لگی تھی۔

''کیا مطلب؟ بات کیا ہے؟'' رانیہ ابھی بھی حیران تھی۔

''بھئی! میرا مطلب ہے سارا دن حارث گھر پر بور ہوتا رہتا ہے۔ باہر میرے ساتھ کچھ آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور یوں تعلیم کے بعد Practical life میں قدم رکھنے کے لیے کچھ سوجھ بوجھ بھی ہو جائے گی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے خالہ جان کو دیکھا تھا۔

''ہاں اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔'' خالہ جان میری تائید میں بولیں۔

''اچھا سنیں زیادہ مت تھکایئے گا میرے پیارے لاڈلے بھائی کو۔'' رانیہ محبت سے بولی تھی۔

''نہیں، نہیں، بہت خیال رکھوں گا، آپ کے لاڈلے بھائی کا۔'' میں نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا۔ اب انہیں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ لاڈلے بھائی کو چاندنی کو تاڑنے سے فرصت ملے تو کوئی کام کرے۔ خود تو وہ بور نہیں ہو رہا مجھے بور کر رہا ہے۔ تھکنے کی بات تو یوں ہی کی جا رہی ہے۔ جیسے موصوف کھیتی باڑی کرنے گاؤں جا رہے ہوں۔

"ندا حارث کہاں ہے؟" میں نے ندا کو بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"بھائی وہ یہیں تھا اب شاید کچن میں ہوگا کہہ رہا تھا کہ چائے کا کہنے جا رہا ہوں۔" ندا جواب دے کر پھر کھیلنے لگی تھی۔

میں کچن کی طرف بڑھا تو حارث کھڑا نظر آیا۔

"ارے یار تم یہاں ہو۔" میں بظاہر نارمل انداز میں بولا تھا۔ مگر اندر کی کیفیت تو آپ جان گئے ہوں گے۔

"احمر بھائی چائے کا کہنے آیا تھا!" حارث مجھے دیکھ کر گڑبڑا سا گیا تھا۔ چاندنی البتہ اپنے کام میں مصروف رہی تھی۔ "اچھا میں سمجھا تم چائے کا طریقہ پوچھنے آئے ہو!" میں نے جل کر کہا۔

"نہیں نہیں میں آنے ہی والا تھا!" میری بات پر حارث کھسیانا سا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک کٹیلی سی نگاہ چاندنی پر ڈالی تھی کہ محبت مجھ سے اور باتیں کسی اور سے۔

☆......☆......☆

"چاندنی چائے باہر لان میں ہی لے آؤ!" رانیہ نے چاندنی کو پکارا تھا۔ چاندنی چائے رکھ کر جانے لگی تھی کہ حارث کے پکارنے پر رُک گئی۔

"چاندنی چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی ہو جائے تو مزہ آ جائے گا۔" حارث نے اسے ضرور جان بوجھ کر روکا تھا۔ میں حارث کو غصے سے دیکھنے لگا۔

"رانیہ آپی ویسے آپ کی ملازمہ بڑی نخریلی سی ہے۔" حارث کی نگاہوں نے دور دور تک چاندنی کا تعاقب کیا تھا۔

"کیوں بھئی کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کچھ کہا ہے۔" رانیہ نے حیرت سے بولا۔

"کچھ کہتی ہی تو نہیں ہے! حارث زیر لب بڑبڑایا تھا البتہ میں نے سن لیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا حارث کا منہ توڑ دوں۔

"کیا بول رہے ہو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" رانیہ ناسمجھی سے بولی۔

"میرا مطلب ہے یہ کام کرنے والی عورتیں بڑی باتونی ہوتی ہیں مگر چاندنی ذرا مختلف ہے۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔" حارث وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو اچھی بات ہے۔ یوں بڑ بڑ کرنے والی عورتیں زہر لگتی ہیں مجھ کو۔" رانیہ نے جواب دیا۔

چاندنی کھانے کی چیزیں رکھ کر جا چکی تھی۔

"بھئی یہ چاندنی نامہ چھوڑو اور چائے پیو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" میں نے دانت پیستے ہوئے حارث کو ٹوکا تھا۔

☆......☆......☆

"احمر بھائی جب سے ہم آئے ہیں آپ نے ایک بار بھی ہمیں آؤٹنگ نہیں کروائی!" ندا نے مجھ سے شکوہ کیا تھا۔

"جی پاپا! آنی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" حمزہ اور ثانیہ یک زبان ہو کر بولے تھے۔

"ہاں احمر کوئی اچھا سا پروگرام بناتے ہیں۔" رانیہ بھی ان کی حمایت میں بولی تھی۔

چاندنی کے بے حد انکار کے باوجود سب نے اسے بھی ساتھ لے لیا تھا میں بھی یہی چاہ رہا تھا کہ حارث کی وجہ سے چاندنی نہ جائے مگر کسی نے نہیں سنی تھی۔

اگلے دن اتوار کا دن تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ بادل چھائے تھے۔ ساحل سمندر پر بے حد رونق تھی۔ بچوں نے خوب انجوائے کیا۔ ثانیہ نے اشارہ کر کے چاندنی کو بھی بلا لیا۔ چاندنی نہ چاہتے ہوئے بھی چلی گئی۔ رانیہ اور خالہ جان نجانے کون سے قصے لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ میں البتہ چاندنی اور حارث کی طرف متوجہ تھا کہ یکایک ایک زوردار لہر آئی چاندنی توازن قائم نہ رکھ سکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی حارث نے اسے فوراً تھام لیا تھا۔ چاندنی اس افتاد پر ایک دم گھبرا گئی تھی۔

حارث کو ہیرو بننے کا موقع مل گیا تھا۔ حارث یہ چاہ رہا ہوگا کہ میں کیمرہ اٹھاؤں اور یہ فلمی سین ہمیشہ کے لیے کیمرے میں قید کرلوں مگر میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ حارث کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔ میں فوراً ان کی جانب بڑھا تھا۔

"کیا ہوا خیریت؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حارث کو کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"احمر بھائی وہ چاندنی گرنے والی تھی کہ تھینک گاڈ حارث نے اسے بچا لیا۔" ندا فوراً بولی تھی۔

البتہ چاندنی خاموش رہی تھی۔ وہ ہمیشہ خاموش رہتی تھی۔ کچھ بھی کبھی بولتی نہیں تھی بالکل ایک بند کتاب کی طرح تھی۔

باقی تمام وقت میں خاموش رہا۔ موڈ تو آف ہو چکا تھا۔ کھانے کے دوران بھی چاندنی خاموش رہی تھی۔ البتہ حارث یوں مطمئن تھا جیسے بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

حارث کو تو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں اس کم عمر لڑکے سے جیلس ہو رہا تھا۔ وہ میرے اور چاندنی کے درمیان آ گیا تھا جلن تو ہونا بنتی تھی۔

☆......☆......☆

خالہ جان کو ایئر پورٹ چھوڑ کر آیا تو موڈ بے حد فریش تھا۔ حارث کے جانے کی خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ کمبخت نے کافی دنوں تک مجھے پریشان کیا تھا۔

''رانیہ پلیز کھانا لگوا دو بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' پکارنا تو چاندنی کو تھا مگر احتیاط بھی ضروری تھی۔ چاندنی نے کھانا لگایا تو میں نے بہت مطمئن نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''احمر وہ رمشا آئی تھی۔'' رانیہ نے کھانے کے دوران بتایا۔

''اچھا خیریت۔'' میں نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی اس کے بھائی کی شادی ہے، انوائیٹ کرنے آئی تھی۔ رمشا رانیہ کی دوست تھی۔ دونوں نے تعلیم اکٹھے حاصل کی تھی۔ دونوں کی بے حد گہری دوستی تھی۔

''تو چلی جانا کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں مسئلہ تو کوئی نہیں ہے اس نے آپ کو بھی انوائیٹ کیا ہے۔ اور تاکید کی ہے کہ آپ نے بھی ضرور آنا ہے۔'' رانیہ نے وضاحت کی۔

''بھئی مجھے تو معاف کرو۔ تمہیں پتا ہے مجھے یوں شور شرابے میں شامل ہونا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے وجہ بتاتے ہوئے معذرت کی۔

''احمر پلیز! ورنہ رمشا ناراض ہو جائے گی۔ کہہ رہی تھی احمر بھائی سے میری لڑائی ہو جائے گی انکار کی صورت میں۔'' رانیہ نے اس کی دھمکی دی مجھے۔

''اُفوہ! رانیہ ضد مت کرو، میں مجبور ہوں۔'' میں سٹپٹایا تھا۔

''احمر کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ بچوں کی طرح ضد مت کریں۔ میری دوست ہے اچھا لگتا ہے اسے آپ کا انکار بتاؤں۔'' رانیہ چڑتے ہوئے بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے صرف بارات میں شرکت کروں گا، مزید مجھ سے امید مت رکھنا؟'' میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے بات ختم کر دی۔

☆......☆......☆

میں صبح آفس کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ رانیہ آ گئی۔

''احمر میں اور بچے ابھی چلے جائیں گے، چابی چاندنی کو دے جاؤں گی اور ہاں آپ پلیز بارات میں ضرور شریک ہو جائیں۔'' رانیہ نے یاد دہانی کروائی۔

''بے فکر رہو آ جاؤں گا۔'' میں نے بال سنوارتے ہوئے جواب دیا سوئی تو اسی جملے پر اٹکی ہوئی تھی کہ میں اور چاندنی گھر میں اکیلے ہوں گے۔ تمام دن آفس میں میرا موڈ بے حد خوشگوار رہا تھا بس گھر جانے کی جلدی تھی۔

☆......☆......☆

گھر میں داخل ہوا تو غیر معمولی خاموشی تھی۔ البتہ کچن میں سے کام کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''چاندنی پلیز چائے میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' میں کہہ کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

میں فریش ہو کر آیا کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''آ جاؤ!'' میں نے کہا۔

''صاحب جی آپ کی چائے۔'' چاندنی چائے رکھ کر جانے لگی تھی۔

''چاندنی!'' میں نے اسے پکارا۔

''جی صاب جی!'' چاندنی میری پکار پر پلٹی تھی۔

''کچھ دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہوں۔

''جی!'' چاندنی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''کیوں میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔'' میں نے اسے حیرت پر کہا۔

''صاب جی میں نے کھانا تیار کر دیا ہے۔ آپ کہیں تو کھانا لگا دوں میرا کام ختم ہو گیا ہے مجھے گھر جانا ہے۔'' چاندنی سنجیدگی سے کہتی ہوئی دوبارہ جانے لگی۔

''بات سنو چاندنی!'' میں نے اسے پھر پکارا تھا۔

''جی صاحب جی!'' اب کی بار چاندنی کی نگاہوں میں حیرت نہیں ناگواری تھی۔

''صاحب جی مجھے جانے دیں مجھے گھر جانا ہے!'' چاندنی نے پہلی بار میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ پلٹتی میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''آخر تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟'' میں نے غصے سے اسے

دیکھتے ہوئے کہا۔اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا چاندنی کا ہاتھ اٹھا تھا اور میرے چہرے پرنشان چھوڑ گیا تھا۔تھپڑ کی بازگشت میرے اندر تک پھیل گئی تھی۔ میں اس کی اس جرأت پر ابھی تک حیران تھا۔ اس کا ردعمل میرے لیے اتنا غیر متوقع تھا۔مگر میں چند لمحوں کے لیے خاموش سا ہو گیا تھا اور اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''یہ آپ کے سوال کا جواب تھا!'' چاندنی کی جگہ لگ رہا تھا کوئی شیرنی دھاڑ رہی ہے۔میں اب بھی اپنی جگہ خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔

''نکلے نا آپ بھی ایک عام سے مرد، جو ہوس پرست ہوتا ہے، بدنظر ہوتا ہے۔مگر میں بے خبر رہی آپ کے ارادوں سے۔آپ کی مہربانیوں کو آپ کی اچھائی جانتی رہی آپ کی احسان مند ہوتی رہی۔مگر میں بھول گئی تھی کہ آخر آپ ایک مرد ہیں۔'' چاندنی کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے تھے۔رندھی ہوئی آواز میں وہ مجھے آئینہ دکھا رہی تھی۔

''دکھ مجھے اس بات کا نہیں آپ نے مجھے غلط نگاہ سے دیکھا۔ دکھ اس بات کا ہے کہ میں نے آپ کی نگاہوں کو سمجھا نہیں۔ میں کم عقل تھی، ناسمجھ تھی۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا، دل چاہتا تھا میرا بھی کوئی بھائی ہوتا جسے میں نخرے دکھاتی، جس کے لاڈ اٹھاتی۔ جب نذیر مجھے مارتا تو میرا بھائی آگے ڈھال ہوتا۔آپ کو دیکھا تو خیال آیا کہ ہاں بھائی ایسا ہی ہوتا ہے۔اتنا مہربان اور اتنا ہی شفیق، اور پھر دل نے کچھ سوچا نہیں۔میں نے آپ کو اپنا بھائی بنا لیا۔آپ نے مجھے سوٹ دیا تو میں بے حد خوش تھی کہ میرا بھائی میرے لیے عید پر لایا ہے۔میں آپ کی شکر گزار تھی کہ آپ نے میرا اتنا خیال رکھا ہے مگر آج آپ نے میرا مان توڑ دیا۔میرا اعتبار ختم کر دیا۔آئندہ زندگی میں بھی کسی کو بھائی نہیں کہہ سکوں گی صاب جی آپ نے میرا بھائی مجھ سے چھین لیا۔'' چاندنی اب زمین پر بیٹھ کر آہ بکا کر رہی تھی۔اور میں اپنی جگہ جم سا گیا تھا۔یوں لگ رہا تھا کہ پاؤں من من کے ہو گئے ہیں۔میں ہل جل نہیں سکتا تھا نگاہیں شرم وندامت سے زمین میں گڑ گئی تھیں۔

''آخر آپ مردوں کے لیے عورت ایک کھلونا کیوں ہوتی ہے۔آپ نے کیوں سمجھ لیا کہ عورت اور مرد کے درمیان صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔عورت آپ لوگوں کے لیے قابلِ احترام کیوں نہیں ہوتی؟ آپ مرد آخر کب تک اپنے مرد ہونے کا خراج معاشرے سے وصول کرتے رہیں گے؟ آخر کب تک عورت یونہی ذلت و پستی میں گری رہے گی؟'' چاندنی کی آنکھوں میں سے اب بھی آنسو گر رہے تھے۔

''میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے کیوں کہ اس گھر میں میرا بھائی رہتا تھا جو اَب نہیں رہا۔آپ نے میرا اعتبار توڑ دیا ہے۔صاب جی! میں زندگی بھر کسی مرد پر یقین نہیں کر سکوں گی۔آپ سے بہتر تو نذیر ہے، جس کے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر بھی ہوتا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی طرح اچھا بننے کی کوشش نہیں کرتا۔'' آنسو صاف کرتے ہوئے وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

''اُف یہ نوکرانیوں نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ جب دیکھو بتائے بغیر غائب ہو جاتی ہیں، اور خبر بھی نہیں ہوتی کہ آئیں گی بھی یا نہیں۔'' ناشتا رکھتے رانیہ نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی۔''آپ ناشتا کیوں نہیں کر رہے۔ رانیہ نے میری غائب دماغی نوٹ کرتے ہوئے مجھے ٹوکا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا تھا۔

''آج ہی ماسی رشیدہ کو نئی ملازمہ کا کہتی ہوں۔'' رانیہ اپنا ہی راگ الاپ رہی تھی۔

چاندنی مجھے پھر کبھی نظر نہیں آئی کئی برس گزر گئے مگر میں آج بھی اپنے فعل پر نادم ہوں۔ کسی کا مان توڑنے کا غم مجھے ہنسنے نہیں دیتا۔اپنے مرد ہونے کا بہت جو غرور تھا اب وہ پاش پاش ہو چکا ہے۔ بہت سارے چہروں میں وہی ایک چہرہ ڈھونڈتا ہوں۔ وہ مجھے ایک بار ملے اس سے معافی مانگ لوں۔اس کا بھائی اسے لوٹا دوں مگر میں بھول ہی گیا۔ کئی باتوں کی معافی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی تلافی ہوتی ہے۔

چاندنی سے معافی مانگنا چاہتا ہوں مگر رانیہ سے کبھی معافی نہیں مانگ سکتا۔آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں......؟

☆☆......☆☆......☆☆

دوسری مرد کہانی

# مقتدر بابا



ندیم عباس ڈھکو

اُس ڈھونگی بابا کی کہانی جو آنکھوں سے وار کر کے عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا تھا

میری زندگی میں پیش آنے والے اس واقعے کو تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں۔ اس واقعے نے میری ہنستی بستی زندگی اور جنت نما گھر کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد ہی میں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئی ہوں۔



اس وقت میرا سرمایۂ حیات بس گزشتہ اچھے دنوں کی یادیں اور موجودہ ذلتیں ہیں۔ میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ اس واقعے کے بعد خودکشی کر لیتی اور اس وقت اس کی ہڈیاں بھی خاک میں مل چکی ہوتیں۔ لیکن میں چوں کہ کم ہمت اور بزدل ہوں اس لیے بار بار خواہش کے باوجود اپنی زندگی کو ختم نہ کر سکی۔

میری شادی خاندان میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد تین سال پلک جھپکتے گزر گئے۔

لیکن تیسرے سال کے آخری ماہ میں مجھے احساس ہوا کہ میری شادی کو اتنی مدت گزر گئی ہے اور پھر میری زندگی میں پُرتشویش اور پریشانی کے دنوں نے یلغار کردی۔

میرے محبت کرنے والے خوب رو شوہر کا چہرہ بجھا بجھا رہنے لگا۔ وہ گھر آتے، کھانا کھاتے اور پھر یوں سونے کی کوشش کرتے جیسے انہیں مجھ سے کوئی مطلب ہی نہ ہو۔

اس رویے کو چند دن تو میں نے برداشت کیا اور پھر ایک دن میری زبان کھل ہی گئی۔

''جمشید میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل آپ کا منہ کیوں بنا ہوا ہے؟''

''میرا منہ تو نہیں بنا ہوا لیکن میں فکر مند ضرور ہوں۔'' جمشید نے اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''کیا فکر ہے آپ کو؟'' میں نے اُن کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ بات تمہیں معلوم ہوگی۔ امی نے تم سے کسی مسئلے پر کچھ نہیں کہا۔''

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔ چند دن پہلے انہوں نے بس اتنا کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ جا کر کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرالوں۔

چونکہ معائنہ کرانے والا مشورہ میری سمجھ ہی میں نہیں آیا اس لیے میں نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں صحت مند ہوں اس لیے میں نے آپ سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں نے انہیں سب کچھ بتادیا۔''

''اوہ...... شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔'' جمشید نے میری طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات صحت کی نہیں اولاد کی ہے۔ امی کا خیال ہے کہ اب تک ہمیں صاحب اولاد ہو جانا چاہیے تھا۔ آج بھی انہوں نے میرے گھر آتے ہی اسی سلسلے میں پوچھا تھا۔'' اتنا کہہ کر جمشید چند لمحے رُکے، پھر بولے۔

''میں نے اُن سے کہا ہے کہ کل لے جاؤں گا۔ میرا خیال ہے کل چلیں گے۔ اگر تم بات شروع نہ کرتیں تو میں آج اس مسئلے پر خود تم سے بات کرتا۔ سارے خاندان میں آج کل ہمارے ہی بارے میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ اگر جلد ہی ہمارے گھر خوشی کے آثار نظر نہ آئے تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔''

مجھے اس بڑے مسئلے کا احساس تھا کیونکہ جمشید کے بڑے بھائی اولاد ہی کے چکر میں دو شادیاں کر چکے تھے۔

لیکن ان کے گھر ابھی تک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ جمشید کو بھی امی کی خواہش اور اپنے بڑے بھائی کی روایت پر عمل کرنا پڑ جاتا۔ ہر حال میں نہ چاہتے ہوئے بھی، اپنے شوہر کا دل رکھنے کے لیے لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کرانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔

☆......☆......☆

اسی شام میں جمشید کے ساتھ ایک معروف لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے تفصیلی معائنہ کیا۔ اس معائنے کے بعد جو رپورٹ لیڈی ڈاکٹر نے دی۔ وہ تشویش ناک نہیں تھی۔ میں بانجھ نہیں تھی۔ میرے ہاں اولاد ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کی رپورٹ کے مطابق میرا جسم چند اندرونی خرابیوں کا شکار تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میرا علاج شروع ہوا۔ اور چند ہفتوں ہی میں لیڈی ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے ٹھیک ہونے کے باوجود حالات بدستور رہے۔ میں آس لگائے بیٹھی رہی اور اسی طرح کئی ماہ گزر گئے۔

جمشید نے اس درمیان کئی بار میرا معائنہ کرایا۔ میرے سرہانے مختلف دوائیں کھانے اور لیڈی ڈاکٹروں کے چکر لگانا میرا معمول بن کر رہ گیا تھا۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی

نہ نکلا۔

ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر میں نے پیروں، فقیروں کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دیے۔

اسی دوران ایک عورت کے مشورے سے میں جمشید کو ساتھ لے کر مقتدر بابا کے پاس پہنچی۔

اُن کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ بہت جلالی بابا ہیں۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے بلکہ مخصوص لوگوں کو ہی فیض پہنچاتے ہیں لیکن جس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا کام ضرور بن جاتا ہے۔ ان کے متعلق دوسری بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ عموماً لوگوں کو اپنا مرید بھی نہیں بناتے۔ اُن کا حلقہ بھی محدود ہے، جہاں تک اُن کی شہرت کا تعلق ہے تو وہ خاصی تھی۔ مجھ سے جس عورت نے اُن کا ذکر کیا تھا وہ پہلے سندھ کے کسی شہر میں رہتی تھی اور وہاں اس نے اُن کا ذکر سنا تھا اور اس کی ایک عزیز نے اُن سے فیض پایا تھا۔

☆......☆......☆

جب میں اور جمشید اُن کی خدمت میں پیش ہوئے تو وہاں ایک حلقے میں کئی افراد بیٹھے نظر آئے۔ اُن کے لباس اور گفتگو سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ معزز لوگ ہیں۔ جمشید میرے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مقتدر بابا نے ہماری طرف دیکھا اور پھر جیسے اُن کی تیز آنکھیں میرے چہرے، میری آنکھوں اور پھر میرے پورے وجود کے آر پار دیکھنے لگیں۔ چند لمحے تک تو میں اُن کی نظروں کا مقابلہ کرتی رہی اور پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں آنکھیں بند کیے اسی حالت میں بیٹھی رہی اور پھر جب مقتدر بابا کی گرج دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی کہ ''آنکھیں کھولو۔'' تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

بابا نے جمشید کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور پھر آہستہ آہستہ اُن سے سوال کرنے لگے۔ جمشید ان کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے اور پھر ہم وہاں سے باہر آئے تو جمشید نے مجھے بتایا کہ بابا نے نہ صرف ہمدردی سے میری بات سن لی بلکہ ہمارے حق میں دعا کرنے کا یقین بھی دلایا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ہمارا گھر انشاء اللہ جلد ہی خوشیوں سے بھر جائے گا۔

میرے استفسار پر جمشید نے بتایا کہ بابا کو انہوں نے تمام باتیں بتادی ہیں اور بابا نے کہا ہے کہ تمہاری پریشانیوں کے دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں۔ جمشید نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ جمعہ کے روز بابا نے پھر بلایا ہے۔

''جمعہ کے روز کس وقت؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''مغرب کی نماز کے بعد۔''

☆......☆......☆

پھر جمعے کے دن مغرب کی نماز کے بعد میں، میری ساس، جمشید اور میری بڑی نند، بابا کے دربار میں حاضر تھے۔ اس وقت وہاں سوائے ہمارے اور کوئی نہیں تھا۔ بابا نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری ساس، نند اور جمشید کی طرف دیکھا اور جب بولے تو مجھے یوں لگا جیسے اُن کی آواز رم جھم کرتی ہوئی پھوار کا ترنم ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد تمام افراد نے گردنیں جھکا دی تھیں اور بابا بول رہے تھے۔

''آپ لوگ مجھے کسی معزز خاندان کے افراد لگتے ہیں۔ مجھے اشارہ ملا ہے کہ آپ لوگ جس مقصد سے یہاں آئے ہیں۔ وہ بہت جلد پورا ہوگا۔ خدا اپنے محبوب بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ لیکن اب آپ لوگوں کی آزمائش کے دن ختم ہونے والے ہیں۔''

اتنا کہہ کر بابا نے میری طرف نگاہ کی۔ چونکہ میں نے اپنی گردن جھکائی نہیں تھی اور اُن کے چہرے ہی کو دیکھ رہی تھی اس لیے اُن کی نظروں نے میری آنکھوں کا احاطہ کر لیا اور پھر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے وجود میں برقی لہریں سی دوڑ رہی ہوں۔ میری آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی۔ بابا کی سحر انگیز آنکھیں میرے چہرے سے ہٹ گئیں اور میں نے گردن جھکا دی۔

☆......☆......☆

دو ہفتے ہم لوگ اسی طرح بابا کے پاس گئے اور پھر میری ساس نے بابا کو شام کے کھانے کی دعوت دی۔ بابا نے گھر آنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب میری ساس نے بہت اصرار کیا تو بابا نے دعوت قبول کر لی۔ اس دعوت

کے بعد مقتدر بابا اکثر ہمارے گھر آنے لگے۔ تمام خاندان انہیں سرآنکھوں پر بٹھانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یوں ہوا کہ وہ ہر شام ہمارے گھر آتے اور رات گئے واپس جاتے۔

میں نے اس دوران میں جمشید کو یہ خوشخبری دی تھی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ یہ خبر جمشید کے لیے نہیں بلکہ تمام خاندان کے لیے مسرت کا پیغام تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی مقتدر بابا کی قدر و منزلت اور آؤ بھگت میں اضافہ ہوگیا۔ خاندان کا ہر فرد ان کا گرویدہ اور مرید ہو کر رہ گیا۔

پھر وقت یوں گزر گیا کہ احساس ہی نہ ہوا۔

ایک رات میری گود میں چاند سا بیٹا چمک رہا تھا۔ ایک میں ہی نہیں بلکہ سب کے سب ہی افراد خوش تھے۔ سوا مہینے بعد بچے کی پیدائش کی خوشی میں جو جشن منایا گیا اس کے اختتام پر میری ساس نے بابا سے گزارش کی کہ وہ اب ہمارے ہی گھر میں رہیں۔ تمام خاندان نے میری ساس کی تائید کی۔ بابا نے بہ رقت تمام اس رائے سے اتفاق کیا۔

☆......☆......☆

پھر چند ماہ بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ تمام خاندان اُن کی شخصیت اور علم کا اسیر تھا اور میں اُن کی ساحر آنکھوں کا شکار۔

اِس انکشاف نے مجھے خوف زدہ کر دیا مجھے اپنا وجود نجس نظر آنے لگا۔ میرا ضمیر ہر وقت مجھے کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ جس رات مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اب تک نادانستگی اور بے خبری میں مجھ پر کیا گزر رہی ہے، وہ رات میری پُرسکون زندگی کی آخری رات تھی۔ اس کے بعد سے آج تک میری روح مضطرب ہے اور جسم ہلکان۔

''اُس رات وہ شخص جسے میں قابلِ احترام سمجھتی آئی تھی۔ میری مسہری پر بیٹھا مسکرا مسکرا کر مجھ سے اظہارِ محبت کر رہا تھا اور میں اسے حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے کہا کہ میں نے محبت کا خراج پہلے وصول کیا اور پھر تم سے سچی محبت کی۔'' تو مجھے اس کے روح پرور چہرے پر خیانت رقص کرتی نظر آئی اور جب میں بولی تو اس کے لیے میرے لہجے میں شامل تمام تر احترام فنا ہو چکا تھا۔

''تُو نے یہ ٹھیک نہیں کیا، مقتدر۔'' میں نے بڑے نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تُو...... تُو خبیث ہے، تُو ابلیس ہے، تُو نے مجھے برباد کر دیا۔'' میں جذبات سے مغلوب ہو کر جو منہ میں آرہا تھا کہے جا رہی تھی۔ اس نے بڑی رعونت سے قہقہہ لگایا اور پھر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

''زہرہ یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔ میں نے تمہیں برباد ہونے سے بچا لیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو پھر تم نہ صرف اولاد کو ترس جاتیں بلکہ تمہیں اپنی سوکن کو بھی برداشت کرنا پڑتا۔ تمہاری ساس چاند سے پوتے کے لیے اپنے بیٹے کی دوسری شادی ضرور کرتیں۔ لیکن زہرہ اس عورت سے بھی کوئی اولاد نہ ہوتی، جس طرح جمشید کا بڑا بھائی بے اولاد ہے حالانکہ اس نے بھی دو شادیاں کی ہیں۔ پاگل عورت تم نے صرف اپنا ہی معائنہ کرایا تھا۔ اگر تم جمشید کا معائنہ بھی کراتیں تو تمہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ خود باپ بننے کے قابل نہیں ہیں۔ جمشید بھی ایسا ہی ہے۔'' وہ بول رہا تھا اور میں نفرت، غصے اور حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں بول اٹھی۔

''مگر یہ بات تم مجھے برباد کیے بغیر بھی تو بتا سکتے تھے، ذلیل آدمی۔'' میرا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے انتہائی مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں حاصل کرنے سے قبل مجھے خود اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن جب تم نے اپنے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ تم ماں بننے والی ہو تو مجھے قدرے تعجب ہوا کیوں کہ میں تمہیں بانجھ سمجھ رہا تھا۔''

پھر مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

''اور...... اور پھر تم نے سوچا کہ مجھے اپنی آنکھوں کے سحر میں لیے بغیر بھی اپنی من مانی کر سکو۔'' میری آواز زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

''ہاں۔'' وہ بے حیائی سے ہنسا۔

''اس کی ایک وجہ تھی۔'' پھر وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔

''ہوا یہ کہ تمہیں دیکھ کر پہلی بار میں نے یہی سوچا

تھا۔ حصول مقصد کے بعد تمہارا خیال دل میں نہیں لاؤں گا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ میں تمہارا اسیر ہوگیا۔ یقین کرو زہرہ تم سے ملاقات کے بعد چند دن بعد ہی میں نے اپنی قوتوں سے کام لے کر اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا لیکن اس کے بعد بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سرگوشی گونجتی رہی کہ تم ہی میری منزل ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے گھر والوں کو منہ نہ لگاتا۔'' وہ دیر تک ایسی ہی بکواس کرتا رہا۔

پھر جاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''زہرہ پہلے تو تم خود ہی کسی کو کچھ بتانے کی حیثیت میں نہیں ہو لیکن میں تمہیں یہ بتادوں کہ اگر تم نے اس کا تذکرہ کیا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہاں تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔ اتنا برا انجام کہ تم اُس کا تصور بھی نہیں کرسکتیں۔''

پھر وہ چلا گیا اور میں رات گئے تک جاگتی رہی۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب خیالات سر ابھار رہے تھے۔ میرے ضمیر پر ایک نامعلوم سا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ دل میں درد سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں آگ سی بھرگئی اور پھر مؤذن کی آواز کے ساتھ ہی میرے ذہن نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں بے خبر سوگئی۔

☆......☆......☆

اپنے بچے کی پیدائش کے بعد سے میں خواب گاہ میں تنہا ہی سو رہی تھی۔ جمشید دوسرے کمرے سونے لگا تھا۔ چند دن تو میں یہ سمجھتی رہی کہ شاید وقتی طور پر ایسا ہوا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کارستانی بھی مقتدر کی تھی۔ اس نے میری ساس سے کہا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد ہم دونوں میاں بیوی کا الگ الگ سونا اور تقریباً ایک سال تک ایک دوسرے کے قریب نہ آنا ضروری ہے۔ ورنہ بچے پر کوئی اَن دیکھی مصیبت ٹوٹ سکتی ہے۔ دن میں تو جمشید میرے پاس آتے، بات چیت کرتے، خیر خیریت دریافت کرتے۔ لیکن رات کی آمد سے صبح کی آمد تک پھر اُن کی شکل نظر نہ آتی۔ یہ سب کچھ اس خبیث نے صرف اور صرف اپنا راستہ صاف کرنے کی نیت سے کیا تھا اور وہ اس صاف راستے سے خوب فائدہ اُٹھا رہا تھا۔

پہلے پہلے جب وہ میرے پاس آتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا اس کے منہ پر تھوک دوں۔ مگر جلد ہی یہ صورتِ حال بدل گئی۔ وہ ایک رات مجھ سے بولا۔

''زہرہ بس چند دن کی بات اور ہے پھر تمہاری آنکھوں میں میرے لیے نفرت نہیں محبت ہوگی اور میں تمہیں سحر کا شکار کیے بغیر اپنے دل کی مرادیں پوری کیا کروں گا۔''

پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا عملی صورت میں بھی ظاہر ہونے لگا۔ میں نے اپنے اندر تبدیلی محسوس کی۔ یہ تبدیلی میرے لیے عجیب اور حیرت انگیز تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں اس کی شیطانی قوتوں کے زیرِ اثر آچکی ہوں، میرے دل سے رفتہ رفتہ اس کی نفرت ختم ہونے لگی اور پھر وہ وقت آگیا کہ نفرت کی جگہ محبت نے لے لی۔ میرا ضمیر بالکل ہی سوگیا۔

اب میرا بچہ ڈیڑھ سال کا ہوچکا تھا۔ جمشید اور اس کے گھر والوں کی آنکھوں پر جیسے کسی نے پٹی باندھ دی تھی۔ ہماری طرف کوئی بھی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ جمشید کی جگہ مقتدر نے لے لی تھی۔

انہی دنوں ایک رات مقتدر نے مجھ سے کہا کہ اب میں اس شہر سے جانا چاہتا ہوں۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ چند دنوں سے میں محسوس کررہی تھی کہ اب مقتدر کے بغیر میری زندگی پھیکی پھیکی رہے گی، اس لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ مجھ سے جدا ہو۔

جمشید کے سلسلے میں میرے دل میں بیگانگی کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۔ لیکن اس کے برعکس جمشید کے دل میں میری محبت دوچند ہوگئی تھی۔ اس کا احساس مجھے اس کے عمل سے ہوتا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت اب میرا خیال زیادہ رکھنے لگا تھا۔ میں نے مقتدر سے کہا کہ اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ بلند کیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''بھلا کیوں؟''

''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' میں اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''اگر تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ہو تو میرے ساتھ چلو۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے

کہا۔

''میں...... میں...... تمہارے ساتھ چلوں کیسے؟ کیا یہ گھر بار اور اپنے بچے چھوڑ دوں۔ نہیں، نہیں یہ بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔''

''دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں۔ تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم کہ اب میں زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتا۔ میں بہت جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم کو واقعی مجھ سے محبت ہے تو پھر میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

''سوچوں گی، سوچوں گی میں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' میں اُلجھے اُلجھے لہجے میں بولی۔

''سوچنے کا اب وقت نہیں ہے۔ یہ وقت فیصلہ کرنے کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کل رات کسی بھی لمحے میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا اور پھر اس کی سحر کار آنکھیں میری طرف اٹھیں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے وہی کہا جو وہ چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری رات تقریباً دو بجے جب میں جمشید کے گھر سے فرار ہو رہی تھی تو میں نے مقتدر سے کہا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے بچے کو ساتھ لے جاؤں۔ یہ میرے بغیر کیسے رہے گا؟''

''ممکن تو ہے لیکن یہ میرے لیے پریشانی کا باعث بنے گا۔ بس چند دن کی بات ہے۔ پھر یہ ہمارے پاس ہی ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے دوبارہ تم تک پہنچادوں۔ فی الحال اسے یہیں رہنے دو۔ جمشید کی امی اس کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ ہمارے مستقبل کے لیے یہی بہتر ہے کہ بچے کی جدائی کا غم وقتی طور پر برداشت کرلیں، ورنہ نہ صرف ہم بلکہ بچہ بھی مصیبت میں پھنس جائے گا۔''

اس نے ٹھہر ٹھہر کر کچھ اس انداز میں کہا کہ مجھے خود بھی اس کی بات تسلیم کر لینے ہی میں اپنی اور بچے کی بھلائی نظر آئی۔

وہ بچے کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ بہت چالاک اور شیطانی فطرت کا مالک تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر ماں اور بچہ دونوں ہی گھر سے غائب ہو گئے تو گھر والے پاگل ہو جائیں گے اور ان کی بھاگ دوڑ دو چند ہو جائے گی، صرف میرے گھر سے بھاگ جانے پر اتنا ہنگامہ نہیں ہوگا۔ چند دن کی تلاش کے بعد سب لوگ بچے کی نگہداشت میں لگ جائیں گے اور مجھ پر لعنت بھیج دیں گے پھر شاید ہوا بھی یہی۔

میں مقتدر کے ساتھ حیدرآباد سے کراچی آ گئی کراچی انسانوں کا سمندر ہے۔ اس سمندر میں ہمارا ضم ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ دس بارہ دن تو مقتدر نے مجھے ایک غیر معروف سے ہوٹل میں رکھا اور پھر ایک رات ہم کورنگی کے ایک کوارٹر میں منتقل ہو گئے۔ جس کوارٹر میں ہم آئے تھے۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اور یہ آثار بھی کہ ہم سے پہلے بھی وہاں کچھ لوگ رہتے تھے جو آج ہی کہیں گئے ہیں۔ میرے استفسار پر مقتدر نے یہ کہہ کر میری تسلی کر دی کہ یہاں میرے بھائی اور ان کے بچے رہتے تھے۔ وہ آج ہی لیاقت آباد منتقل ہو گئے ہیں۔'' اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے تسلی نہیں ہوئی اور میں شک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے میری نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تم بڑی شکی مزاج ہو زہرہ۔ لیکن میرے سلسلے میں تمہارے شکوک تمہیں سکون سے نہیں رہنے دیں گے، اس لیے شک اپنے دل سے نکال دو۔'' اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا۔ پھر بولا۔

''میں نے زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں اور وہ عورت صرف تم ہو۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میری زندگی میں کئی عورتیں آئیں اور چلی گئیں، یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ میں نے اپنے مطالب کے حصول کے بعد انہیں اپنی زندگی سے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ مگر تم ان میں سے نہیں ہو۔ تمہیں تو مجھ پر شک کی بجائے خود پر فخر کرنا چاہیے لیکن......''

''لیکن مقتدر!''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں آنکھوں اور چہرے سے دل و دماغ کی

گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہوں۔ یہی میرا ہنر ہے۔ اور میں اپنے ہنر میں کامیاب ہوں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح میں نے جمشید اور اس کے گھر والوں کو اپنے قبضے میں کرلیا اور تمہارے دل میں اُتر گیا۔ اب وہ نہ صرف میری بلکہ تمہاری بھی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ رہ گیا بچے کا مسئلہ تو تم یہ اچھی طرح جانتی ہو۔ وہ میرا بچہ ہے اور میں آج نہیں تو کل اسے حاصل کرلوں گا۔''

وہ اس لب و لہجے میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے ہر لفظ سے رعونت کی بو آرہی تھی میرے دل میں یہ احساس جاگ رہا تھا کہ وہ آج نہیں تو کل مجھے بھی دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔ مگر میں اس وقت کیا کرسکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کی مرضی کے مطابق چلوں۔

صبح بیدار ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے حکم تو یہ دیا کہ یہاں میں کسی سے نہیں ملوں گی اور یہ کہ جب وہ گھر سے باہر جائے گا تو دروازے پر تالا لگا دیا کرے گا اور میں گھر میں اس طرح رہوں گی جیسے موجود ہی نہیں ہوں۔

اس حکم کے بعد فطری طور پر مجھے یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ لیکن خواہش کے باوجود یہ سوال میری زبان پر نہ آسکا۔ ناشتے کے بعد اس نے جاتے وقت واقعی دروازے پر تالا لگا دیا۔ میں رفتہ رفتہ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگی۔ وہ جب گھر میں نہ ہوتا تو میرا دل چاہتا کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ لیکن ہمت نہ ہوئی اور جب وہ گھر آجاتا تو مجھے جسے قرار آجاتا اور میں سب کچھ بھول جاتی۔

پھر ایک رات میں اس وقت اپنے آپ سے مزید نفرت کرنے لگی جب مقتدر نے مجھے کسی اجنبی کے تصرف میں دے دیا۔ سردیوں کی رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کررہی تھی کہ کوئی ساڑھے گیارہ بجے مقتدر اپنے ایک دوست کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ صبح جاتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ رات گیارہ بجے تک آئے گا اور اس کے ساتھ ایک دوست بھی ہوگا۔ صبح میں ٹھیک طرح اس کا مطلب سمجھ نہیں پائی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنے دوست کی آمد کا مقصد بتایا۔ تو پہلے مجھے سکتہ سا ہوگیا پھر میں بیٹھ گئی۔ وہ ایک بار پھر پہلے روز والا مقتدر ہوگیا میری کیفیت بھی روز اول والی تھی اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میرے سارے وجود میں برقی لہریں سی دوڑ رہی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرا تنفس تیز ہوگیا اور پھر اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

زہرہ! تم میری کنیز ہو اور کنیزیں صرف حکم مانتی ہیں۔ تم بھی میرا حکم مانو گی یہ میرا دوست ہے۔ اس کا دل توڑنا میری کسی کنیز کے بس میں نہیں اس لیے تم وہی کرو گی جو یہ کہے گا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے یاد رکھو تم میرا حکم بھولو گی نہیں۔ نہیں بھولو گی۔''

میں وہ بھیانک رات آج تک نہیں بھول سکی۔ اس رات کے بعد اس کی خیانت اپنے عروج پر پہنچ گئی اور وہ کوارٹر عیاشی کا اڈہ بن گیا اب میں وہاں تنہا نہیں تھی۔ میرے ساتھ تین لڑکیاں اور بھی تھیں۔ وہ سب بھی میری ہی طرح تھیں 'یعنی' مقتدر بابا کی اسیر' وہ مقتدر کو شیطان کہتی تھیں۔ لیکن اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ ان میں تھی نہ مجھ میں۔ ان لڑکیوں کی آمد کے کوئی پندرہ دن بعد ہی محلے کے لوگوں نے ہنگامہ کردیا۔

یہ بڑا خاموش ہنگامہ تھا اس لیے کہ اس کی اطلاع مقتدر کو اس وقت ملی جب وہ اپنے چند دوستوں اور ہمارے ساتھ علاقے کے تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانے میں نہ تو میں نے اپنے سابقہ گھر کے بارے میں کوئی بیان دیا نہ ہی ان لڑکیوں نے ایسا کیا بلکہ ہم اصرار کرتے رہے کہ اس سلسلے میں ہم سے کچھ نہ پوچھا جائے اور جس جرم میں ہمیں گرفتار کیا ہے اس کی جو بھی سزا ہے وہ ہمیں دی جائے تھانے ہی میں مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ مقتدر کا اصل نام ارشاد بیگ تھا اور وہ پولیس کو کوئی سالوں سے مطلوب تھا۔ وہ کئی جرائم میں ملوث تھا۔ میں ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ چھ دن تھانے میں رہی اور پھر ہمیں چھوڑ دیا گیا۔ یہ رہائی میرے لیے ایک طرح سے موت کا پیغام تھی۔ روانگی سے قبل تھانے دار نے بتایا کہ مقتدر کے

خلاف ہمیں حبس بے جا میں رکھنے کا مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔ تھانے دار نے ایک بیان پر ہمارے دستخط بھی لیے تھے۔ اس نے ہمارا پتا بھی پوچھا تھا۔ لیکن ہم نے جب بتانے سے انکار کیا تو اس نے یہ کہہ کر ہمیں رخصت کر دیا کہ دو تین دن بعد تھانے میں آ کر معلوم کرو کہ تمہاری درخواست کا کیا ہوا۔ ممکن ہے وہ تینوں لڑکیاں تھانے گئی ہوں۔ لیکن میں نے پھر کبھی اس علاقے کا رُخ نہیں کیا۔

تھانے سے نکلنے کے بعد میں ان تینوں لڑکیوں سے الگ ہوگئی۔ ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے بھی کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ کراچی میرا دیکھا بھالا شہر تھا۔ میں وہاں سے سیدھی کینٹ اسٹیشن آئی تاکہ کسی ٹرین میں بیٹھ کر حیدرآباد پہنچ جاؤں لیکن اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ ایک تو میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرا میں جاتی بھی کہاں؟ ماں باپ کا گھر اور شوہر کا گھر تو حیدرآباد میں ہی تھا۔ لیکن دونوں کے دروازے مجھ پر بند ہو چکے تھے۔ میں رات تک بھوکی پیاسی اسٹیشن کے ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ رات کو آمد کے ساتھ ہی کچھ شیطانوں نے میرا گھیراؤ کر لیا اور میں ان کے آگے بے بس ہوگئی۔ اس رات کے بعد میں ان شیطانوں کا کھلونا بن گئی۔ میں روز کسی نئے محلے نئے گھر کے چکر کاٹنے لگی۔ میں نے اس دوران میں کئی بار کوششیں کی کہ کوئی 'اللہ کا بندہ' مجھے مستقل طور پر اپنے گھر میں رکھ لے مگر جو بھی ملا اس نے مہینے، پندرہ دن سے زیادہ مجھے برداشت نہیں کیا اور پھر میں کسی نئے گھر کی تلاش میں نکل پڑی۔ اسی طرح دو سال بیت گئے۔ ان دو سالوں نے گزرتے گزرتے مجھ پر اتنے ستم توڑے کہ میری عمر میں دس سال کا اضافہ ہوگیا اور میں نے وقت سے پہلے ہی بڑھاپے کی حدوں کو چھو لیا۔ بڑھاپے نے مجھے کئی عذاب عطا کیے۔ ان میں سے ایک عذاب حصول رزق کا بھی تھا۔ جب نوبت بھیک مانگنے کی آئی تو سوچا کیوں نہ حیدرآباد چلی جاؤں ممکن ہے جمشید مجھے نوکرانی کی حیثیت سے ہی قبول کرنے پر تیار ہو جائیں اس طرح کم از کم میں بیٹے کے قریب تو رہ سکوں گی۔ پھر میں نے اسی پر عمل کیا اور حیدرآباد پہنچ گئی۔ مجھے ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید جمشید مجھے اس حال میں پہچان نہ سکیں۔ ایسی حالت میں میرے لیے وہاں نوکرانی کی حیثیت سے رہنا اور بھی آسان ہوتا۔ مگر میری بدنصیبی کہ جمشید نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے مجھ پر بڑی لعنت ملامت کی اور مجھے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ میں نے بہت التجائیں کیں۔ واسطے دیے اور ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے اپنے گھر میں نوکرانی رکھ لیں۔ لیکن وہ نہیں مانے اور دھمکی دی کہ اگر میں ان کے گھر سے چلی نہ گئی تو وہ مجھ پر کوئی الزام لگا کر گرفتار کرا دیں گے۔ پھر میں نے ان سے التجا کی کہ میں ایک نظر اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ نہیں تم جیسی بدذات عورت کا سایہ بھی میں اپنے بچے پر نہیں پڑنے دوں گا۔ ذلیل عورت! بس اب میری نظروں سے دور ہو جاؤ جاؤ چلی جاؤ۔'' وہ آپے سے باہر ہوگئے۔

اب میں کیسے سمجھاتی کہ میں بے قصور ہوں اور جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار میں نہیں مقتدر تھا۔ وہ انسان کی شکل میں ایک شیطان تھا۔ وہ رحمانی قوتوں کا نہیں شیطانی قوتوں کا مالک تھا۔ وہ سفلی عمل کے ذریعے معصوم عورتوں کی زندگی اور ان کے بنتے بستے گھروں کو برباد کرتا تھا اس نے تمہیں ہی نہیں مجھے بھی برباد کر دیا ہے۔ میں نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ کہنا چاہا مگر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

جب سننے والا کچھ سننے پر آمادہ نہ ہو تو کہنے والا کیا کر سکتا ہے حیدرآباد سے میں پھر کراچی آ گئی اور آج تک یہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ مجھے حیدرآباد سے آئے کئی سال گزر چکے تھے۔ جب میں نئی نئی حیدرآباد سے آئی تھی تو میرے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح مقتدر کو تلاش کرتی پھرتی تھی کہ وہی میری تباہی کا ذمے دار ہے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی۔ وہ مجھے نہ ملا شاید وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھا پھر یوں ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتقام کا یہ جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔ اب میں صرف اپنی موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ کاش میرا یہ انتظار طویل نہ ہو۔

☆☆......☆☆

تیسری مرد کہانی

# کوئی کب تک سہے

منزہ نصیر


اس کہانی میں اُس عام آدمی کا روزنامہ ہے، جس سے ہر شہری روز گزرتا ہے



تھانے کے لاک اپ میں سلاخوں کے پیچھے نظر آنے والے کسی بھی شخص کے بارے میں ایک عام آدمی کا تصور کیا ہوسکتا ہے؟

سرخ آنکھوں اور کرخت چہرے والے عادی مجرم...... زردرو نشئی......

میلے کچیلے غریب لوگ، جن کو پولیس محض خانہ پُری کے لیے پکڑ کر لے آئے اور کچھ پیسے لے کر چھوڑ دے، کوئی اتفاقی یا حادثاتی مجرم......

لیکن فراز عالم جیسا شخص جو شکل وصورت، وضع قطع اور لباس سے اچھے گھر کا معقول اور پڑھا لکھا فرد نظر آتا ہو...... سیدھا سادا عام سا شہری، اس جیسے لوگ آپ کو عام طور پر دفتروں میں میز کے پیچھے، بیوی بچوں کے ساتھ شاپنگ مالز میں، ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے یا چھوٹی سی کار میں فیملی کو لے کر کہیں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ایسے کسی بھی شخص کو لاک اپ میں اس طرح نحس انداز میں بیٹھے دیکھ کر کسی کو بھی اچنبھا ہوسکتا ہے۔

شریف چہرے اور صاف ستھرے لباس والے شخص کا لاک اپ میں ہونا عام آدمی کے احاطۂ خیال سے باہر ہے۔خاص طور پر اس وقت جبکہ آپ کو بتایا جائے کہ اس نے بات مار کر ایک پھل فروش کا سر پھاڑ دیا ہے۔

فراز عالم ایک عام سا شہری ہے۔ ایک نیم سرکاری ہائیر سکینڈری اسکول میں گیارہویں بارہویں جماعت کو مطالعہ پاکستان پڑھاتا ہے۔ ہر مہینے اپنی تمام تنخواہ ایمانداری سے اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ جس میں سے وہ کچھ رقم واپس اُسی کے بٹوے میں ڈال دیتی ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ گھر پر کھاتا ہے۔ پان سگریٹ کی اس کو عادت نہیں ہے، لہٰذا جو کچھ اس کے بٹوے میں ہوتا ہے، اس کی موٹر سائیکل کے پیٹرول اور دیگر ضرورتوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مرحوم باپ کا چھوڑا ہوا گھر، اس کے بیرون ملک مقیم بھائیوں نے اس کے نام کر دیا ہے۔ اب یہی اس کے قانونی وارث ہیں۔

وہ اپنے باپ کی سب سے نالائق اولاد جو ٹھہرا......
جب اس کا بڑا بھائی انجینئرنگ کرنے کے بعد وظیفے پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جا رہا تھا۔ تو فراز عالم سکینڈ ڈویژن میں ایف ایس سی کرنے کے بعد تاریخ اور اسلامیات کے مضامین کے ساتھ بی اے میں داخلہ لے رہا تھا۔ ہر دم نفع نقصان کا حساب کرنے والے اس کے بینکر باپ نے اس کے مستقبل سے شدید مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کو اس کا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اور جب بڑے بھائی نے امریکا میں انجینئرنگ کرنے کے بعد وہیں اپنی پاکستانی کلاس فیلو سے شادی کر لی تو فراز عالم تاریخ میں ماسٹرز کرنے کے بعد نیم سرکاری ہائیر سکینڈری اسکول میں ملازمت حاصل کر چکا تھا۔

گیارہویں بارہویں جماعت کو پڑھانے کی وجہ سے یار دوست اس کو پروفیسر صاحب کہہ کر بلانے لگے تھے۔

دوسرا بھائی بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل ادارے میں اعلیٰ عہدے پر متعین تھا۔ اس کی کمپنی نے اس کو دبئی برانچ میں تعینات کر دیا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دبئی کو سدھارا، اکلوتی چھوٹی بہن فزکس میں ماسٹرز کرنے کے بعد کالج میں پڑھا رہی تھی، جس کی سال بھر پہلے شادی کر دی گئی تھی۔ باپ کے دنیا سے سدھار جانے کے بعد بڑا بھائی ماں کو اپنے ساتھ امریکا لے گیا تھا، سو اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

اس کی بیوی ایک بھلی مانس اور سگھڑ لڑکی ہے۔ اس کی طرف سے سدا فکر مند رہنے والا باپ اکثر اس کی ماں سے کہا کرتا تھا۔ ”اس کی بیوی بہت سمجھدار ہونی چاہیے، عقل مند اور دیکھ بھال کر گھر چلانے والی...... جو کم میں بھی گزارہ کر سکے۔ یہ خود تو بالکل بھی کسی کام کا نہیں ہے۔“ اور اس کی ماں کو یہ تمام خوبیاں رشتے کی ایک بھانجی میں نظر آ گئیں۔

حمیرا اور فراز عالم کی مائیں آپس میں پھوپی زاد بہنیں تھیں۔ حمیرا تین بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ باپ ریلوے میں ملازم اور ماں شوہر کی کمائی میں گھر کے اخراجات ہر صورت میں پورے کرنے والی سگھڑ خاتون تھیں۔ اور یہی تربیت اس نے اپنی بیٹیوں کو بھی دی تھی۔ وہ محدود آمدنی میں بھی بھرم رکھنا جانتی تھیں۔ پرانے کپڑوں کی معمولی کتر بیونت اور تھوڑا بہت کڑھائی اور لیس وغیرہ کا اضافہ کر کے جدید فیشن کے مطابق بنا لیتیں۔ تحفے میں دینے کے لیے اپنے ہاتھ سے عمدہ چیزیں تیار کرتیں۔ آئینے کی طرح دمکتے ہوئے گھر میں لڑکیوں کا سلیقہ منہ سے بولتا تھا۔

آمدنی اور اخراجات میں توازن رکھنا ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ فراز عالم کی ماں نے جب اپنے شوہر کے سامنے اپنی پھوپی زاد بہن صالحہ بیگم کی بیٹی حمیرا کو تجویز کیا تو انہوں نے فوراً سے پہلے منظوری دے دی تھی۔ رہا فراز عالم کا معاملہ تو اس کی اپنی کوئی پسند نہ تھی۔ اپنے باپ کے نزدیک وہ اس کی سب سے نکمی اولاد تھا۔ اس کا ہر کام اس کے بڑے ہی کرتے تھے۔ سب نے فرض کر لیا تھا کہ اگر یہ خود کچھ کرے گا بھی تو یقیناً غلط ہی کرے گا جیسے کہ تاریخ میں ایم اے کرنا...... جینئیس لوگوں کے گھر میں ایسا فیصلہ کرنے والا احمق ہی کہلا سکتا تھا۔

جب اس کی ماں نے شادی کے معاملے میں اس کی رائے طلب کی تو اس نے جل کر کہا تھا۔ ”پتلون تک تو اپنی مرضی کی نہیں پہن سکتا، شادی کے معاملے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔ جہاں مرضی کر دیں۔“ سو اس کو حمیرا کے ساتھ بیاہ دیا گیا تھا۔

فراز عالم میں اپنے بھائیوں بہنوں کی طرح Out Standing نہ ہونے کے علاوہ اگر کوئی خرابی ہے تو محض یہ کہ وہ بہت زیادہ پُر اعتماد نہیں ہے۔ عام حالات میں وہ ایک دھیمے مزاج کا مہذب آدمی ہے۔ اپنی پسند کے مضمون میں ڈگری حاصل کرنے کی وجہ سے اس کو اپنے مضمون پر مکمل عبور حاصل ہے۔ وہ اپنے شاگردوں میں ایک ہر دلعزیز استاد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ حمیرا نے اس کے گھر کو نہایت سلیقے

سے سنبھال کر اس کو ہر قسم کی فکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ شادی کے بعد بھی ویسا ہی تھا، جیسا کہ شادی سے پہلے...... حال مست اور بے فکر...... کبھی وہ اپنی بیوی سے کھانے کی میز پر کہتا۔ ''کریلے نہیں پکائے بہت دنوں سے؟''

''مگر وہ تو گرمیوں میں ہوتے ہیں، یہ تو دسمبر جا رہا ہے۔'' بیگم جواب دیتی۔

''دیکھے تو تھے اس دن Pace پر، جب ہم گروسری کے لیے گئے تھے۔'' وہ حیرت سے کہتا۔

''قیمت بھی دیکھ لیتے! 300 روپے کلو تھے۔ آف سیزن سبزی اتنی ہی مہنگی ہوتی ہے۔'' بیوی متانت سے جواب دیتی، گویا اتنی فضول خرچی مجھے نہیں کرنی۔

اس کے کپڑے، جوتے، ٹائی، جرابیں، رومال، شیونگ کریم، بلیڈ تک خریدنا حمیرا ہی کی ذمے داری ہے۔ کیونکہ وہ ہر معاملے میں لاابالی واقع ہوا ہے۔

حمیرا کا گھر سے چند دن کے لیے چلے جانا غضب ڈھا گیا۔ یہ محض چار دن پہلے کی بات ہے...... حمیرا نے فراز کو صبح ہی بتا دیا تھا کہ آج وہ اپنی خالہ کی عیادت کو جائے گی، جو شہر سے 25 کلومیٹر دور ایک مضافاتی علاقے میں رہتی تھیں۔ طے پایا کہ فراز بچوں کو اسکول سے لا کر کھانا وغیرہ کھلا دے گا اور حمیرا شام تک لوٹ آئے گی۔ سہ پہر کو حمیرا کا فون آیا۔ ''خالہ کا انتقال ہو گیا ہے، اس لیے میں آج گھر نہیں آسکوں گی۔'' فراز عالم نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جنازہ لے جانے کا وقت دریافت کیا تو حمیرا نے بتایا۔

''نوی بھائی کے کینیڈا سے آنے کے بعد ہی تدفین ہوگی۔ میت اسپتال کے سرد خانے میں رکھوا دی گئی ہے۔ میں آج امی کی طرف رُک جاؤں گی۔''

فراز عالم یہ سُن کر چکرا سا گیا۔ ''مگر گھر...... بچے کون سنبھالے گا۔ اگر تمہیں ایک دو دن اور لگ گئے تو؟'' وہ بوکھلایا ہوا پوچھ رہا تھا۔ ''توبہ ہے فراز...... نو اور سات سال کے بچے اتنے چھوٹے نہیں ہوتے، تمہیں بھی کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ تہمی ناشتا بنا لیتی ہے، چاول اُبال لیتی ہے، بس تم صبح گھر لاک کر کے چابی پڑوس میں دے دینا۔ میں ابھی ملازمہ کو فون کر دیتی ہوں۔ وہ چابی لے کر گھر کی صفائی کر کے سالن بھی بنا جائے گی۔ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' حمیرا نے مسئلے کا حل بتاتے ہوئے کہا اور اسے شانت رہنے پر آمادہ کرنا چاہتا۔

مگر مسئلہ تو بہر حال تھا۔ وہ حمیرا کا عادی ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی فون پر پوچھتا۔ حمیرا کی ہدایات جاری رہتیں۔ ''تنخواہ مل گئی؟ الماری میں میرا کالا بیگ رکھا ہے، اس میں رکھ دینا اور ہاں اپنا جیب خرچ نکال لینا۔''

''یوٹیلٹی بلز کچن میں دائیں سے پہلی کیبنٹ میں رکھے ہیں، ادا کر دینا، کہیں سرچارج نہ پڑ جائے۔''

''عذرا کی تنخواہ دے دینا۔''

''بچوں کے فیس واؤچر بھی بلز کے ساتھ رکھے ہیں۔ فیس Pay کر دینا۔'' وہ جھلا جاتا۔

''سب کچھ ہو جائے گا میڈم! آپ وہیں تشریف رکھیے اور گھر کو ریموٹ کنٹرول سے چلاتی رہیے۔ کوئی بات نہیں، گھر ہی تو ہے۔ آج کل تو ملک ریموٹ کنٹرول سے چلائے جا رہے ہیں۔'' وہ جھلاہٹ میں آپ جناب کرنے لگتا۔

''اگر آپ قدم رنجہ فرما لیتیں گھر پر تو کون سی قیامت آجاتی۔ جنازے کے لیے دوبارہ چلے جاتے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتا۔'' اس نے انتہائی ترش رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے فراز، اتنے عرصے کے بعد تو آئی ہوں۔ خالہ کی تعزیت کو لوگ آ رہے ہیں۔ کئی کزنز سے تو ملاقات ہی سالوں بعد ہوئی ہے۔'' حمیرا نے اپنا سلیقہ تہمی میں منتقل کرنے کی ابتداء کر دی تھی۔ اس کا اندازہ فراز کو ہو گیا تھا، لیکن نو سال کی بچی کی حیثیت ہی کیا تھی۔ بے نظم گھر اس کی طبیعت پر گراں گزرنے لگا۔ تنہائی اور گھر کی بے نظمی فراز کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کرنے لگی تھیں۔

کل ہی کی بات ہے وہ بچوں کے لیے کچھ اسٹیشنری خرید کر مارکیٹ کی پارکنگ میں آیا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا ہی چاہتا تھا کہ پاس کھڑی گاڑی سے نکلتے شخص کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ شخص بھی گاڑی کا دروازہ لاک کر کے اس کی طرف لپکا۔ ''فراز!''

''اوہ وقاص!'' دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا اور وہ گرمجوشی سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ دونوں ایف ایس سی تک ساتھ پڑھتے رہے تھے اور اب ایک عرصے کے بعد ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش تھے۔

''موٹر سائیکل ادھر ہی پارک کر کے میرے ساتھ آجاؤ، کہیں بیٹھ کر حال احوال کرتے ہیں۔'' وقاص کی پیش کش

قبول کرتے ہوئے اس نے موٹر سائیکل پارکنگ میں چھوڑی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شہر کے پوش ایریا کے ایک ریسٹورنٹ میں وقاص نے گاڑی روک دی۔

وہ ایک مہنگا ریسٹورنٹ تھا۔ پچھلے سال جب فراز کا دبئی میں مقیم بھائی پاکستان آیا تھا، تو اس نے اپنے بیٹے کی برتھ ڈے پارٹی اسی ریسٹورنٹ میں دی تھی۔ وقاص پانچ سال بعد کینیڈا سے آیا تھا اور بچپن کے دوست کے اس طرح اچانک مل جانے پر بے حد مسرور تھا۔ خوش تو فراز بھی بہت تھا لیکن خوشی پر اوس اس وقت پڑی جب بیرے نے مخملیں جلد والی فائل میں بل لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ رقم اس کے مہینے بھر کے جیب خرچ کے برابر تھی اور وقاص نے رسماً بھی بل ادا کرنے کی پیش کش نہیں کی تھی۔

بھاری بل ادا کرنے کے بعد اس سے بھی بھاری دل لیے وہ گھر پہنچا تھا۔ فہمی اور نوفل کے درمیان غالباً روز کا معرکہ ہوا تھا۔ دونوں منہ بسورتے ہوئے ایک دوسرے کی شکایت لگانے لگے تو اس کا دل چاہا کہ دونوں کو ایک ایک جھانپڑ رسید کر دے، بدقت اس نے خود پر قابو پایا، کیوں کہ ریسٹورنٹ کا بل ادا کرنے کے بعد اس کا دل خود بے قابو ہو گیا تھا اور وہ اس وقت کو کوس رہا تھا، جب وقاص اسے ملا تھا اور اس سے بھی افسوس اسے وہاں جانے اور چائے پینے کا ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ وہاں جانے سے اس سے معذرت کر لیتا تو کم از کم اس کا دل تو قابو میں رہتا۔ اب...... ''فہمی تمہیں خیال ہونا چاہیے۔ چھوٹے بھائی کا۔ پیار سے پیش آنے کی بجائے اس سے لڑتی ہو۔ پتا بھی ہے کہ ماما گھر پر نہیں ہیں۔ اور نوفل تم بڑی بہن سے بدتمیزی کرتے ہو، شرم نہیں آتی تمہیں۔ کچھ تو سوچو کہ گھر میں صرف تم دو افراد ہو اس کے باوجود امن سے نہیں رہ سکتے۔''

''سوری بابا! دونوں بچے سہم گئے۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔'' وہ تنبیہی انداز سے بولا اور شاپران کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ تم دونوں کی چیزیں ہیں، اپنا اپنا سامان لے لو اور جاؤ اپنے کمرے میں۔''

کمرے میں آ کر وہ کپڑے بدلے بغیر ہی بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور دیر تک اپنے بارے میں سوچتا رہا۔

'کیا واقعی میں ایک ناکام آدمی ہوں۔ ابھی مہینے کا شروع ہے اور تنخواہ کا لفافہ کتنا ہلکا ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں حمیرا کس طرح پورا مہینہ گھر چلاتی ہے۔ ابا ٹھیک ہی فکر مند رہتے تھے۔ میرے بارے میں' اس کو مرحوم باپ کی بے طرح یاد آنے لگی۔

'اور میری بہن زریں، میرے برابر ہی تنخواہ ہے اس کی، لیکن اے لیول کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنے ڈاکٹر شوہر سے بھی زیادہ کما رہی ہے۔ میرے مضمون کی تو کوئی ٹیوشن بھی نہیں پڑھتا۔ فراز عالم تم واقعی اپنے لیے کچھ بھی اچھا نہ کر سکے۔' وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔

گھنٹی بجنے پر فون اٹھایا تو سی ایل آئی پر زرین کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا، پژمردگی میں کمی آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''السلام وعلیکم بھائی کیسے ہیں آپ؟'' بہن کی آواز اس وقت اس کو بہتے پانی کے جھرنوں جیسی لگی، جب اس نے اگلے دن کے پلان کے بارے میں بات کی۔

''کل چھٹی ہے میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ عصر کے بعد بھابی کی خالہ کا جنازہ ہے، میں آپ اور بچے تعزیت کو جائیں گے اور واپسی پر بھابی ہمارے ساتھ ہی آ جائیں گی۔ میں دو دن آپ کی طرف رہوں گی۔''

فراز عالم کے تھکے ہوئے اعصاب سکون پانے لگے اور وہ ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے حمیرا کا نمبر ملانے لگا۔

حمیرا زرین کے آنے کا سُن کر خوش ہو گئی۔ حسب سابق ہدایات جاری کر دیں۔

''عذرا سے کہنا کہ گھر کی صفائی اچھی طرح کر دے اور آپ صبح مٹن، بون لیس چکن اور فروٹس لا کر فریج میں رکھ دینا۔'' اس نے ہر چیز کی مقدار بھی بتائی۔ ''زرین کون سا روز روز آتی ہے۔ وہ دو دن یہاں رہے گی۔ میں اس کی پسند کی ڈشز بناؤں گی۔''

زرین کے میکے میں صرف فراز ہی تو پاکستان میں مقیم تھا، لہٰذا حمیرا میکے کا کردار بحسن وخوبی نبھاتی تھی۔

آج صبح وہ نسبتاً پُرسکون تھا، گو کہ رات کی تلخی ذہن میں ابھی باقی تھی، مگر یہ خیال ہی اس کے لیے خوش کن تھا کہ آج حمیرا آ جائے گی اور گھر سنبھال لے گی۔ بچے اپنی ماں اور پھوپو کو پا کر نہال ہو جائیں گے اور وہ خود پہلے کی

سی زندگی میں لوٹ جائے گا، آزاد اور بے فکر...... لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آج اس کی قسمت میں آزادی اور بے فکری نہیں تھانے کالاک اپ ہے۔

تنخواہ کے لفافے میں سے کچھ رقم اپنے والٹ میں منتقل کرتے ہوئے اس کی طبیعت ایک بار پھر مکدر ہوگئی۔ بقیا رقم گننے کی اس کو ہمت نہ ہوئی۔ لفافے کا وزن اپنی حیثیت خود بیان کررہا تھا۔ اُلجھے ذہن اور منتشر سوچوں کے ساتھ اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔

چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے قصاب کی دکان پر خاصا رش تھا۔ گاہک آرڈر نوٹ کرواتے اور بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگتے۔ گوشت تیار ہونے پر شاپر پکڑتے، ادائیگی کرتے اور باہر نکل جاتے۔ اکثر آرڈر اسی قسم کے ہوتے۔

ایک ران، ایک دستی 2 کلو قیمہ۔

دو ران، پٹھ اور چانپ، ایسے میں دو کلو گوشت کا آرڈر نوٹ کرواتے ہوئے وہ خفیف سا ہوگیا۔ قصاب نے باری آنے پر گوشت تیار کر کے اس کو تھما دیا۔ ''باجی نہیں آئیں خیریت تو ہے؟'' قصاب نے پوچھا۔

''میکے گئی ہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیتے ہوئے ایک ہزار کا نوٹ بڑھایا اور بقایا کا انتظار کرنے لگا۔

''دو کلو گوشت ہے پروفیسر صاحب! 400 روپے اور دیجیے۔''

''کیا؟'' وہ حیرت زدہ سا قصاب کا منہ دیکھنے لگا۔

''700 روپے کلو گوشت ہے، باجی اسی ریٹ سے لے کر جاتی ہیں، شاید انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔'' اس نے چپ چاپ 400 روپے اور بڑھا دیے۔

''شکریہ پروفیسر صاحب!'' قصائی نے روپے دیتے ہوئے کہا۔ جانے کیوں اس کو 'پروفیسر صاحب' کا لقب اس وقت بے حد طنزیہ محسوس ہوا۔ وہ یوں محسوس کررہا تھا جیسے اس کو پروفیسرز پر بنائے گئے کسی لطیفے کا کردار سمجھا جارہا ہو، جو اس باختہ اور بھلکڑ!

بے حد بُرے موڈ کے ساتھ وہ گھر پہنچا۔ گوشت کا لفافہ فریج میں رکھا، والٹ میں مزید کچھ رقم ڈالی اور حمیرا کی بتائی ہوئی باقی چیزیں لینے کے لیے دوبارہ بازار کا رُخ کیا۔ وہ بہت بددل ہورہا تھا۔

وہ چکن خرید چکا تھا۔ دوکاندار نے جتنے پیسے بتائے، اس نے بلا چون و چرا ادا کردیے تھے۔ اب والٹ میں بہت تھوڑی رقم بچی تھی اور اب وہ پھل فروش کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''سیب کیسے دیے؟'' اس نے پہلے سے قیمت پوچھ لینا ضروری سمجھا۔

''150 روپے کلو!'' پھل فروش لاپروائی سے جواب دے کر ایک لمبی چمکتی ہوئی کار کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ اور کار میں سے برآمد ہونے والے صاحب بغیر ریٹ پوچھے پھل تلوا رہے تھے۔

''ان سیٹھ لوگوں نے دماغ خراب کردیے ہیں، دکانداروں کے!'' اس نے جل کر سوچا۔

''انگور کیا بھاؤ ہیں؟'' اس دفعہ دکاندار نے جواب تک دینا گوارہ نہ کیا اور بدستور سیٹھ صاحب کے سامنے ریشہ خطمی ہوتا رہا۔

اب فراز عالم کے دل کی جلن نے دماغ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور انتہائی طور پر تنور بن چکے تھے۔

''او بھائی میں انگور کے ریٹ پوچھ رہا ہوں۔''

''300 روپے کلو ہیں بابو صاحب۔'' نجانے دکاندار کا لہجہ واقعی تحقیر آمیز تھا یا فراز عالم کو ایسا لگا۔

اس کا جی چاہا کہ اس کی ناک پر ایسا گھونسہ رسید کرے کہ بس...... ''یار! ریٹ ذرا کم لگاؤ۔'' وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں بُری طرح ناکام ہورہا تھا۔

''ہمارا پھل Selected ہوتا ہے بابو صاحب اور گاہک بھی خاص ہوتے ہیں۔ لینا ہے تو لیں، ورنہ ہمارا اور اپنا وقت خراب نہ کریں۔''

تضحیک کے اس احساس نے دل و دماغ میں دہکتے ہوئے شعلوں کو اور ہوا دے دی، بے اختیار اس کا ہاتھ آدھے کلو کے باٹ پر جا پڑا اور پھر باٹ اس کے ہاتھ سے ہوکر اُڑتا ہوا دکاندار کے سر سے ٹکرا گیا۔

اس وقت قریب سے گزرتی ہوئی موبائل میں مستعد پولیس والے کود کر باہر نکلے اور فراز عالم کو پکڑ کر موبائل میں ڈالا۔ پھر کیا تھا۔ فراز عالم لاک اپ میں اور دکاندار اسپتال پہنچ چکا تھا۔ اب آپ اس آدمی کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

☆☆......☆☆

ناول

کاشی چوہان

# زہرِ عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور، عشق کی ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

## اسرار کی نئی دنیا میں لے جانے والے، پُراسرار سلسلے کی پانچویں قسط

صنوبر کو ایسا لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن اچانک بہت تیز ہوگئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی اور زور زور سے ہانپنے لگی۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا صرف صنوبر کو ہی نہیں سلمان کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔ اسے کون سا انسانوں کے اندر تحلیل ہونے کا کوئی تجربہ تھا۔ وہ تو اپنی محبت، اپنی صنوبر سے قریب رہنے کے لیے مجبوراً اس شیطانی کام پر خود کو راضی کر پایا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا اگر یہ بات اس کے باپ ابراہیم اور اس کے قبیلے والوں کو معلوم ہوگئی تو اس کا جینا دوبھر ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے موت کی سزا دے دی جائے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اپنی محبت کی زندگی کے لیے صنوبر سے قریب ہوا تھا اور یہ راستا اس کی اپنی موت سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ صنوبر کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر وہ مسلسل پریشان ہو رہا تھا۔ اور اب پریشان ہونے کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ یہاں بیٹھ کر تو اسے یہ بھی ٹھیک سے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے ہم شکل سلمان سے بھی کوئی رابطہ رکھ سکے گا یا نہیں......

صنوبر مسلسل بے چینی محسوس کر رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ اسے ابکائیاں آنے لگیں مگر چاہتے ہوئے بھی وہ قے نہیں کر سکی۔ اسے ہر تھوڑی دیر بعد ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے الٹیاں ہونے والی ہیں لیکن جب وہ الٹی کرنے کے لیے واش روم میں جاتی تو اسے الٹی نہیں ہوتی تھی بس یہی کیفیت طاری رہتی اور اس کا جی متلی کھانے لگتا۔ اسی کیفیت میں اسے ایک دم سے بڑی بڑی ڈکاریں آنے لگیں اور وہ عجیب سی آوازیں نکالتی ہوئی بڑی مشکل سے اپنی ماں درشہوار کے کمرے تک پہنچ گئی اس وقت درشہوار اور اس کا شوہر آصف دونوں چین کی نیند سو رہے تھے۔ صنوبر سلمان کریم اپنے بھائی کے کمرے کے پاس سے بھی گزری تھی مگر سلمان کریم اب بھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوا تھا اس لیے دواؤں کا اثر اسے گہری نیند میں لے جاتا تھا اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ عین اس کے برابر والے کمرے میں اس کی بہن کی کیا حالت ہے۔

صنوبر نے اسی گرتے پڑتے انداز میں اپنے ماں باپ کا دروازہ بجایا تو آصف کی آنکھ درشہوار سے بھی پہلے کھلی وہ شاید اچاٹ نیند سونے کا عادی تھا۔ اسے ایک عجیب جانور کی سی آواز دروازے کے باہر سے سنائی دی۔ اور اسے ایک دم سے غصہ آنے لگا اس نے درشہوار کو جگایا اور بولا۔

''اٹھو تمہارا کوئی جانور ہے جو رات کے اس وقت میری نیند خراب کرنے آیا ہے۔''



درشہوار بیدار ہوئی اور حیرت سے آصف کی طرف دیکھنے لگی جو پھر سے سونے کے لیے لیٹ کر اسی موڈ میں سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

درشہوار کی فوری طور پر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کا کون سا پالتو جانور ہے جو رات کے اس تیسرے پہر میں اس کے دروازے پر یوں مچل رہا ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے پاس اب کوئی جانور نہیں تھا۔ ٹینو تو کب کا جا چکا تھا اور اسے تو اس نے خود جانے کو کہا تھا۔

''تو کیا ٹینو واپس آ گیا؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے سے زیادہ وقفے میں نہیں سوچا گیا تھا اور پھر درشہوار کو دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ ایک دم اچھل کر بیڈ سے نیچے اتری کیونکہ یہ دستک کی آواز کسی جانور کے کھروں سے نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں کی تھی۔

وہ بے خیالی میں بولی'' یہ جانور نہیں ہے شاید سلمان ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے شاید'' یہ سنتے ہی آصف بھی بیڈ سے نیچے اتر آیا اور جب درشہوار نے دروازہ کھولا تو سامنے صنوبر کو فرش پر بے حالی سے بیٹھے دیکھ کر اس کی تو چیخ ہی نکل گئی۔ آصف بھی گھبرا گیا دونوں نے جلدی سے صنوبر کو تھاما اور اس سے پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے صنوبر، کیا ہوا ہے مائی چائلڈ؟'' صنوبر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا اور بولنے کی کوشش بھی کی لیکن بول نہیں سکی جیسے اس کا گلا اندر سے کسی نے پکڑ لیا ہو۔ وہ بس نرخرے سے عجیب عجیب آوازیں نکالتی رہی۔

''آصف اسے کیا ہوا ہے... یہ تو بول بھی نہیں پا رہی'' اتنا کہہ کر درشہوار کو اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔

''میری بچی یہ کیا ہو گیا تم بول کیوں نہیں پا رہیں۔'' آصف نے بھی صنوبر کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اسے بھی جواب کوئی نہیں ملا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''اسے کمرے میں لٹاتے ہیں۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔ ہمیں فوراً ہوسپٹل جانا ہوگا۔''

''ہوسپٹل!'' درشہوار یہ سنتے ہی پہلے سے زیادہ پریشان ہو گئی اور پھر آصف نے اپنی بیٹی کو گود میں اٹھا کر اپنے بستر پر لٹایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''پریشان ہونے کی بات نہیں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور اس نے اس کے بعد وقت ضائع کرنے کے بجائے فوری طور پر کپڑے چینج کیے اور گاڑی نکالنے گیراج کی طرف چلا گیا۔

درشہوار پریشانی سے صنوبر کے ہاتھ سہلاتی رہی اور اس کا چہرہ چومتی رہی دل ہی دل میں پریشانی سے دعائیں مانگتی رہی۔ دل کا ایک حصہ خود سے یہ سوال بھی بار بار کر رہا تھا کہ یہ اچانک ایسا کیا ہوا کہ صنوبر بات تک نہیں کر پا رہی اور اس کی ابکائیاں بھی بدستور آئے جا رہی ہیں۔ الٹی ہوتی نہیں اور ابکائی اور ڈکار آ کے غائب ہو جاتے ہیں۔ درشہوار کا ذہن مسلسل سوچتا رہا لیکن وہ یہ نہ جان سکی کہ آخر صنوبر کو کیا ہوا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ، آصف کریم اور صنوبر ہوسپٹل کی ایمرجنسی میں تھے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر صنوبر کا چیک اپ کر رہا تھا اور قریب آدھے سے ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر نے جب درشہوار اور آصف سے یہ کہا کہ بظاہر کوئی ایسی بات، کوئی ایسا بیماری دکھائی نہیں دے رہی جس کا علاج شروع کیا جا سکے۔ البتہ صنوبر کی کیفیت بتا رہی ہے کہ کچھ ہے ضرور... افسوس کہ اس وقت اس ''کچھ'' تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو ان کے ٹیسٹ کروانا ہوں گے۔''

''تو آپ اسے ہوسپٹل میں داخل کرنا چاہیں گے تاکہ کل صبح سے ہی ٹیسٹ شروع کیے جا سکیں؟''

آصف نے درمیان سے ڈاکٹر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر یہ سن کر کچھ لمحے سوچ میں چلا گیا اور پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی اور یوں صنوبر کو ہوسپٹل میں داخل کر لیا گیا۔ درشہوار اس کے ساتھ ہی رک گئی، جانا تو آصف بھی نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا جانا ضروری تھا کہ وہ ملازموں کو اور سلمان کو ضروری ہدایات دے سکے۔ اسے اپنے آفس بھی جانا ہوتا تھا اس نے سوچا آفس سے ہو کر جلد ہوسپٹل آ جائے گا۔ یہ بات لکھنے کی ضرورت نہیں کہ آصف

اپنی بیٹی سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے بیٹے سلمان سے بھی زیادہ اور اپنے بچوں کی مشکلات کا ذمہ دار وہ اپنی بیوی درشہوار کو سمجھتا ہے۔ صنوبر کی بیماری ایسی پراسرار اور پوشیدہ نہ ہوتی تو وہ اس کا ذمہ دار بھی درشہوار کو سمجھتا اور اسے کھری کھری سناتا لیکن اس وقت وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکا یوں بھی رات کو صنوبر ان کے پاس سے اچھے موڈ میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تھی اور اس وقت اس کی طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ صنوبر کو اس طرح کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ اس کی زبان گنگ ہو سکتی ہے اور اس سب کے بعد جو سب سے حیران کر دینے والی بات تھی



آصف کے لیے وہ یہ کہ ڈاکٹر کے مطابق صنوبر کی کیفیت بظاہر پریشان کن ہے لیکن صنوبر کے جسم میں ظاہری طور پر نہ بخار ہے، نزلہ کھانسی اور ایسی کسی بیماری کی علامات نہیں ہیں جن کو وجہ بنا کر اس کا علاج شروع کیا جا سکے۔

☆......☆......☆

آصف گھر پہنچا اور اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا کہ آخر صنوبر کو کیا ہوا ہے۔ اسے کیا روگ لگ گیا۔ ایک لمحے کو اس نے یہ بھی سوچا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ کچھ ایسا تو نہیں ہوا جسے وہ بتانے سے ڈر رہی ہو اور اسی لیے اس نے نہ بولنے کا ڈراما کیا ہو۔ ایسا اس کی مرضی سے ہوا ہے یا وہ چڑھے ہوئے لمحے میں خود کو روک نہیں سکی اور بہک گئی۔ تو کیا یہ ابکائیاں اور الٹیاں اس لیے ہیں کہ صنوبر ماں بننے والی ہے۔ بنا شادی کے ایک کنواری ماں......

یہ سوچتے ہی آصف کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی اور اس کے دل کی رفتار میں یکا یک تیزی آ گئی۔ اسے کسی حد تک یقین ہو گیا کہ صبح جب ڈاکٹرز اس کے ٹیسٹ کرائیں گے تو اسے یہی منحوس خبر ملنے والی ہے کہ صنوبر بنا شادی کے ماں بننے والی ہے۔

اسی لمحے میں اسے بہت زور سے درشہوار پر غصہ آیا کہ اس عورت کی وجہ سے میرے دونوں بچے رل گئے ہیں۔ اسے تو اپنی کٹی پارٹیوں سے ہی فرصت نہیں ہے جب دیکھو یہ اپنی ہی شخصیت کے گرد طواف کر رہی ہوتی ہے۔ بچوں کی طرف سے پوری طرح غافل یہ ایک غیر ذمہ دار عورت اور ماں ہے۔ آصف اپنے ہی تراشے ہوئے تصور کو مزید تقویت دیتا رہا اور درشہوار کو کوسنے کے ساتھ ساتھ خود کو اس خبر کے لیے تیار بھی کرتا رہا کہ جب کل ڈاکٹر اسے یہ خبر سنائیں گے تو اسے کیا ری ایکٹ کرنا ہے۔ صنوبر کے سامنے جا کر کیا کہنا ہے اور درشہوار سے کیسے نمٹنا ہے۔ اسی لمحے اسے سلیمان کا خیال آیا اور وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے سلمیٰ ملی، سب سے جلدی سلمیٰ ہی تھی جو بیدار ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سلمیٰ کو ناشتا بنانا ہوتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شاید کہیں دور سے آتی تھی اور کہنے پر بھی اس نے یہ بات نہیں مانی تھی کہ وہ کوٹھی میں ہی اپنی رہائش کا بندوبست کر لے۔ اس کے کچھ مسائل تھے اس لیے اس نے کچھ عرصے کی مہلت مانگتے ہوئے۔ فی الحال کوٹھی میں رہنے سے معذرت کر لی تھی۔ صبح سویرے کوٹھی کے سب نوکروں سے پہلے آ کر وہ یہ ثابت کر دیتی تھی کہ ایمانداری سے کام کرنے کے لیے شاگرد پیشے میں رہنا ضروری نہیں تھا۔ البتہ رات کو جب وہ آٹھ بجے سے پہلے جانے کی اجازت مانگا کرتی تھی تو درشہوار کو اس پر اعتراض ہوتا تھا۔ اگر رات کو بھی وہ دیر تک رک سکتی تو شاید اس کے آ کر چلے جانے پر کسی کو کوئی پرابلم نہیں ہوتی۔ کئی دفعہ تو وہ دوپہر میں بھی چھٹی لے کر چلی جاتی تھی۔ سلمیٰ کی ان سب باتوں کو برداشت کرنے کی سب سے بڑی وجہ تو اس کی ذمہ داری سے اپنے فرائض کی تکمیل کرنا تھی اور دوسری وجہ اس کا ایماندار ہونا تھا۔ یہ دونوں خوبیاں دنیا کے جس بھی ملازم میں ہوں، سمجھو اس سے بہتر ملازم اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آصف کو بھی طویل عرصے سے یہ بات معلوم تھی کہ درشہوار سے زیادہ اس گھر کو سلمیٰ کی ضرورت تھی۔ وہ ہی تھی جو اس کے دونوں بچوں کے ٹائم ٹیبل کا دھیان رکھا کرتی تھی۔

سیڑھیوں کے پاس آصف کو اوپر جاتی ہوئی سلمیٰ ملی اور سلمیٰ آصف کو اتنی صبح بیدار دیکھ کر ایک دم ہی جیسے بری طرح ڈر گئی۔ عام طور پر آصف اس سے اور گھر کے نوکروں سے کم ہی بات کرتا تھا لیکن اس وقت سلمیٰ کی حیرانی دوچند ہو گئی جب آصف نے اسے روک کر اس سے بات کی۔

''سلمیٰ اوپر کوئی نہیں ہے۔ درشہوار ہوسپٹل میں ہے۔''

''ہوسپٹل میں اللہ خیر.... کیا ہوا ہے انھیں صاحب جی؟'' سلمیٰ نے جلدی سے پوچھا۔

''اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ صنوبر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ یوں کرو سب کام چھوڑ کے جلدی سے ناشتا بنا دو۔ میں ہوسپٹل دیتا ہوا جاؤں گا۔''

''صنوبر بی بی کو کیا ہوا ہے صاحب جی؟'' سلمیٰ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آصف جانتا تھا سلمیٰ صنوبر کو بہت چاہتی تھی اور صنوبر بھی سلمیٰ کا گھر کے باقی نوکروں کے مقابلے میں زیادہ خیال رکھتی تھی اس لیے دونوں کی یگانگت کا ہونا فطری بات

تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ سلمیٰ صنوبر کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بے چین ہو چکی ہے اور یہ جاننا چاہتی ہے کہ آخر صنوبر کو ہوا کیا ہے وہ تو کل تک بالکل ٹھیک تھی۔

''ابھی کچھ پتا نہیں چل سکا ڈاکٹرز ضروری ٹیسٹ کرنے کے بعد ہی کچھ بتا سکیں گے۔ آپ ناشتا تیار کرلو میں تب تک سلمان کو دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر آصف نیچے سلمان کے کمرے کی طرف چلا گیا اور اوپر جاتی ہوئی سلمیٰ بھی نیچے کچن کی طرف لوٹ آئی۔ آصف سلمان کے کمرے میں پہنچا تو وہ اوندھا اور بے خبر سو رہا تھا۔ آصف نے جب اسے جگایا تو سلمان کے لیے بھی یہ واقعہ کسی حیرت ناک منظر سے کم نہیں تھا آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ آصف نے سلمان کو اس کے کمرے میں آکر جاگنے کو کہا ہو۔

''پاپا آپ!! کیا بات ہے؟'' سلمان کی گہری نیند یکلخت غائب ہوگئی۔ آصف چاہتے ہوئے بھی اپنی پریشانی کو چھپا نہیں سکا اور بولا۔

''رات کو صنوبر کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ تمہاری ماما اور صنوبر اس وقت ہوسپٹل میں ہیں۔''

''کیا.....!! کیسے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ صنوبر کو کیا ہوا ہے؟ کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھی؟'' یہی وہ سوال تھے جو گھر کے ہر فرد کے ذہنوں سے نکل کر زبان پر آ رہے تھے۔

''پتا نہیں... کیا ہوا ہے... ابھی کچھ نہیں بتایا ڈاکٹرز نے۔ اس کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہوں گے اس کے بعد ہی پتا چل سکے گا کہ اسے کیا ہوا ہے!'' آصف کا جواب سن کر سلمان کا ذہن جیسے صاف ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اب اور کیا پوچھے۔ اس نے اپنے باپ کے بے پناہ خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا تو اس کا دل ایک دم ہی بھینچ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کا باپ اپنی بیٹی کو بیٹے سے زیادہ چاہتا ہے لیکن اس بات کو سلمان کچھ اور ہی معنی دیا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ صنوبر کو اس لیے زیادہ چاہتا ہے کیونکہ وہ اسی کی طرح خوبصورت ہے اور وہ سلمان اتنا خوبصورت نہیں ہے اسی لیے سلمان مارے حسد کے اپنے باپ کی صورت کی طرف کبھی نہیں دیکھتا تھا بے خیالی میں اس کی نظر پڑ بھی جاتی کبھی تو اسے اپنے باپ کی خوبصورتی سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ سلمان جوان تھا اور انسان کی زندگی میں خوبصورت نظر آنے کی جو عمر ہوا کرتی ہے یعنی بیس سے تیس سال سلمان اسی عمر کے قریب سے گزر رہا تھا اس کے باوجود اس کا ادھیڑ عمر باپ اس سے زیادہ حسین اور خوبصورت نظر آتا تھا اور کئی باتوں کے علاوہ سلمان کو اس بات نے بھی چڑچڑا اور مغرور بنا دیا تھا۔ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتا تھا لیکن اسے صنوبر سے کسی قسم کی کوئی نفرت نہیں تھی۔ ویسے بھی صنوبر اس کا اتنا خیال رکھتی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے بھی نفرت نہیں کرسکا۔ اس لیے صنوبر کی طبیعت کا سن کر وہ بھی فکر مند ہو گیا تھا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا پاپا'' سلمان نے کہا تو آصف نے اس کی طرف قدرے اجنبیت سے دیکھا۔ اس کا خود غرض بیٹا صنوبر کے معاملے میں اپنی تکلیف بھول کر بے چین ہو چکا تھا۔

''لیکن تمہاری تو طبیعت.....؟''

''نہیں... نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں... اس وقت مجھے جانا ہی ہوگا۔ میں صنوبر کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے کیا ہوا ہے میں جاننا چاہتا ہوں'' سلمان نے آصف کی بات درمیان سے کاٹ کر کہا تو آصف کو یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں کچھ دیر کے لیے آفس جانا چاہتا ہوں۔ تم ہوسپٹل میں رہو گے تو تمہاری ماما اور صنوبر کو تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تم ان کی مدد کرسکو گے۔'' سلمان نے یہ سن کر اثبات میں سر ہلایا۔ حالانکہ اسے اپنی ماں سے کوئی محبت اور دلچسپی نہیں تھی اگر صنوبر کی جگہ اس کی ماں در شہوار ہوسپٹل میں ہوتی تو وہ کبھی اس طرح اپنی بیماری کو بھول کر ہوسپٹل جانے پر تیار نہ ہوتا...

کچھ دیر بعد دونوں باپ بیٹا ہوسپٹل چلنے کو تیار ہوگئے... ڈرائیور کو بھی انھوں نے دوسری گاڑی میں ساتھ لے لیا۔ یہ گاڑی سلمان کی تھی۔ سلمان اپنے باپ کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلنے کو تیار ہوگئیں۔

☆......☆......☆

ہوسپٹل پہنچ کر آصف اور سلمان ایک ساتھ اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوئے جس میں صنوبر لیٹی ہوئی تھی اور در شہوار اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھی ہوئی پریشانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آصف اور سلمان کو دیکھ کر کمزور پڑتی ہوئی در شہوار میں ایک نئی توانائی آ گئی۔ سلمان جلدی سے صنوبر کے قریب پہنچا وہ اس وقت نیند کے انجیکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔ سلمان نے صنوبر کو عجلت سے دیکھا اور بنا ارادہ اپنی ماں سے پوچھ بیٹھا۔

''کیا ہوا ہے صنوبر کو؟'' در شہوار کا سلمان کا یوں بہن کے لیے بے چین اور پریشان ہونا بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔

''اس کے ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔ کوئی دو گھنٹے تک اس کے رزلٹ آئیں گے۔ تب ہی پتا چل سکے گا کہ کیا بیماری ہے'' آصف نے خاموشی سے یہ بات سنی اور آگے بڑھ کر سوئی ہوئی صنوبر کے ماتھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سلمان سے کہا۔

''فکر مت کرو سب ٹھیک ہوگا۔''

''اسے ہوا کیا تھا۔ آپ لوگ یہ کیوں نہیں بتا رہے؟'' سلمان کو جیسے غصہ آ گیا۔

''یہ بتانا بہت مشکل ہے بیٹے... کہ اسے کیا ہوا تھا۔ نہ تو یہ بخار تھا نہ کوئی اور بیماری، ڈاکٹر نے ایمرجنسی میں چیک اپ کرنے کے بعد بھی کسی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، وہ بات نہیں کر پا رہی تھی اور کسی ایسی تکلیف میں مبتلا تھی جس کے بارے میں ہم میں سے کوئی کچھ نہیں جانتا۔ تو پھر تمہیں کیا بتایا جائے۔''

در شہوار نے کہا تو سلمان کو سن کر اور حیرت ہوئی اور اس کی پریشانی میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔ وہ راستے بھر اپنے باپ سے صنوبر کی بیماری کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا اور یہ کہہ کر سلمان کو خاموش کرا دیا تھا کہ ہوسپٹل پہنچ کر اپنی ماما سے پوچھ لینا۔

ٹینو والے واقعے کے بعد سے سلمان کو اپنی ماں سے پہلے سے زیادہ نفرت ہو چکی تھی اور وہ ان حالات میں بھی اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب آصف نے اس طرح کی بات کہی تو وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ ضرور کوئی ایسی بیماری ہے جس کا تعلق عورتوں سے ہے اسی لیے اس کا باپ کچھ بتانے سے قاصر ہے لیکن اب جو اس کی ماں نے اس سے کہا تو وہ مزید فکر مند ہو گیا یعنی صنوبر کی بیماری کا ہی پتا نہیں چل رہا۔

یہ کیا کوئی خفیہ بیماری ہے یا پھر دنیا کو کسی نئی بیماری کا پتا چلنے والا ہے۔ ظاہر ہے دنیا کی ہر بیماری نے پہلے پہل انسانوں کو اسی طرح کش مکش میں مبتلا کیا ہوگا اور پھر تحقیق کاروں نے بیماری کے بارے میں کوئی رائے قائم کر کے اس کو کوئی نام دیا ہوگا۔ اس طرح دنیا میں بیماری آتی رہی ہوں گی ان پر تحقیق کی جاتی ہوگی اور وہ دریافت ہو جاتی ہوں گی۔ اسی طرح کینسر اور دوسرے دیگر امراض نے بھی انسانی ذہن اور دل کو تجسس اور پریشانی سے گزارا ہوگا۔ تو کیا.....!!!

اس نے ڈری ہوئی سوچ اور خوف زدہ نظروں سے صنوبر کی طرف دیکھا جو اسے کسی عجوبے سے کم نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

آصف کریم سلمان کو کمرے میں چھوڑ کر در شہوار کو ایک کوریڈور میں لے گیا۔ در شہوار نے پہلے اس کی طرف دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ پھر وہ اس کے بات کرنے کا انتظار کرنے لگی۔ حالانکہ وہ کسی قدر یہ سمجھ چکی تھی کہ اس کا شوہر اس وقت کیا سوچ رہا ہے اور اسے کیا فکر ہے جو کھائے جا رہی ہے۔ لیکن وہ اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اسی کے بولنے کا ویٹ کرنے لگی۔

''کیا ان دنوں میں صنوبر نے تم سے کچھ کہا تھا؟'' آصف نے ہر ممکن احتیاط کا سہارا لے کر بات شروع کی۔

''کس بارے میں؟'' در شہوار کچھ اور صاف صاف سننا چاہتی تھی۔

''اس کی زندگی میں کوئی لڑکا تو نہیں ہے؟'' آصف نے قدرے جھنجلا کر اپنی بات پوری کی۔

''نہیں... اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی'' در شہوار نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں جانتا تھا تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ تم نے خود کو بچوں سے اتنا قریب ہونے ہی کبھی نہیں دیا کہ وہ تم سے اپنی کوئی

پرائیویٹ بات شیئر کرسکیں۔ ہمیشہ تم اپنی ہی ذات میں کھوئی رہتی ہو۔ تمہیں بس اپنی ہی پروا رہتی ہے اور کچھ نہیں۔'' آصف نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ رات سے صبح ہوگئی اور... اور تم نے اب تک بھی اس واقعے کا، صنوبر کی بیماری کا ذمہ دار مجھے کیوں نہیں ٹھہرایا۔ آخر تمہاری بات تمہارے ہونٹوں پر آ ہی گئی۔'' درشہوار نے زہر خند سے کہا۔

''اپنی کوتاہی کو ایکسیپٹ کرنے کے بجائے الٹا مجھے الزام دینے کی تمہاری پرانی عادت ہے۔ اگر بیٹی بن بیاہی ماں بننے والی ہے تو کیا اس کی ذمہ دار میں محلے کی کسی عورت کو ٹھہراؤں گا۔ یا یہ باپ کا کام ہے کہ وہ بیٹی سے بھی یہ پوچھے کہ وہ کسی کے ساتھ سو کر تو نہیں آ رہی۔ یہ مائیں ہی ہوتی ہیں جو بیٹی کی اس قسم کی مصروفیات پر نظر رکھتی ہیں۔ ان سے ایسی دوستی اور تعلق بناتی ہیں کہ بیٹی کوئی ایسا قدم اٹھانے سے پہلے ماں کو تو کم سے کم اعتماد میں لے۔ کچھ نہیں تو کوئی حادثہ ہو جانے کی صورت میں ماں کو ایٹ لیسٹ بتا ہی دے۔ لیکن تم کبھی بچوں کی ماں نہیں بن سکیں۔'' آصف نے غصے سے اونچی آواز میں کہا۔ دور تک ویران پڑے کوریڈور میں اس کی آواز ایک بازگشت بن کر گونجنے لگی۔

''میں مانتی ہوں... میں اچھی ماں نہیں بن سکی۔ لیکن اس میں بھی سارا قصور میرا نہیں ہے۔ تم بھی اس کوتاہی میں برابر کے ذمہ دار ہو۔ تم نے کبھی مجھے اپنی جوتی برابر بھی نہیں سمجھا۔ میں شوہر کی ٹھکرائی ہوئی عورت ہوں اور یہ کوئی چھوٹا غم نہیں ہے۔ تم نے مجھے اتنا ٹارچر کیا ہے کہ میں اپنی ہی ذات کی الجھنوں میں الجھ کے رہ گئی۔ مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ میرے دو بچے بھی ہیں جن کو میری ضرورت ہے۔ تمہیں اپنی خوبصورتی کے قید خانے سے نکلنے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ اور یہ صنوبر کی کیا کہتے ہو... وہ میری عدم توجہی کا شکار ہوئی ہے۔ اکیلی اور تنہا محسوس کرتی رہی ہے خود کو۔ مجھے اس بات کا احساس ہو چکا ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں سلمان بھی تو تمہارا بیٹا ہے۔ وہ تو لڑکا ہے، جس طرح بیٹیوں کو ماؤں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح بیٹوں کو باپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو کیا تمہارے خیال سے سلیمان پوری طرح ایک اچھا انسان ہے۔ کیا وہ کسی قسم کی محرومی کا شکار نہیں ہے۔ کیا اسے تم نے پوری توجہ دی ہے۔ جس کا وہ مستحق تھا۔ بولو کیا تم ہر الزام سے خود کو بری سمجھتے ہو؟'' درشہوار نے جیسے اپنے دل کے سارے پھپھولے پھوڑ ڈالے۔

''کیوں سلمان کو کیا ہوا ہے؟'' آصف نے درشہوار کی طویل تقریر کو ایک جذباتی بہاؤ سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور صرف اپنے مطلب کی بات پوچھی۔

''میرا منہ مت کھلواؤ... جانتے ہو اس نے کیا کیا تھا؟'' درشہوار کی ضبط کے سارے بندھن اس بہاؤ میں بہہ رہے تھے۔

''کیا کیا تھا؟ میں جاننا چاہتا ہوں... بتاؤ مجھے کیا کیا سلمان نے؟'' آصف کو بھی جذبات نے جکڑ لیا۔

''اس کا کسی دوست سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ وہ مجھے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ تب ہی اس کالے بلے کو پتا نہیں کیا ہوا اس نے سلمان پر حملہ کر دیا۔ اسی نے میری جان میرے نافرمان بیٹے سے بچائی ورنہ آج تم مجھے اس طرح الزام نہ دے رہے ہوتے۔'' وہ بات جسے درشہوار نے اب تک چھپا کے رکھا ہوا تھا۔ غصے اور جذبات میں اس کے منہ سے نکل ہی گئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو کالا بلا....؟'' آصف کو اس بات نے کہ سلمان نے اپنی ماں پر ہاتھ اٹھایا تھا زیادہ حیران نہیں کیا تھا۔ وہ حیرت میں تھا تو اس وجہ سے کہ کالا بلا کون ہے اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ دو انسان جن کا آپس میں کوئی بھی رشتہ ہو وہ لڑ رہے ہوں تو ان کے بیچ میں کوئی بلا کود کر تصفیہ کرے اور تصفیہ بھی ایسا کہ اس نے صاف طور پر درشہوار کا ساتھ دیتے ہوئے اس کی جان سلمان سے بچائی.... اس سے پہلے ایسی کوئی بات کوئی واقعہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی بلے نے یا بلی نے کسی انسان کو بچاتے ہوئے کسی دوسرے انسان پر حملہ کر دیا ہو۔ اس سے پہلے کہ درشہوار کو ہوش آتا اور یہ احساس ہوتا کہ اس نے سب کچھ بک دیا ہے جس سے گھر میں ایک نئی بحث اور نیا موضوع چھڑ سکتا ہے سلمان کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔

''پاپا.... وہ صنوبر.....!!''

''کیا ہوا صنوبر کو سلمان؟'' درشہوار نے شدید بے چینی سے پوچھا۔

''وہ زور زور سے ہنس رہی ہے... پاپا بالکل پاگلوں کی طرح.....!!''

''یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا.... ایسے کیسے ہوسکتا ہے۔'' عموماً آصف کو اپنے بچوں سے بیٹا یا بیٹی کہنے کی عادت نہیں تھی لیکن اس وقت وہ جذباتی طور پر ایک ایسے بھنور میں گھرا ہوا تھا کہ وہ سلمان کو بیٹا بولتا رہا اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ اپنے معمولات سے قدرے مختلف بی ہیو کررہا ہے۔ اس بات کو درشہوار نے بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔ تینوں صنوبر کے کمرے کی طرف بھاگے اور جیسے ہی وہ کمرے کے قریب پہنچے تو انھیں صنوبر کے قہقہے باہر تک سنائی دیے... انھوں نے عجلت سے دروازہ کھولا اور یہ دیکھ کر ان کی نظریں پھیل گئیں کہ صنوبر مسلسل ہنسے چلی جارہی تھی۔ اس کی ہنسی ایسی پراسرار اور ڈرا دینے والی تھی کہ تینوں میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں پڑی اس کے قریب جانے کی۔ انھیں ایسا لگنے لگا جیسے وہ صنوبر نہیں کوئی اور ہی شخصیت ہے۔ جس کا دماغی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا ہے اور وہ پاگل ہوچکی ہے۔

اگر صنوبر کی جگہ کوئی اور بدصورت لڑکی ہوتی تو وہ تینوں بنا اختلاف کے اب تک یہ فیصلہ دے چکے ہوتے کہ یا تو صنوبر کے اندر کوئی چڑیل گھس چکی ہے یا پھر صنوبر کی جگہ کسی چڑیل نے لے لی ہے۔ مگر صنوبر اتنی خوبصورت تھی کہ اس طرح منہ بگاڑ بگاڑ کر پاگلوں کی طرح ہنسنے کے باوجود وہ اتنی ڈراؤنی نہیں لگ رہی تھی جسے چڑیل وغیرہ سے تشبیہ دی جاسکتی ہو۔ اس سب کے بعد بھی صنوبر کے قریب جانے کی ہمت تینوں میں سے کسی کو نہیں ہوئی۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔ ڈاکٹر نے جو یہ منظر دیکھا تو اسے بڑی شدید حیرانی ہوئی اور فوری طور پر وہ یہ سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے جلدی سے صنوبر کو پکڑ کر اسے سکون کا انجیکشن دیا اور صنوبر کچھ ہی دیر میں بیڈ پر گرگئی اور اس کی باہر کو ابلتی ہوئی آنکھیں بند ہوتے ہوئے اندر کی طرف چلی گئیں۔ سلمان ایک ناقابل بیان دکھ اور حیرت سے صنوبر کو دیکھ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بھول چکا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ ڈاکٹر آصف کو اپنے کمرے میں چلنے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ آصف نے ایک نظر صنوبر کی طرف دیکھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ درشہوار بھی اتنی ہی پریشان تھی جتنا کہ آصف وہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کے ساتھ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ اس لیے وہ بھی جلدی سے آصف کے پیچھے پیچھے لپکی اور دونوں کچھ راہداریوں سے گزرنے کے بعد سیڑھیوں کے ساتھ بنے ہوئے ڈاکٹرز کے روم میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے انھیں بیٹھنے کو کہا اور کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔

''عجیب بات ہے... میں آپ کو ٹیسٹس کا رزلٹ بتانے آرہا تھا۔ میں سمجھا میں گڈ نیوز لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ لیکن...''

''لیکن کیا ڈاکٹر.....؟'' آصف نے پوچھا۔

''یہی جو ابھی میں نے اور آپ نے بھی دیکھا۔ وہ کس طرح ہنس رہی تھی۔ مجھے اس کی یہ کیفیت دیکھنے کے بعد اب یہ کہنا ہی ہوگا کہ صنوبر کو کسی ماہر سائکاٹرسٹ کو دکھانا ہوگا۔''

''اس کے ٹیسٹ آپ نے بتایا سب کلیئر ہیں؟'' آصف کا وہ وسوسہ جو اندیشہ بن کر اس کے اندر اسے پریشان کررہا تھا کہ صنوبر بن بیاہی ماں بننے والی ہے اسی نے اس وقت اسے پھر سے ٹیسٹس کے رزلٹ کی طرف متوجہ کیا۔

''جی ہاں تمام ٹیسٹ کلیئر ہیں۔ اسے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ جسمانی طور پر وہ بالکل ٹھیک ہے اس کے سارے ٹیسٹ ایک دم ٹھیک ہیں کسی صحت مند انسان کی طرح۔'' ڈاکٹر کی بات سننے کے بعد آصف نے اپنی تشویش کو رفع کرنے کے لیے درشہوار کی طرف دیکھا اور درشہوار سمجھ گئی کہ اس کی نظروں میں کیا سوال چھپا ہوا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب کیا آپ نے پریگننسی کا ٹیسٹ بھی کیا تھا؟''

''جی اس کی رپورٹ بھی اس فائل میں موجود ہے۔ وہ درجن ہے۔ اس کے ایسے کوئی تعلقات کبھی کسی سے نہیں رہے۔'' یہ سننے کے بعد ایک قسم کے فخر سے درشہوار نے آصف کی طرف دیکھا کہ جیسے کہہ رہی ہو دیکھ لو مجھے الزام دینے

والے! میری بیٹی بالکل پاک ہے اور بے گناہ ہے لیکن یہی بات تم اپنے بیٹے کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ جس کی الماریوں میں شراب کی بوتلیں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ آصف کی آنکھوں میں ندامت جھانکنے لگی۔ اور اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''آپ کیا مشورہ دیں گے ہمیں کسے دکھانا چاہیے... اور کیا ہم اسے گھر لے جاسکتے ہیں؟''

''جی ہاں آپ اسے گھر لے جاسکتے ہیں۔ ہماری طرف سے اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ میں آپ کو ڈاکٹر الماس سے ڈس کس کر کے ان کو دکھانے کا مشورہ دوں گا۔ ابھی میں ایسی دوا لکھ دیتا ہوں جس سے آپ لوگوں کو اسے گھر میں رکھنے میں پریشانی نہ ہو... تاہم اگر کچھ ایسا ویسا ہو جو ہماری توقع کے خلاف ہو تو میں مشورہ دوں گا آپ ایک نرس اپنے ساتھ لے جایئے... تاکہ کسی بھی ایسی سچویشن سے نمٹنا ممکن ہو سکے۔ انشا اللہ میں شام کو آپ کو فون کرتا ہوں پھر آپ اپنی بیٹی کو ڈاکٹر الماس کے پاس لے جا کے دکھا دیں۔''

ڈاکٹر کی باتیں سننے کے بعد صنوبر کی رپوٹس کا لفافہ اٹھا کر دونوں ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ آصف نے ان حالات میں آفس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور آفس فون کر کے اپنی تمام میٹنگز کینسل کرا دیں۔ کاؤنٹر سے صنوبر کی ڈسچارج سلپ بنوانے اور پے منٹ کرنے کے بعد جب آصف صنوبر کے کمرے میں پہنچا تو صنوبر اسی طرح بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سلمان ایک صوفے پر آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ درشہوار نے ضروری ساتھ لے جانے والا سب سامان پیک کر لیا تھا۔ اور وہ جانے کو تیار تھے۔ درشہوار نے آصف کی طرف ایک مری ہوئی صورت سے دیکھا جیسے ڈاکٹر کی باتیں سننے کے بعد وقتی طور پر وہ ایک قسم کی مایوسی میں جا چکی ہے اور یہی بات اس نے سلمان کو بھی بتا دی تھی۔ اس وقت اگر ایک ہی گھر میں رہنے والے ان تین قابل ہوش اور ایک بیہوش لڑکی کو کوئی دیکھتا تو اسے کہیں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان میں آپس میں کتنے گہرے اختلافات ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی صورت تک سے بیزار ہیں۔ سچ ہے مصیبت پڑے تو سب اختلافات کسی نامعلوم کھڑکی سے چپ چاپ باہر نکل جاتے ہیں۔ تینوں اداس تھے اور پریشان تھے۔ آنے والے وقت کے بارے میں اور صنوبر کو ابھی اس بیماری میں کیا کیا اور جھیلنا ہے اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے مگر فکر مند بہت تھے۔

☆......☆......☆

گھر پہنچ کر صنوبر کو اس کے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ ہوسپٹل سے ایک نرس جس کا نام صفیہ تھا۔ ساتھ آئی تھی اور اس وقت وہ بھی کمرے میں موجود تھی۔

''میرا خیال ہے آپ دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں... کچھ دیر اپنے کمرے میں جا کے آرام کر لیں، ہو سکے تو سو جائیں میں صنوبر کے پاس بیٹھتا ہوں۔''

یہ سن کر درشہوار اور آصف دونوں کو حیرانی کا جھٹکا لگا اور اب دیکھنے کی باری آصف کی تھی۔ اس نے درشہوار کی طرف دیکھا اور جیسے پوچھ رہا ہو اب بتاؤ کیا تم میرے اسی بیٹے کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ انسان نہیں ہے اور اس نے تم پہ ہاتھ اٹھایا تھا یا دھکا دیا تھا۔

درشہوار چپ رہی اور آگے بڑھ کر اس نے سلمان کا ہاتھ محبت سے دبایا۔ آصف نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور دونوں وہاں سے چلے گئے۔ ابھی صرف گیارہ بجے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سلمیٰ یہ پوچھنے کے بہانے سے صنوبر کے کمرے میں آئی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اور دیر تک سوئی ہوئی صنوبر کو دیکھتی رہی۔

سلمان نے کہا کہ مجھے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ماما اور پاپا تو سونے چلے گئے ہیں پھر بھی آپ لنچ بنا لینا۔ ہو سکتا ہے وہ جاگ کر انہیں تو انہیں بھوک لگے۔'' سلمیٰ نے خاموشی سے ساری بات سنی پھر بھی وہ وہیں کھڑی رہی۔ سلمان نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''کیا بات ہے کچھ کہنا ہے تمہیں؟''

''نہیں کچھ نہیں بس یہ پوچھنا تھا کہ صنوبر بی بی کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' سلمان نے ایک نظر اس نوکرانی کو دیکھا کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اسے اس کی اوقات ضرور یاد دلاتا مگر اس وقت تو وہ خود صنوبر کے لیے پریشان تھا۔ اس لیے اس نے بس اتنا کہا۔

''ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز کو بھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ صنوبر کو کیا پریشانی ہے'' یہ سن کر سلمیٰ شکر یہ کہتی ہوئی خاموشی سے چلی گئی۔ سلمان سوچ رہا تھا کہ آخر یہ منظر ہے کیا صنوبر کا اس طرح سے ہنسنا اور اس کے سارے ٹیسٹ کا کلیئر ہونا۔ اور اب بات نفسیاتی ڈاکٹر تک پہنچنے والی ہے؟ اگر کسی کو اس کی اس حالت اور نفسیاتی ڈاکٹر سے علاج کے بارے میں پتا چلا تو.....؟؟

اتنا سوچ کر وہ جیسے اندر سے لرزنے لگا۔ وہ بھلے ہی ایک آوارہ طبیعت لڑکا تھا لیکن یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک کنواری لڑکی کا نفسیاتی ڈاکٹر سے علاج کرانے کا کیا مطلب ہے؟ اس طرح تو وہ ساری زندگی کے لیے کنواری ہی رہ سکتی ہے۔ جس کسی کو بھی اس کی بیماری اور پاگلوں کی طرح ہنسنے کا پتا چلے گا وہ لازمی صنوبر کو پاگل سمجھے گا اور یوں صنوبر کی زندگی برباد ہو جائے گی اس سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ ایسی سوچیں اسے مسلسل پریشان کرتی رہیں اور وہ بار بار صنوبر کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ کاش اب جب صنوبر جاگے تو وہ پہلے کی طرح بالکل ٹھیک ہو۔ اس کی سمجھ میں یہ بات بہت سوچنے کے بعد بھی نہیں آئی کہ بہرحال اگر اس کی حالت نہ بدلی اور اس پر پاگل پن کا دورہ اسی طرح طاری رہا تو اسے نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانے کے علاوہ اور کیا راستہ ہے۔

تین گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ درشہوار کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ سلمان اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لڑکا صنوبر کی خاطر اتنی دیر اپنی مصروفیات اور آرام کو چھوڑ سکتا ہے۔

''سلمان اب تم جاؤ آرام کرلو صنوبر کے پاس میں ہوں۔ جاؤ شاباش'' سلمان نے درشہوار کی طرف جھجکتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو مگر اس وقت اپنی ناراضگی کو بھول کر اپنے بارے میں سوچو اور جاؤ جا کر آرام کرلو۔ تمہاری طبیعت تو پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے'' درشہوار نے اس سے پھر کہا۔

''مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے۔'' سلمان نے بمشکل اپنی ماں سے نفرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہاں کہو کیا بات ہے؟'' درشہوار نے صنوبر کے قریب اس کے بستر پر ٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''پاپا صنوبر کو کسی سائکاٹرسٹ کو دکھانا چاہتے ہیں؟'' اس کے لہجے میں کچھ عجیب سی بے قراری کو درشہوار نے محسوس کیا۔

''ہاں ایسا ہی ہے اب اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔'' وہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور سلمان اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کرتے ہوئے بات کر رہا تھا۔

''آپ خود کو صنوبر کی ماں کہتی ہیں اور اتنا بھی نہیں جانتیں کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کا نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔''

سلمان کے زہر میں بجھے طنز کو درشہوار نے اپنے دل میں چبھتے ہوئے کسی تیر کی طرح محسوس کیا اور وہ جیسے لرز کر رہ گئی۔ لیکن وہ اب بھی یہ نہیں سمجھ سکی کہ آخر سلمان کہنا کیا چاہتا ہے۔ اس نے جذبات کی اٹھتی ہوئی لہر کو اپنے سینے میں قابو کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو بیٹے؟'' درشہوار کی آواز کسی انجانے خوف سے لرز رہی تھی۔

''آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔ اب بھی آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ یہ بات تو سب سے زیادہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے تھی۔ ایک تو آپ عورت ہیں اور دوسرے صنوبر کی ماں ہیں۔'' اتنا کہہ کر سلمان نے

درشہوار کی طرف سے نفرت سے منہ پھیر لیا۔
صنوبر پر جیسے یکا یک بجلی سی گری اور وہ ایک دم سب کچھ سمجھ گئی کہ اس کے بیٹے کا اشارہ کس جانب ہے۔ آنکھیں پھاڑے وہ سلمان کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔ کیا یہ وہ ہی سلمان ہے۔ جس کے بارے میں اس کی رائے ہمیشہ منفی رہی ہے۔ کیا وہ ایک ماں سے بھی زیادہ آگے کی بات سوچ سکتا ہے؟
سوال ہتھوڑوں کی طرح درشہوار کے دل ودماغ پر گرتے رہے۔
''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا میں واقعی اچھی ماں نہیں ہوں۔'' درشہوار کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں اور وہ بے تکان رونے لگی۔
''میں سب کچھ ہی بھول چکی ہوں۔ میری یادداشت جیسے کہیں چلی گئی ہے۔ مجھے پھر سے خود کو یاد دلانا ہوگا کہ میں نے کن اذیتوں سے گزر کے تم دونوں کو پیدا کیا تھا۔ میں ہی ہوں جس نے تمہیں اور صنوبر کو جنم دیا ہے۔ کاش......'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہہ سکی اور اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ پھر کچھ دیر تک کمرے میں مہیب سناٹا برستا رہا۔
سلمان نے درشہوار کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ رو رہی تھی۔ لمحے بھر کو سلمان کو اس پر ترس آ گیا اسے احساس ہونے لگا کہ یہ عورت جیسی بھی ہے...... ہے تو اس کی ماں۔ لیکن اس نے اٹھ کر نہ تو ماں کو گلے لگایا نہ ہی اسے دلاسا دیا اور نہ ہی اس سے ہمدردی کے دو بول بولے حالانکہ وہ چاہتا تھا مگر ایسا کچھ بھی نہیں کر سکا۔ اسے لگا اس کے اور اس کی ماں کی بیچ جیسے کئی ریگستانوں کا سا فاصلہ حائل ہو چکا ہے جسے پاٹنا اتنی جلدی ممکن نہیں ہوگا۔ اور اس بلے والے واقعے کے بعد سے تو وہ اپنی ماں سے اور کوسوں دور چلا گیا تھا۔ اس لیے وہ روتی رہی اور سلمان خاموش بیٹھا رہا۔
''کیا بات ہے تم رو کیوں رہی ہو؟'' کمرے کا سکوت آصف کریم نے آ کر توڑا۔ اس نے پہلے دونوں کی طرف دیکھا اور پھر اسے لگا یہاں اس کمرے میں صنوبر کی پریشانی کے علاوہ بھی کچھ اور ہوا ہے۔ صنوبر بدستور سوئی ہوئی تھی یا بے ہوش تھی۔ درشہوار نے ہلکے سے چونک کر آصف کریم کی طرف دیکھا اور بولی۔
''نہیں کوئی بات نہیں......بس ویسے ہی......''
''میری ڈاکٹر سے بات ہوگئی ہے......وہ ہمارے لیے اپنے کلینک میں چھ بجے آ رہی ہے کیونکہ اس کے بعد اس کے اپائنٹمنٹ ڈسٹرب ہوتے ہیں اور کوئی وقت نہیں ہے اس کے پاس...چلو بس تیاری کرو، ہمیں جانا ہوگا۔'' آصف نے درشہوار کی بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور ڈاکٹر کے بارے میں بتایا۔ درشہوار نے ایک نظر سلمان کی طرف دیکھا اور پھر صنوبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''ہم آج کہیں نہیں جا رہے؟''
''کیا......کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ تم نہیں جانا چاہتیں تو مت جاؤ میں اپنی بیٹی کو خود لے کر چلا جاؤں گا۔ تم سے مجھے امید بھی کوئی نہیں ہے۔'' آصف کی آواز بتدریج اونچی ہوتی چلی گئی۔ ویسے بھی دونوں ہر وقت لڑنے کا بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ درشہوار نے خلاف معمول کوئی ری ایکٹ نہیں کیا۔ اور کافی نرم روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔
''ناراض مت ہوں میں جانے سے انکار نہیں کر رہی بلکہ میں صنوبر کو نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھانا نہیں چاہتی۔ کم سے کم آج تو بالکل بھی نہیں'' آصف اس کی بات سن کر جیسے دنگ رہ گیا۔
''کیا مطلب ہے اس بات کا؟''
''تم اطمینان سے بیٹھو پھر بات کرتے ہیں'' درشہوار کے لہجے کی گدازیت نے آصف کو جیسے اس کی بات خاموشی سے ماننے پر آمادہ کر لیا۔ اسے لگنے لگا یہ سب کچھ بالکل اجنبی ہے۔
''آصف ہم دونوں اپنی اپنی دنیاؤں کے قید خانوں میں اس طرح محصور ہو چکے ہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے ہمیں یا تو دکھائی نہیں دیتا اور اگر دکھائی دیتا ہے تو سنائی نہیں دیتا۔ سن بھی لیں تو ہم اسے محسوس کرنے کی صلاحیت سے عاری

ہو چکے ہیں۔ ہم بھول چکے ہیں کہ صنوبر ہماری بیٹی ہے۔ اور ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ ذرا سوچو اگر کسی کو بھی ہمارے حلقہ احباب میں یہ معلوم ہو گیا کہ صنوبر کا نفسیاتی ڈاکٹر سے علاج ہو رہا ہے تو اس سے کون شادی کرے گا۔ اس کی ساری زندگی برباد ہو جائے گی آصف!"

درشہوار کی آواز میں جو درد گھلا ہوا تھا وہ آج سے پہلے آصف نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی بات سن کر جیسے اس کے اپنے اندر کوئی چیز زمیں بوس ہو گئی، اسے بھی یہ بات یاد ہی نہیں تھی کہ صنوبر ایک جوان اور کنواری لڑکی ہے۔ اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ صنوبر بیمار ہے اور کسی بھی طرح اُسے بس ٹھیک کرنا ہے یا ٹھیک ہونا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھے سے اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوائے اور جب بھی وہ بیمار ہوں تو انھیں بہترین علاج معالجہ مہیا کرے۔ ان کے مسائل کیا ہیں۔ ان کی سوچیں کیا ہیں۔ انھیں کیسا ہونا چاہیے۔ وہ کس بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب تو وہ کب کا بھول چکا تھا۔

"اس وقت جو تم سوچ رہے ہو اور جو محسوس کر رہے ہو میرا بھی یہی حال ہوا تھا جب مجھے سلمان نے یاد دلایا۔ ہم دونوں اپنے بچوں سے بچھڑے ہوئے ہیں آصف۔ اور ہمارے دونوں بچے اس وقت مشکل میں ہیں۔" اتنا کہہ کر درشہوار پھر رونے لگی اور آصف نے بڑھ کر سلمان کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا۔ یہ بات تو میرے سوچنے کی تھی۔" آصف نے گلوگیر آواز میں سلمان سے کہا۔ پھر تینوں جیسے گہری سوچ و بچار میں چلے گئے۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم صنوبر کو ایسے بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں اس کا علاج تو کرانا ہوگا۔ وہ بیمار ہے اور اسے علاج کی ضرورت ہے، اس کے مستقبل یا لوگوں کے ڈر سے کیا اسے اسی طرح، اسی حال میں چھوڑا جا سکتا ہے۔ ہرگز نہیں......" آصف نے اتنا کہا اور چپ ہو گیا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولا۔

"ہم صنوبر کا علاج امریکا میں کرائیں گے۔ اس طرح کسی کو پتا نہیں چلے گا اور وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

سلمان اور درشہوار نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں سے خوشی ہویدا تھی۔ لیکن جسے اس بات سے سب سے زیادہ جھٹکا لگا وہ تھا صنوبر کے اندر بیٹھا ہوا سلمان ابراہیم!! اس کی تو جیسے ہوا نکل گئی۔ یعنی اب صنوبر یہاں سے بہت دور امریکا چلی جائے گی اور اسے بھی اس کے ساتھ جانا ہوگا۔ نہیں۔ نہیں..... اس طرح تو سب گڑ بڑ ہو جائے گا۔ اس کا کیا ہوا گا۔ وہ کیسے خود کو قائم رکھ سکے گا۔ پتا نہیں امریکا والے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ نہیں... نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اور اسی وقت صنوبر نے ایک زور کی ہچکی لی۔ تینوں نے چونک کر صنوبر کی طرف دیکھا۔

صنوبر نے آنکھیں کھول دیں۔ تینوں نے صنوبر کو امید سے دیکھا۔ درشہوار اس کے اور قریب ہو گئی اور صنوبر کو پیار سے پکارنے لگی۔

"صنوبر...... صنوبر.... صنوبر میری جان اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" صنوبر ایک گہری غنودگی میں تھی اس کی آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔ پلکیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ وہ کوشش کر رہی تھی مگر آنکھیں پوری طرح نہیں کھل پا رہی تھیں۔ اس نے شاید درشہوار کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ آصف اور سلمان یہ سمجھنے میں ناکام تھے کہ صنوبر کی کیفیت کیا ہے۔ وہ ٹھیک ہے یا یہ ٹھیک اور خرابی کے بیچ کا کوئی وقفہ ہے وہ بھی چند لمحوں کا۔

کافی دیر کی کوشش کے بعد صنوبر نے ایسی ہی کیفیت میں کھلتی بند ہوتی آنکھوں کے بیچ بمشکل اتنا کہا کہ "بھوک لگ رہی ہے" درشہوار یہ سن کر جیسے بہت زیادہ خوش ہو گئی۔

"تم دونوں یہیں اس کے پاس رہنا میں اس کے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر درشہوار چلی گئی اور آصف اس کی جگہ بیٹھ کر بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے ماتھے کو چوم رہا تھا۔ سلمان کی آنکھوں میں بھی ایک امید بھری چمک آ چکی تھی۔ صنوبر مسلسل آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی رہی اور درشہوار کی واپسی سے چند لمحے پہلے صنوبر پوری

طرح ہوش میں آ گئی۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلمان اور اپنے باپ آصف کو اپنے کمرے میں اور اپنے اتنے قریب دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور عجیب قسم کی نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے دیکھنے میں ایک اجنبیت تھی جسے سلمان اور آصف دونوں نے محسوس کر لیا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' سلمان نے اس سے پوچھا۔

''یہی کہ آپ دونوں میرے کمرے میں کیوں ہیں؟'' صنوبر نے رات اور قریب ایک پورا دن بیمار رہنے کے بعد زبان کھولی۔ اسے شاید یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ بول نہیں پا رہی تھی اور اس کی طبیعت خراب تھی اور یہ کہ وہ ہوسپٹل میں داخل رہی ہے اور یہ کہ اس کے بہت سے میڈیکل ٹیسٹ بھی ہو چکے تھے۔ سلمان اور آصف دونوں نے یہ بات اس کے سوال میں چھپے انجان پنے سے محسوس کر لی تھی اس لیے آصف نے جلدی سے کہا۔

''کچھ نہیں صنوبر.... تم خواب میں ڈر گئی تھیں اس لیے ہم تمہیں دیکھنے آ گئے تھے۔ بس اتنی سی بات ہے'' صنوبر نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے خواب بھی نا.....'' اب آصف اور سلمان کے چہروں پر خوشی اور اطمینان تو تھا لیکن وہ اب بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سب کچھ کتنا وقتی ہے یا واقعی صنوبر ٹھیک ہو چکی ہے اور کل رات سے اب تک انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سہا وہ سب کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ انھوں نے صنوبر سے اس بارے میں بات نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں آصف نے سلمان کو کوئی اشارہ کیا جس کا مطلب سلمان فوری طور پر سمجھ گیا وہ جلدی سے ایکسکیوز کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ درشہوار اسے کوریڈور میں ہی مل گئی اس کے ساتھ سلمٰی تھی جس کے ہاتھوں میں کھانے سے بھری ہوئی ٹرے تھی۔ سلمان نے ساری بات ان دونوں کو سمجھا دی کہ صنوبر سے اس کی خراب طبیعت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرنا ہے بلکہ ایسے ہی بی ہیو کرنا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

درشہوار یہ سب سن کر بے پناہ خوشی سے بولی ''یا اللہ تیرا شکر کے میری بچی ٹھیک ہو گئی۔'' سلمٰی کی آنکھوں میں بھی تشکر کی چمک لہرائی اور وہ تینوں صنوبر کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

درشہوار کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے صنوبر کو کسی بات پر ہنستے ہوئے پایا۔ پہلے تو وہ ٹھٹکی کہ شاید اس پر پھر ہنسنے کا دورہ پڑ گیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ آصف کی سنائی ہوئی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ کھانا دیکھ کر صنوبر کی بھوک چمک اٹھی۔ اور جلدی سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اس کا مطلب ہے میں خواب میں کھانا بھی مانگ چکی ہوں اسی لیے ماما کھانا لے کر آئی ہیں۔'' درشہوار نے خوشی اور مسرت سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔

''ہاں تمہیں بھوک لگی تھی۔''

سلمٰی نے صنوبر کو سلام کیا تو صنوبر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی تم آج کہیں نہیں جاؤ گی اور مجھے اچھے اچھے کھانے بنا کر کھلاؤ گی۔'' صنوبر کی اس بات پر سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سلمٰی یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

''جی چھوٹی بی بی ضرور۔'' اب مزید حیرت کا سمندر اس وقت ان کو نگلنے لگا جب صنوبر نے کھانا شروع کیا۔ وہ اس طرح سے کھا رہی تھی جیسے کئی روز کی بلکہ جنموں سے بھوکی ہے۔ تابڑ توڑ اور نہایت غیر مہذب انداز سے وہ مر بھوکوں کی طرح چند منٹ میں سارا کھانا کھا گئی اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور ملے گا!'' درشہوار اور آصف اور سلمان جو کچھ دیر پہلے تک اس کے ہوش میں آنے اور باتیں کرنے پر خوش ہو رہے تھے اب ایک نئی الجھن میں پھنس چکے تھے انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ان کی صنوبر ہے۔ وہ تو اگر دس دن کی بھی بھوکی ہوتی تب بھی اتنا کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔ دو روٹیاں، ایک چکن کے سالن سے بھری ہوئی پلیٹ اور یخنی سے بھرا

ہوا پیالہ اور بعد میں جب سالن پلیٹ میں باقی رہ گیا تو وہ اسے بھی ہاتھوں سے اس طرح کھانے لگی کہ اس کی اس بدتہذیبی پر ان کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ وہ پوری پلیٹ صاف کر گئی اور ساتھ میں رکھا ہوا دودھ کا گلاس بھی لب لب کر کے پی گئی۔ اتنا سب کھانے کے بعد بھی اس نے کہا ''اور ملے گا'' تو ان تینوں کو حیران ہونا ہی تھا جو اپنی صنوبر کو جانتے تھے۔ جو برائے نام کھانا کھاتی تھی جیسے صرف زندہ رہنے کے لیے کھا رہی ہو۔ درشہوار نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو صنوبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہت بھوک لگی ہے۔'' درشہوار کچھ بول نہیں سکی اور گردن ہلاتی ہوئی چپ چاپ کمرے سے چلی گئی۔ آصف نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''صنوبر جب تک اور کھانا آ رہا ہے تم اپنے ہاتھ دھو کر صاف کر لو بیٹے۔'' صنوبر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''نہیں......نہیں کوئی فائدہ نہیں......ہاتھ پھر سے گندے ہو جائیں گے۔ پہلے میں پورا کھانا کھا لوں پھر ہاتھ دھولوں گی۔'' آصف نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اب سلمان کے لیے خود کو چپ رکھنا دشوار ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ بول ہی پڑا۔

''صنوبر یہ تو بتاؤ تم خواب میں کیا دیکھ رہی تھیں؟'' صنوبر نے خالی الذہنی سے سلمان کی طرف دیکھا اور بولی ''خواب تو خواب ہوتے ہیں وہ یاد کہاں رہتے ہیں۔''

''تم کچھ یاد کرو گی تو کچھ نہ کچھ ضرور یاد آ جائے گا۔ کرو نا یاد، کوشش تو کرو۔'' سلمان نے اس کی ذہنی کیفیت جانچنے کو ایسا کہا تھا۔ صنوبر کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''ایک عمارت تھی وہ بہت اونچے پہاڑ پر بنی ہوئی تھی وہاں بہت سے لوگ جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔ میں ان کے قریب گئی تو پتا چلا وہ شور نہیں مچا رہے تھے بلکہ باتیں کر رہے تھے۔ میں...ان کے پاس پہنچی تو......وہ......'' اتنا کہہ کر صنوبر رک گئی اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا اور آصف نے محسوس کر لیا کہ اگر صنوبر کو اور اس بارے میں بولنے یا اس سے مزید پوچھنے کی کوشش کی گئی تو وہ پھر سے چیخیں مار سکتی ہے یا ایسے بی ہیو کر سکتی ہے جس سے اس کی طبیعت پھر سے خراب ہو جائے۔ اس لیے وہ جلدی سے بولا۔

''چلو ٹھیک ہے جو ہوا وہ ایک خواب تھا۔ اب اسے بھول جاؤ'' اتنی دیر میں درشہوار اور سلمٰی پھر سے کھانا لے کر آ گئیں۔ اس بار وہ پہلے کے مقابلے میں ڈبل کھانا لائی تھیں اور کھانا دیکھ کر صنوبر خود جیسے سب کچھ بھول گئی۔ وہ ایک بار پھر کھانے پر اس طرح ٹوٹ کر پڑی کہ ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں اس کے کھانے کے انداز سے یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ کھانا کھا چکی ہے۔ وہ پھر سارا کھانا چٹ کر گئی اور اس طرح درشہوار کی طرف دیکھنے لگی جیسے اب اگر کھانا مانگا تو درشہوار وہیں گر کے بے ہوش ہو جائے گی یا اس کا منہ توڑ ڈالے گی اس لیے اس نے درشہوار کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

''بس اب اور نہیں....'' اتنا کہہ کر وہ ہاتھ صاف کیے بغیر وہیں بستر پر آہستگی سے لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ سو چکی ہے۔ ان سب نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور کمرے سے چپ چاپ کوئی آواز کیے بغیر نکل گئے۔

☆......☆......☆

''سلمٰی تم صنوبر کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہو گی سمجھ گئیں نا...اور ہاں جاتے ہوئے صنوبر کے ہاتھ صاف کرتی جانا۔'' سلمان کے کمرے میں پہنچ کر درشہوار نے سب سے پہلے سلمٰی سے کہا جیسے اگر وہ یہ کہنا بھول گئی تو کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔

سلمٰی نے انھیں یقین دلایا کہ وہ صنوبر کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہے اس لیے آپ بے فکر رہیں میں اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ''یہ اطمینان دلانے کے بعد وہ بولی۔ ''لیکن بیگم صاحبہ آپ میرے ساتھ چلیں...میں صنوبر بی

بی کے ہاتھ اور منہ صاف کر دیتی ہوں۔'' درشہوار سمجھ گئی کہ وہ ڈر رہی ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ ایک بار پھر صنوبر کے کمرے میں پہنچی تو اس نے جو ماجرا دیکھا وہ درشہوار کے حلق میں دبی ہوئی چیخوں کو باہر لانے کے لیے کافی تھا۔ صنوبر اپنے بیڈ پر بری طرح اچھل رہی تھی اور زور زور سے کسی نامعلوم زبان میں کچھ بول رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ خوشی اور شادمانی سے ایسے جھوم رہی تھی جیسے کسی نایاب چیز کے ملنے پر خوش ہو رہی ہو۔ کچھ دیر تک درشہوار اور سلمٰی اس کو ایسی ہی عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ ڈر کے مارے ان کے چہرے سفید پڑ چکے تھے اور کانوں میں ایک عجیب سی سوں.... کی آواز گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ منہ دبائے ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی کھڑی رہیں پھر انھوں نے دیکھا کہ صنوبر دوبارہ سے اپنے بستر پر دھم سے گری اور گرتے ہی سو گئی۔

چند لمحے وہ دونوں اسی طرح کھڑی رہیں اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ صنوبر سو رہی ہے تو درشہوار اس کی طرف بڑھی اس کے ساتھ سلمٰی بھی تھی۔ وہ دونوں اس کے قریب پہنچیں اور اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اس کے ہاتھ پوری طرح صاف تھے اور بستر پر جگہ جگہ دھبے پڑے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا صنوبر نے اپنے ہاتھ بستر کی چادر سے صاف کر لیے تھے البتہ اس کے منہ اور چہرے پر اب بھی بے تکے انداز سے کھانا کھانے کے نشانات تھے درشہوار نے وہ نشانات ٹشو پیپرز لے کر صاف کیے اور اسی وقت سلمٰی کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکلی کیونکہ صنوبر خراٹے لے رہی تھی اور ان خراٹوں کی آواز ایسی ڈراؤنی تھی کہ کوئی بھی سنتا تو ضرور خوف زدہ ہو جاتا۔ یہ خراٹے کسی لڑکی اور وہ بھی صنوبر جیسی لڑکی کے ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔

درشہوار نے ڈرتے ہوئے خود سے بھی زیادہ ڈری ہوئی سلمٰی کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی ساڑی سے زور سے اپنا منہ بند کر لیا۔ چہرہ صاف کرنے کے بعد دونوں کمرے سے باہر نکل آئیں۔ صنوبر کے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی درشہوار اور سلمٰی نے ایسے لمبے لمبے سانس لیے جیسے وہ کسی جان لیوا مصیبت سے بچ کے نکلی ہوں۔

''بیگم صاحبہ.... یہ تو صنوبر بی بی نہیں ہو سکتیں....'' سلمٰی نے گھٹے ہوئی آواز اور لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' درشہوار نے درشتگی سے پوچھا۔ اصل میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بارے میں گھر کی نوکرانی کو معلوم ہونے کا صدمہ درشہوار کو اندر ہی اندر پریشان کیے ہوئے تھا اور بدقسمتی سے ایک اور عجیب تبدیلی بھی اس وقت صنوبر کی شخصیت میں رونما ہوئی جب سلمٰی وہیں موجود تھی۔ سلمٰی نے اپنی مالکن کی طرف خوف سے دیکھا اور بولی....

''آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں!''

''کہو....'' درشہوار کا لہجہ ویسا ہی تھا سخت اور خود کی طرفداری کرتا ہوا۔

''یہ صنوبر بی بی نہیں ہیں بیگم صاحبہ یہ تو کوئی جن ہے.... اسی لیے اس نے اتنا کھانا بھی کھایا تھا۔ صنوبر بی بی تو کھانے کو بس سونگھتی ہیں۔ وہ اتنا زیادہ کھانا کھا ہی نہیں سکتیں.... اور یہ خراٹے یہ تو کسی لڑکی کے خراٹے ہو ہی نہیں سکتے۔'' اتنا کہہ کر سلمٰی چپ ہو گئی اس کی آنکھوں میں ڈر اب بھی چھپا ہوا تھا جو پلکوں کے کناروں سے جھانک رہا تھا۔

''تم کچن میں جاؤ.... ہم بعد میں بات کرتے ہیں'' درشہوار نے اسے وہاں سے اس وقت بھیجنا ہی مناسب سمجھا۔ اور خود جلدی سے سلمان کے کمرے میں پہنچی اور سلمان کے بیڈ پر جاتے ہی ایسے گر گئی جیسے کہیں بہت دور سے پیدل چل کر آئی ہو اور اب بری طرح ہانپ چکی ہو۔ آصف اور سلمان نے اس کی طرف دیکھا اور آصف جلدی سے درشہوار کے قریب آیا۔

''کیا ہوا کیا بات ہے۔ تم ٹھیک تو ہو؟'' آصف نے فکرمندی سے کئی سوال ایک ساتھ کیے۔ درشہوار نے اسے ہاتھ کے اشارے سے صبر کرنے کو کہا۔ اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ سلمان بھی ماں کی یہ حالت دیکھ کر الجھن اور کشمکش میں پڑ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا ہوا ہے۔ اس کی ماما کو کیا ہوا ہے، وہ ایسا کیوں بی ہیو کر رہی ہیں جیسے بہت زیادہ تھکی ہوئی اور ڈری ہوئی ہیں۔ جیسے بہت دور سے پیدل چل کر آئی ہیں اور اب ہانپتے ہوئے سانس بحال کر رہی ہیں۔ لیکن درشہوار خاموش تھی ان کے ذہنوں میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب فوری طور پر دے نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر

تک یہ کشمکش کمرے کی فضاء میں تنی رہی۔ پھر درشہوار نے روتے ہوئے انھیں ساری بات بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہ سلمیٰ کا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔ ساری کہانی کہہ دینے کے بعد وہ چپکے چپکے روتی رہی حالانکہ اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہ رہا تھا، لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آواز گھر کے نوکروں تک پہنچے اس لیے بس چپکے چپکے روتی رہی۔

''ماما آپ چپ کر جائیں یہ مسئلہ اس طرح رونے سے حل نہیں ہوگا۔'' سلمان نے رونے کی آواز سے ڈسٹرب ہوتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ کوئی جن صنوبر پر کیسے آسکتا ہے۔ اور پھر آجکل کے زمانوں میں جن کہاں ہوتے ہیں۔ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔ صنوبر ضرور کسی پیچیدہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہے۔ اسے کسی اچھے نفسیاتی ڈاکٹرز کو دکھانا ہی ہوگا۔ سلمیٰ جیسے غریب اور کم پڑھے لکھے لوگ ایسی پیچیدہ بیماریوں کو اسی طرح کے نام دیا کرتے ہیں ہمیں اس کی بات پر نہ یقین کرنا چاہیے اور نہ ہی ایسی خرافات میں پڑنا چاہیے۔ میں آج ہی امریکا میں کسی بہت اچھے سائکاٹرسٹ سے بات کرتا ہوں۔ پھر یقیناً صنوبر ٹھیک ہو جائے گی۔''

ایسا لگ رہا تھا جیسے آصف کریم خود سے باتیں کر رہا ہو۔ درشہوار نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے آصف کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا ''کم بخت اتنی پریشانی میں بھی اتنا ہی حسین لگ رہا ہے۔'' درشہوار کو اپنی اس سوچ پر قابو پاتے ہوئے آصف کے چہرے سے نظریں ہٹانا پڑیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ سلمیٰ کہیں ٹھیک تو نہیں کہہ رہی، سچ جانیے تو اس وقت سلمیٰ کی بات پر درشہوار بڑی حد تک یقین کر چکی تھی۔ اور اسے آصف کی باتوں میں کوئی وزن نہیں لگ رہا تھا۔

''اگر ہم کسی پیر بابا وغیرہ کو دکھالیں تو کیا حرج ہے؟'' درشہوار نے اپنے ذہن میں کلبلاتے ہوئے خیال کو باہر پھینک ہی دیا۔

''حماقت کی باتیں مت کرو۔ اس سے ساری سوسائٹی میں مذاق بننے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا، اور پھر تم کیا جانتی ہو کون سا پیر فقیر اس کام کے لیے مستند ہوگا، ان کے پاس کوئی ڈگریاں تو نہیں ہوتیں۔ کام نہیں ہوا تو کہہ دیتے ہیں اللہ کی مرضی نہیں تھی۔ نہیں نہیں..... میں اپنی بیٹی کو ایسے تجربوں کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔'' آصف نے حتمی انداز سے کہا۔

''پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں صنوبر کو باہر لے جانا ہی ہوگا!'' سلمان نے اپنے باپ کی بات کو اور وزن فراہم کر دیا۔

''اچھا جیسے تم لوگوں کی مرضی مگر میری ایک بات مان لو۔ کچھ دن بعد لے جانا۔ اس معاملے میں ہمیں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ صنوبر کی بیماری میں ہر کچھ دیر بعد تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ پتا نہیں اب اور کیا کیا سامنے آنے والا ہے۔''

درشہوار خود بھی کشمکش اور یقین و بے یقینی کے بیچ جھول رہی تھی اس لیے اس نے باپ بیٹے کی بات میں زیادہ رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ کچھ دن کی مہلت وہ کیوں لینا چاہ رہی ہے یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح نہیں جانتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا کہا۔ یا اس سے کسی نے کہلوایا۔

''اس کی فکر نہ کرو۔ دو چار دن تو اس سارے کام میں لگ ہی جائیں گے۔ امریکا لے جانا کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا کرنا یہ سب کوئی اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کیس نفسیات کا ہو اور وہ بھی اس قدر پیچیدہ'' آصف یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد درشہوار بھی آہستگی سے اٹھی اور کمرے سے جانے لگی۔

''رکیے ماما.....!'' سلمان کی آواز سن کر وہ چونک کر رک گئی اور اس کی طرف مڑی تو وہ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا آیا اور اس کے عین سامنے کھڑا ہو کو بولا۔

''کل سے اب تک وہ منحوس کالا بلا کہیں نظر نہیں آیا وہ کہاں ہے۔ اسے آپ نے کہیں چھپا رکھا ہے؟''

''نہیں... نہیں میں نے اسے کہیں نہیں چھپایا۔ وہ خود ہی کہیں چلا گیا ہے'' سلمان نے اس کے بعد کوئی اور بات نہیں کی لیکن درشہوار کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے سلمان اس بارے میں مزید سوچے گا ضرور.... یہ بات خود درشہوار کے ذہن سے بھی پریشانی میں محو ہو گئی تھی، اور اب وہ بھی اس بارے میں سوچ رہی تھی کہ آخر وہ بلا گیا تو گیا کہاں اسے ماضی کی بھی کچھ باتیں یاد آنے لگیں اور وہ سوچوں کی اسی راہ پر دور تک نکلتی چلی گئی.....

(اسرار بھری دنیا کے باقی واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے)

# پر اسرار کہانی نمبر 2

Email : pearlpublications@hotmail.com

پراسرار نمبر 1 کی پذیرائی کے بعد پراسرار نمبر 2

ایک ایسا شاہکار شمارہ جس میں دل دہلا دینے والی وہ سچ بیانیاں شامل ہیں جو آپ کو چونکنے پر مجبور کردیں گی۔

آپ کے اُن پسندیدہ رائٹرز کے قلم سے، جو آپ کی نبض شناس ہیں۔

جن کی کہانیوں کا آپ کو انتظار رہتا ہے۔

جنوں، بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ کی ایسی کہانیاں جو واقعی آپ کو خوف میں مبتلا کردیں گی۔

ہمارا دعویٰ ہے!

اس سے پہلے......

ایسی ناقابلِ یقین، دہشت انگیز اور خوفناک کہانیاں شاید ہی آپ نے پڑھی ہوں۔

آج ہی اپنے ہاکر یا قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں۔

ایک ایسا یادگار شمارہ، جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

**سچی کہانیاں کا ماہِ اگست کا شمارہ، پُراسرار نمبر 2 ہوگا۔**

**ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں**

# مسئلہ یہ ہے

## خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو از راہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے منسلک ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کُل منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچّی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

**II C-88۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی**

بچو!

اللہ ہم سب کو یہ رمضان صحت و سلامتی کے ساتھ دکھائے۔ ہمیں خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت نصیب فرمائے اور اس رمضان میں ہم پورے خلوص کے ساتھ جائز ضرورت مندوں کی مدد کرسکیں۔ آج میں بہت دکھے دل کے ساتھ تم سب سے مخاطب ہوں۔ سوچا تھا اس بات کا ذکر نہیں کروں گا مگر میں چاہتا ہوں کہ سچی کہانیاں پڑھنے والے میرے بچے اس تلخ حقیقت سے ضرور آگاہ ہوں۔ 3 ماہ قبل سچی کہانیاں کے دفتر میں ایک خاتون آئیں۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ دفتر والوں نے بتایا کہ آپ خط لکھیں یہی واحد ذریعہ ہے۔ اُس بچی نے تفصیلی خط لکھا جس پر جگہ جگہ اس کے آنسوؤں سے سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ جب وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو لڑکھڑا کر گر گئی اور بہت پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ خاتون تین دن سے بھوکی تھی۔ گھر پر جوان بچیاں تھیں۔ بیوہ خاتون نے ہر در کھٹکھٹایا۔ امداد دینے والے بڑے بڑے ناموں نے اس کو بچیوں کے ساتھ ٹی وی پر آنے کو کہا...... ساری دنیا کے سامنے رونے کو کہا...... اور یقین دلایا کہ اس کے بعد آپ کو امداد مل جائے گی۔ یہ باتیں جب میرے علم میں آئیں تو دکھ سے میرا کیا حال ہوا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مدد اس طرح کرو کہ دوسرے ہاتھ کو بھی علم نہ ہو۔ مگر افسوس یہاں تو ہر جگہ بازار سجا ہے۔ جہاں لوگوں کی مجبوریاں، دکھ، بے بسی اور آنسو تک بیچے جا رہے ہیں۔ بس میں اپنے تمام بچوں سے ایک بار پھر گزارش کروں گا۔ اپنی امداد اور خیرات مجھے بھجوائیں تاکہ باپردہ خواتین، اور جائز ضرورت مندوں کی عین اسلامی اصولوں کے مطابق مدد کی جاسکے۔ ہماری عبادت بھی اُس وقت قبول ہوگی جب ہم اللہ کے بندوں کے دکھوں کا مداوا کریں گے کیوں کہ سجدے کرنے کے لیے اس کے پاس تو فرشتے بھی ہیں...... پرندے بھی اپنے رب کی حمد و ثناء کرتے ہیں۔ درخت بھی شکر بجالاتے ہیں۔ انسان ہی وہ واحد جاندار ہے جو اللہ کے بندوں کی مدد کرسکتا ہے۔ اللہ اِس بابرکت ماہ میں ہم سب کو نیک عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

استغفار کی تسبیح پڑھنا بہت مبارک ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے معنوں کو سمجھنا یقیناً صرف خوش نصیبوں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ لہٰذا اِس بابرکت ماہ میں اپنا شمار خوش نصیبوں میں رکھیں۔ اور دل کھول کر عبادت کریں۔ اللہ ہم سب کی عبادات قبول فرمائے۔ (آمین)

□ سائرہ۔ لاہور

○ محترم باباجی امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے پہلے بھی دو بار خط بھیجا ہے مگر دونوں بار آپ نے وظیفہ نہیں دیا۔ میرے مسئلے ذہنی اذیت والے ہیں باباجی مجھے اللہ کے بعد آپ پر ہی بھروسہ ہے۔ پلیز مجھے اپنے بچوں کی طرح کوئی وظیفہ دیں، جس سے میرے سارے مسئلے حل ہوجائیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنا گھر چاہتی ہوں۔ میں جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں۔ میں خدمتیں کر کر کے تھک گئی ہوں۔ میرے بچے، میرے شوہر، ان کے خاندان، چچا چچیاں، ان کے بچے، سب کے لیے سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی ہوں مگر پھر بھی سب کی نظروں میں کوئی عزت نہیں۔ میں خوشی سے سب کے لیے بہت کچھ برداشت کرتی ہوں مگر

## اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C II-88 ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 35893121-021

20 سال سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ شوہر اچھے ہیں مگر باہر لڑکیوں سے موبائل پر چھپ چھپ کر باتیں کرتے ہیں۔ اُن کے لیے وظیفہ دیں کہ باہر کی خراب لڑکیوں سے باز آجائیں اور مجھ پر اور اپنے بچوں پر دھیان دیں۔ میرے چار بچے ہیں جن کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ پلیز باباجی کچھ ایسا بتادیں جو کہ میں آسانی سے کرسکوں۔ اپنے الگ گھر کے لیے اور اپنے شوہر کے لیے۔ اللہ جانے وہ باہر کیا کیا کرتے ہیں۔ میں دونوں مسئلوں کے لیے باباؤں اور ڈھونگی لوگوں کے پاس گئی مگر سب جھوٹ۔ آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا واسطہ دل سے دعا کریں اور مسئلے کا جواب دیں۔ مجھے آپ کا سہارا ہے۔ وظیفہ دیں تاکہ اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگوں۔ شاید وہ سن لیں۔ الٹے سیدھے وظیفے کیے ہیں مگر کسی سے پوچھا نہیں۔

☆ بیٹی سائرہ! پہلے تو یہ بات سمجھ لو وظیفے کبھی بھی الٹے سیدھے نہیں ہوتے، لوگ الٹے سیدھے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے ہی بھیجا ہے اور اس سے مستفید صرف خوش نصیب ہی ہوتے ہیں۔ خواتین کو بہت شوق ہوتا ہے کہ نامحرموں کے پاس جاکر اپنے مسئلے بیان کریں۔ لوگ اسی چیز کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علیحدہ گھر اور پُرسکون زندگی آپ کا حق ہے۔ اس کے لیے پریشان ہونے کے بجائے اللہ سے مدد مانگو۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 9-9 تسبیح سبحان اللہ کی پڑھو اور دعا کرو۔ پیر والے دن کسی بھی سفید میٹھی چیز پر حضور ﷺ کے نام کی فاتحہ دو اور گھر میں موجود بچوں اور بڑوں کو کھلا دو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

□ شائستہ۔ ملتان

o مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کہ وظیفہ کرتے ہوئے نماز پوری پڑھنی چاہیے یا اکثر ہم نفل وغیرہ چھوڑ دیتے ہیں یا کوئی سنت بھی۔ تو کیا ہمارے وظیفے پر بھی اثر پڑتا ہے۔ یا نماز بیٹھ کر پڑھنے سے تو وظیفہ متاثر نہیں ہوتا ہے۔ اس بارے میں بتادیں۔

اور دوسرا مسئلہ گھر کا ہے کہ ہم میاں بیوی گھر کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ہم کرایہ افورڈ نہیں کرسکتے اور میرے میاں کا گھر کا مسئلہ ان کے بہن بھائیوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ان کی بہنیں امیر ہیں۔ وہ اپنا حصہ بھائی کو دے دیں تو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو انہیں باپ کی طرف سے ایک مرلہ ملا ہوا ہے جبکہ بہنیں کروڑ پتی ہیں اور بڑا بھائی امیر ہے۔ وہ دینا نہیں چاہتا چھوٹے بھائی کو۔ جبکہ ہماری چار بیٹیاں ہیں۔ میاں کی عمر زیادہ ہے۔ آمدنی کم ہے تو بہت مسائل ہوتے ہیں گھر کی وجہ سے۔ تو پلیز ایسا کوئی حل بتائیں کہ ان کی بہنیں اپنا حصہ اپنے چھوٹے بھائی کو دے دیں یا ہمیں گھر دے دیں تاکہ ہماری پریشانی دور ہو جائے یا ہمیں پیسہ دے دیں کہ ہم گھر بنا لیں کیوں کہ ان کا مسئلہ کورٹ تک میں چل رہا ہے جب کہ بڑے بھائی اور بھاوج نہیں چاہتے کہ چھوٹے کو وہ یعنی بہنیں اپنا حصہ دیں۔ کوئی حل بتادیں۔

☆ بیٹی شائستہ! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح ’یا ارحم الراحمین‘ کی پڑھو اور اول و آخر درود شریف پھر خوب دعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ صباء خالد۔ تاروwal

☆ بیٹی صباء! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور درود شریف بہت پڑھو۔ تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ تم تو خود پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہو۔ تمہارے والدین کو سختی کرنے کے بجائے تمہاری پریشانی کو سمجھنا چاہیے۔ میں تمہارا علاج کروں گا مگر تمہیں میرے رابطے میں رہنا ہوگا۔ ہر مہینے مجھے خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ تمہیں مکمل شفا ہوگی۔ بیٹی صبح و شام دو گھونٹ پانی پر سورۃ الناس، سورۃ الفلق، الحمد شریف پڑھ کر دم کرو اور پانی پی لو۔ رات کو سونے سے قبل زیتون کے تیل کے دو قطرے ناک کے نتھنوں میں ضرور ٹپکاؤ۔ فجر کے بعد ننگے پاؤں آدھا گھنٹہ ضرور چہل قدمی کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کرو، انشاء اللہ تم خود مثبت تبدیلی دیکھو گی۔

□ روحی۔ کراچی

o باباجی! بہت پریشان ہوں۔ نماز کی پابندی کرتی ہوں، ہر وقت باوضو رہتی ہوں، صبح شام سورۃ یٰسین پڑھتی

ہوں پھر بھی ہر وقت کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی ہے' خاص طور سے جب رمضان کی آمد ہوتی ہے تو مالی مسائل بہت بڑھ جاتے ہیں۔ طرح طرح کی چیزیں دیکھ کر بچے بھی افطار پر فرمائشیں کرتے ہیں۔ باباجی! میں کہاں سے کروں؟ پھر عید کا خوف تو رمضان سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ میں اتنی بدقسمت عورت ہوں کہ عبادت کے مہینے میں بھی درست طور پر عبادت نہیں کر پاتی۔ باباجی! جو لوگ امداد کرنا چاہتے ہیں' وہ اگر سچے ہیں اور آپ پر یقین رکھتے ہیں تو آپ کے ذریعے ہی کیوں نہیں مدد کرتے؟ ضروری ہے کہ ہمارے گھروں پر آکر دیکھیں کہ ہم کتنے بدحال ہیں؟ آپ نے جن خاتون کا پتا دیا تھا' میں ان سے ملنے نہیں گئی' مجھے اچھا نہیں لگا۔ آپ تو ہمارے بزرگ ہیں' آپ سے کچھ لینا تکلیف نہیں دیتا۔ پتا نہیں' لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے؟

☆ بیٹی روحی! اللہ تمہیں اطمینانِ قلب عطا فرمائے۔ تمہارا خط پڑھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے مگر بیٹی! میں یہاں بے بس ہوں۔ فرزانہ بیٹی کے معاملے میں بھی ایک شخص مجھے مستقل امداد بھیج رہا ہے۔ اللہ اس کو اس نیکی کا صلہ ضرور دنیا میں بھی دے گا اور آخرت میں بھی۔ تم بھی یقین رکھو' کوئی نہ کوئی نیک شخص تمہارے لیے بھی وسیلہ بنے گا۔ پریشان مت ہو اور رمضان کو خوش آمدید کہنے کی تیاریاں شروع کرو۔

□ فوزیہ۔ لندن

○ باباجی! مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ لائبریری میں 'سچی کہانیاں' پڑھا تو یقین ہو گیا کہ اللہ نے آپ کو میری مدد کے لیے بھیجا ہے۔ میری مجبوری ہے کہ میں آپ کو براہِ راست خط نہیں لکھ سکتی کیونکہ کوئی مستقل پتا نہیں ہے۔ باباجی! میرا تعلق پاکستان کے شہر گھوٹکی سے ہے۔ یہاں کیسے پہنچی' یہ الگ داستان ہے مگر اب واپس بھی نہیں آسکتی۔ جب ماں باپ کے مرنے پر نہیں آسکی تو اب کیا بچا ہے؟ بس صرف ایک آرزو ہے کہ کسی طرح اپنے بیٹے کو دیکھ لوں۔ وطن سے دوری' اپنوں سے دوری' یہ سب میری اپنی کرنی ہے مگر اب دل بچے کے لیے تڑپتا ہے' جب چھوڑ کر نکلی تھی' تب 5 سال کا تھا' اب پندرہ سال کا ہوگا۔ آپ مجھے جو کہیں گے' میں وہ کروں گی' بس کسی طرح اپنی اولاد کو ایک نظر دیکھ لوں۔ کوئی کہہ رہا تھا' وہ لندن میں آئے گا۔ باباجی! آپ کو اللہ سائیں کا واسطہ' میری مدد کریں۔

☆ بیٹی فوزیہ! تمہارا خط پڑھ کر تمہاری مشکل زندگی کا اندازہ ہوا۔ میں جانتا ہوں' ایک ماں کے لیے اولاد سے دور رہنا بہت مشکل ہے مگر یہ مشکل کام تم 10 سال سے کر رہی ہو۔ جس بچے نے اپنی ماں کو دس سال سے نہ دیکھا ہو' جب تم اس کو چھوڑ کر گئیں' تب وہ ناسمجھ بچہ تھا مگر اب وہ نوجوان ہے' ظاہر ہے' اس کے ذہن میں تمہارے بارے میں جو کچھ لوگوں اور حالات نے ڈالا' وہ تمہارے خلاف ہی جاتا ہے۔ لہٰذا صبر کرو اور کسی بہتر وقت کا انتظار کرو۔ میں نصیحت کروں گا' اگر کبھی حالات اس کو تمہارے سامنے لے بھی آئیں' تب بھی مت بتانا کہ تم کون ہو؟

□ شفیق احمد۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

○ السلامُ علیکم! بابا! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ باباجی! آپ نے جو وظیفہ بتایا ہے' وہ میں ہر نماز کے بعد کر رہا ہوں لیکن حالات ویسے کے ویسے ہیں۔ پتا نہیں' اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے کہ پریشانیوں پر پریشانیاں ہم کو گھیرے ہوئے ہیں؟ میں نماز کا بھی بڑا پابند ہوں۔ باباجی! آپ نے لکھا تھا کہ ہر نماز کے بعد 3-3 تسبیح ''اللہ اکبر'' پڑھوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر نماز کے بعد 300 مرتبہ ''اللہ اکبر'' پڑھنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے تقریباً تین ہفتے پہلے ایک اور خط بھی لکھا تھا جس میں' میں نے آپ سے بالوں کے لیے دوائی منگوائی تھی لیکن وہ خط پتا نہیں' آپ تک پہنچا یا نہیں پہنچا؟ دوائی کے لیے میں نے 1000 روپے منی آرڈر بھی کر دیا تھا لیکن اس کا جواب اب تک نہیں آیا۔ باباجی! میں بہت پریشان ہوں' شاید پریشانی کی وجہ سے میرے بال جھڑ رہے ہیں۔ باباجی! کوئی حل بتائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ (آمین!)

☆ بیٹے شفیق! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ ورد جاری رکھو۔ یقیناً یہ کہنا بہت آسان ہے کہ پریشانیاں اور مشکلیں زندگی کا حصہ ہیں مگر بیٹے! یہی سچ ہے۔ جب اللہ سے مدد مانگی ہے تو بس مطمئن ہو جاؤ۔ دوا کے لیے ''سچی کہانیاں'' کے دفتر فون کر کے معلومات لو۔

□ ارسلان امین۔ گوجرانوالہ

○ بابا جی! میں کام کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہوں' آج کل چھٹیوں پر گھر آیا ہوا ہوں۔ میری والدہ میری بیوی کے خلاف ہیں۔ میں آپ کو سچ بتاؤں گا کیونکہ ان جھگڑوں نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ میری بیوی پڑھی لکھی اور شریف خاندان سے ہے۔ اس نے آج تک کبھی میری ماں سے بدزبانی نہیں کی۔ میرے گھر والے اَن پڑھ بھی ہیں اور جھگڑالو بھی مگر ماں کا احترام بہر حال لازم ہے۔ میری چھوٹی بہن جس کی عمر تیس' بتیس سال ہے' غیر شادی شدہ ہے' وہ ماں کو الٹی سیدھی باتیں سکھاتی ہے۔ میری بیوی صرف مجھ سے شکوہ کرتی ہے۔ بتایئے' ان حالات میں' میں کیا کروں؟ میری ایک دو سال کی بیٹی بھی ہے۔

☆ بیٹے ارسلان! تمہارا مسئلہ واقعی میں پریشان کن ہے' مگر اس کا حل بہت سہل ہے۔ میری بھی زندگی گزر گئی ہے' مجھے مسئلہ سن کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اصل بات کیا ہے؟ بہر حال تم صرف اتنا کرو کہ ماں کو پیسے الگ بھیجو اور بیوی کو جو کچھ بھیجتے ہو' وہ اس کے والدین کے گھر بھیجو اور بیوی سے کہو' اس بات کا ذکر نہ کرے۔ ماں کو تھوڑی زیادہ رقم بھیجو اور ان سے کہو کہ اس میں سے کچھ رقم بیوی کو دے دیا کریں' جس سے وہ محسوس کریں گی کہ بہوان کے دستِ نگر ہے' بس تمہیں بھی صرف یہی ثابت کرنا ہے' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ پیسہ بہت بری شے ہے' رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے۔ کوشش کرو کہ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ شیطان مردود نمازی سے دور رہتا ہے۔

□ راشدہ۔ واہ کینٹ

○ بابا صاحب! السلام علیکم! میری دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو کام آپ کو بخشا ہے' آپ اس کی پوری طرح سے تکمیل کر سکیں۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ میرے بال گھنے' لمبے اور خوبصورت ہوں مگر میرے بال نہ تو خوبصورت ہیں اور نہ گھنے و لمبے ہیں۔ میرے بالوں میں تو خشکی ہے اور دو مونہے بال زیادہ ہیں۔ بابا جی! آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ یا دوا بتا دیں جس سے مجھے بالوں کی بیماری سے چھٹکارہ مل جائے۔ میں آپ کے لیے ہمیشہ دُعا گو رہوں گی۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یعنی گرمی اور سردی میں زکام رہتا ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ میری یہ بیماری ختم ہو جائے۔ تیسرا یہ ہے کہ میرے اندر علم کا شوق پیدا ہو جائے جسے میں دوسروں تک پہنچا سکوں اور چوتھا یہ ہے کہ میرا رشتہ اچھی جگہ ہو جائے۔

☆ بیٹی راشدہ! تم نے کئی مسائل لکھے ہیں۔ میں تمہیں صرف ایک نصیحت کروں گا کہ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ درست سمت میں جدوجہد کرو۔ نماز پابندی سے پڑھا کرو۔ وٹامن A کا استعمال رکھو۔ اپنا تولیہ الگ رکھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح' یا سمیع ،یا رحمٰنُ' کی پڑھو۔

□ علیشا۔ ٹنڈو آدم

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! امید ہے' آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) بابا جی! آپ کی دُعاؤں' وظائف اور اللہ کے کرم سے میرے بہت سے مسائل حل ہوئے ہیں۔ آپ نے میری ہر مشکل میں مدد کی ہے۔ بابا جی! میرا ایک مسئلہ ہے کہ میرا ٹرانسفر سندھ سے پنجاب ہو جائے۔ آپ نے مجھے سورۃ اخلاص 77 مرتبہ بعد نمازِ فجر اور عشاء پڑھنے کے لیے دیا۔ 21 دن کے لیے۔ بابا جی! میرا ٹرانسفر تو ہو گیا ہے لیکن مجھے اپنے عہدے سے کم درجے پر رکھا گیا ہے اور میرے افسران مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ بابا جی! آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ مجھے میرا عہدہ بھی مل جائے اور افسران بھی راضی ہو جائیں اور میری عزت و توقیر میں اضافہ ہو جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی علیشا! کیا حاجت قبول ہونے کے بعد تم نے کچھ رقم خیرات کی؟ یہ عمل بہت ضروری ہوتا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ مجھے حالات سے آگاہی ضرور دو۔ بہر حال تم یہی وظیفہ جاری رکھو اور رمضان المبارک کے بعد مجھے حالات سے مطلع کرو۔

□ شمیم بانو۔ لاہور

○ بابا جی! السلام علیکم! امید ہے' آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کی خدمت میں اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ میرے ماموں زاد مجھے پسند کرتے ہیں اور شادی کے خواہاں بھی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میری

# قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساٹھیوا عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

والدہ نے ایک روز ان کو کسی دوسرے نمبر سے فون کیا تو وہ کسی لڑکی 'شازمہ' کا نام لے کر کہہ رہے تھے کہ میری جان' تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی ہو؟ جب میری والدہ نے بتایا کہ وہ بات کر رہی ہیں تو وہ کہنے لگے کہ امی جی! میں نیند میں تھا اور مجھے نہیں پتا کہ میں نے کیا کہا اور کیا نہیں؟ پھر انہوں نے معافی بھی مانگی اور میرے پوچھنے پر انہوں نے خدا کی قسم بھی کھائی۔ آپ مہربانی کر کے بتا دیں کہ میرا کزن میرے ساتھ مخلص ہے یا نہیں؟

☆ بیٹی شمیم! تمہیں ابھی بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ وہ شخص تم سے مخلص ہے یا نہیں؟ جتنی جلدی ممکن ہو اُس سے ہر تعلق توڑ لو اور اپنی والدہ کو بتا دو۔ وقت مت ضائع کرنا۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُعا کیا کرو کہ اللہ تمہیں شیطان اور شیطان جیسے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

☐ حمیدہ۔ کراچی

☆ بیٹی حمیدہ! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اس وقت صرف صبر اور ہمت سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یوسف پڑھو اور اولاد کی صحت اور سلامتی کی دُعا کرو۔ زچگی تک یہ وظیفہ جاری رکھو۔

☐ فروا۔ کوٹری

☆ بیٹی فروا! اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۃ فاتحہ اتنی اونچی آواز کے ساتھ پڑھو کہ خود واضح طور پر سن سکو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مدت 2 ماہ ہے۔

اریبہ۔ حیدرآباد

☆ بیٹی اریبہ! تمہیں نزلے کا مکمل علاج کرنا پڑے گا۔ روز رات کو سونے سے قبل گرم پانی سے بھاپ لو۔ گرم پانی میں اسپغول ملا کر پیو۔ بکثرت یارحمٰن کا ورد کرو' کرم ہوگا۔

☐ گل جان۔ پشاور

o بابا جان! اس سے پہلے بھی دو بار آپ کو خط لکھا مگر جواب نہیں ملا' میں خط میں اپنی امی کا پتا لکھتی ہوں۔ اِدھر سسرال میں نہیں چاہتی' کسی کو پتا چلے۔ بابا جان! 7 سال پہلے میری امی نے آپ سے بھابی کے لیے تعویذ منگوایا تھا اولاد کا۔ اللہ کے کرم سے اب اس کے 2 بیٹے ہیں۔ بابا جان! میں بھی چاہتی ہوں' آپ سے تعویذ لوں۔ امی تو زندہ نہیں اس لیے ہمیں طریقہ نہیں پتا' آپ ہمیں بتایئے کہ کیا کریں؟ میری شادی کو 3 سال ہوگئے ہیں' سسرال والے باتیں بناتے ہیں اور بابا جان! اب میں بھی چاہتی ہوں کہ اولاد ہو جائے۔

☆ بیٹی گل جان! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تمہاری والدہ کے بارے میں جان کر بہت دُکھ ہوا۔ تمہارے شہر کے نام سے پہچان گیا ہوں۔ مرحومہ مجھ سے ضروری مسائل کے حل پوچھتی تھیں۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور تم لوگوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین!) بیٹی! تعویذ منگوانے کا طریقہ یہ ہے کہ مجھے اپنی اور اپنے شوہر کی تاریخ پیدائش' مکمل نام جوابی لفافے کے ساتھ ارسال کرو۔ جوابی لفافے پر پتا واضح لکھنا تاکہ خط تم تک پہنچ سکے۔

☐ معصومہ۔ سکھر

o محترم بابا جی! السلام علیکم! آپ کے لیے خصوصی دعا گو ہوں۔ بابا جی! میں 4 سال کے عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی تھی' سوچا کیوں نا' میں بھی آپ سے مدد طلب کروں۔ بابا جی! میں اپنے ایک کزن کو پسند کرتی تھی' کبھی اظہار یا فون وغیرہ پہ رابطہ بھی نہیں تھا۔ مقدر کی بات کہ ہمارا رشتہ خاندان والوں کی وجہ سے نہ ہوسکا۔ اب اس کزن کا رشتہ غیروں میں ہوگیا ہے۔ بابا جی! میں کوشش کے باوجود اسے بھلا نہیں پا رہی۔ میں ذہنی طور پہ بہت اپ سیٹ رہنے لگی ہوں۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ اب میرا رشتہ جلد از جلد کسی اچھی جگہ ہو جائے تاکہ میں ذہنی طور پہ مصروف ہو کر اسے بھول جاؤں۔ بابا جی! دلوں میں محبت ڈالنے والی ذات بھی تو اللہ کی ہے نا' میں جامعہ میں پڑھتی ہوں۔ برائے کرم ضرور کوئی وظیفہ عنایت کریں۔ میں آپ کے لیے خصوصی دعا گو رہوں گی۔ اور بابا جی! میرے پرچے ہونے والے ہیں' کامیابی کے لیے محنت تو شرط ہے ہی لیکن آپ پرچوں کے لیے بھی کوئی وظیفہ دیں۔

☆ بیٹی معصومہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ جان اللہ کی امانت ہے' اس کو ضائع کرنے والا خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ بھی اللہ کے ساتھ لہٰذا ایسا

کبھی سوچنا بھی مت۔ سوچو ذرا' اگر اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں تو پھر انسان کہاں جائے گا؟ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد ایک بار آیت الکرسی ضرور پڑھا کرو اور کم از کم 7 بار پڑھو اللھم اجرنی من النار سب خیر ہوگی۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ عابدہ امریکہ

☆ بیٹی عابدہ! میں بھی تمہاری طرح ایک عام سا انسان ہوں۔ ہاں' زندگی کے تجربوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ کلام الٰہی کو سمجھ کر پڑھا ہے لہٰذا زندگی کے مسائل کا حل بھی اسی بابرکت کتاب سے نکال کر دیتا ہوں۔ بیٹی! یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں دل برداشتہ کر رہا ہوں مگر یہ سچ ہے کہ زندگی ایسے ہی گزرے گی' اس میں کوئی بہتری یا سلجھاؤ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔ تم صرف اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔ بیٹی......! زندگی بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے لہٰذا جو بھی فیصلہ کرنا ہے' کر لو دو کشتیوں میں سوار زندگی بہت مشکل ہوتی ہے۔ ہر نماز کے بعد اور چلتے پھرتے یَامُجِیبُ کا وِرد کیا کرو۔ اللہ تمہاری مشکلیں آسان فرمائے۔

☐ عبدالاحد۔ اسلام آباد

o باباجی! میں پڑھا لکھا انسان نہیں لہٰذا خط لکھنے میں اگر کوئی گستاخی ہو تو معاف کر دیں۔ حالات کی خرابی کی وجہ سے اپنا گھر' اپنا علاقہ چھوڑ کر اسلام آباد آنا پڑا' یہاں کام کی بہت پریشانی ہے پھر بال بچوں سے بھی دور ہوں۔ حالات بھی اچھے نہیں ہیں' ہر وقت خوف رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں کام کرنا جو بھی ملتا ہے' کبھی نہیں' بہت مشکل ہے۔ باباجی! مجھے روزی کے لیے وظیفہ دیں جو میں کروں اور اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر انہیں پالوں۔ ہمارے ہاں پردے کا سخت رواج ہے۔ ایسے میں گھر میں مرد نہ ہوں تو بہت مسئلہ ہوتا ہے۔

☆ بیٹے عبدالاحد! اللہ تمہاری روزی میں برکت دے۔ تمہارا لکھا بالکل درست ہے۔ اللہ ہمارے ملک اور ہمارے لوگوں کو اپنی امان میں رکھے۔ کوشش کرو کہ نماز کی پابندی کر سکو۔ صبح سُبحان اللّٰہ کی ایک تسبیح پڑھو پھر الحمدللہ پھر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پھر اللّٰہُ اکبر یعنی 400 بار پڑھو گے۔ باری باری ایک ایک تسبیح سو دانے والی۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ اس عمل کو اپنی عادت میں شامل کر لو۔ اس وظیفے کی عام اجازت ہے۔ اگر کسی کا دل گھبراتا ہو' برے برے خیالات آتے ہوں' کسی طور اطمینانِ قلب نہ حاصل ہو وہ ضرور یہ تسبیحات پڑھے۔

☐ شمع حیدرآباد

o باباجان! میری شادی کو 10 سال ہو چکے ہیں' دو بچے ہیں۔ ہمارے درمیان جھگڑے پہلے دن ہی سے ہیں' نوبت طلاق تک آ جاتی ہے پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اصل میں میرے شوہر کو جھوٹ بولنے کی بہت عادت ہے۔ وہ مجھے تو گھر میں بند رکھنا چاہتے ہیں مگر خود کام کا بہانہ کر کے راتوں کو دیر سے گھر آتے ہیں۔ ہر وقت غصے میں رہتے ہیں یا پھر بیمار رہتے ہیں۔ مگر نہ تو صحت سے لگتا ہے کہ بیمار ہیں نہ مصروفیت ہے۔ پیسا بہت ہے مگر ہمارے لیے نہیں۔ ہر معاملے میں اپنی من مانی کرتے ہیں' کبھی بچوں کو بہت پیار کر رہے ہیں' اچانک ڈانٹنا اور مارنا شروع کر دیں گے۔ خود سارا دن ہم لوگوں کو پوچھتے نہیں ہیں کہ ہم زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ باباجان! میں پڑھی لکھی لڑکی ہوں' یہ غیر متوازن رویے مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر معاملے میں غیر متوازن ہیں۔ ہاں' باہر بہت اچھے ہیں۔ لوگوں کے کام اپنی جان پر کھیل کر بھی کر دیتے ہیں۔ باباجان! بہت دعا میں کیں۔ بہت پڑھا مگر کوئی حل نہیں نکلتا۔ بتائیے' کیا کروں؟

☆ بیٹی شمع! تم نے جو کچھ نہیں لکھا' میں وہ بھی سمجھتا ہوں۔ صورتِ حال یقیناً پریشان کن ہے۔ ظاہر ہے' تم بھی زندہ انسان ہو۔ میں تمہیں صرف یہ نصیحت کروں گا کہ اپنی پوری توجہ اپنے گھر اور بچوں کو دو۔ اس کے بعد جو وقت بچتا ہے' اس کو خالصتاً اپنے لیے وقف کرو۔ اچھی کتب پڑھو۔ جو اقتباس اچھا لگتا ہے' وہ ضرور لکھو۔ دو چار اچھی ملنے والیاں ہونی چاہئیں' بہت تنہائی بھی انسان کو بیمار کر دیتی ہے۔ تم اپنے شوہر کو نہیں بدل سکتی ہو۔ انہیں بہت بڑی بیماری لاحق ہے اور وہ ناقابلِ علاج بھی ہے یعنی کم وقت میں بہت سارا پیسا کمانا اور بہانہ یہ کہ اولاد کے لیے کر رہا ہوں۔ نماز کی پابندی کرو۔ درود شریف بہت پڑھو۔ اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے پوری

کرو۔ بس مکمل خاموشی اختیار کرلو۔ ماہِ رمضان کی آمد آمد ہے ہر نماز کے بعد ایک تسبیح یَا مُذِلُّ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ بیٹی! صبر اور مستقل مزاجی کامیابی کی دلیل ہے۔ سب معاملات اللہ پر چھوڑ دو۔

□ مصباح۔ ملتان۔

○ باباجی! اللہ آپ کو جیتا رکھے۔ ہمارے گھر میں جب بھی کوئی مسئلہ ہوتا ہے' ہم سب آپ سے ہی رجوع کرتے ہیں۔ آپ کے دیے گئے مشوروں سے ہمارے مسائل ہمیشہ حل ہوئے ہیں۔ باباجی! آج جس مسئلے کے لیے میں نے آپ کو خط لکھا ہے' وہ بہت پریشان کن ہے۔ میرا بڑا بھائی جس کی شادی کو 8 سال ہوچکے ہیں اور دو بچے ہیں' غصہ کے بہت تیز ہیں۔ بلاوجہ چیختے چلاتے رہتے ہیں۔ بھابی بہت اچھی ہے مگر غصہ ان کا بہت تیز ہے۔ بھائی زیادتی کرتے ہیں مگر پھر بھابی بھی بے قابو ہو جاتی ہیں۔ دونوں لڑتے وقت اتنی گندی زبان استعمال کرتے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ باباجی! میں سچ کہوں کہ 99 فیصد غلطی بھائی کی ہوتی ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ دونوں حالات کو سنبھالیں' بچوں کا خیال کریں اور تماشا نہ بنیں۔

☆ بیٹی مصباح! غصہ اسی لیے حرام ہے کہ انسان اپنی سوچ سمجھ کھو بیٹھتا ہے۔ تمہارے حساب سے زیادہ غلطی بھائی کی ہے مگر میں یہ کہوں گا کہ غلطی دونوں کی ہے۔ بہرحال بھاوج سے کہو' جب جب یاد آئے' پڑھا کرے لاحول ولاقوۃ الا باللہ گھر میں جو پانی پینے میں استعمال ہوتا ہے' اس پر بھی یہی پڑھ کر دم کیا کرے۔ حسب استطاعت صدقہ ضرور دیا کرو۔

□ غلام فاطمہ۔ جہلم۔

○ باباجی! السلام علیکم! میں نے 16 سال قبل کان کا آپریشن کروایا تھا' پہلے 12 سال تک تو ٹھیک سننے میں آتا تھا لیکن اب دو، تین سال سے بہت کم سنائی دیتا ہے۔ اب دوسرے کان میں آلہ بھی لگایا ہوا ہے۔ وہ پہنتی ہوں تو دونوں کان اندر سے سوج جاتے ہیں۔ اس وجہ سے پہننا چھوڑ دیا ہے۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا ہے' وہ کہتے ہیں' الرجی کی وجہ سے سننے کی طاقت متاثر ہو رہی ہے۔ گولیاں بھی کم کھاتی ہوں' کبھی کم' کبھی زیادہ سنائی دیتا ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ سننے میں اضافہ ہو جائے۔

☆ بیٹی فاطمہ! تمہیں کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرانا چاہیے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بکثرت یاشافعی کا ورد کیا کرو۔ اللہ ضرور کرم فرمائیں گے۔

□ بشریٰ۔ ٹنڈو الہ یار۔

☆ بیٹی بشریٰ! ورد جاری رکھو۔ نہایت برکتوں والا ماہ شروع ہوا چاہتا ہے۔ خوب دُعائیں مانگو۔ اللہ اپنے بندوں کی ضرور سنتا ہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ مزمل 7-7 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ فرحین جبار۔ لڈن وہاڑی۔

☆ بیٹی فرحین! یہ درست ہے کہ اولاد اللہ کی عطا کردہ بیش بہا نعمت ہے۔ وہ اس وقت دنیا میں آتی ہے جب اللہ حکم دیتا ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دُعا نہ مانگی جائے۔ تم دُعا کے ذریعے ہی اپنے رَب کو راضی کرسکتی ہو۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت یَا رحمٰنُ کا وِرد کیا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ البقرۃ آیت 99' 7 تسبیح ضرور پڑھو اور دُعا کرو۔ یہ وظیفہ پورا رمضان المبارک جاری رکھو۔

□ ندا۔ جیکب آباد۔

☆ بیٹی ندا! یہ مسئلہ ایسے حل نہیں ہوگا۔ مجھے تعویذ دینے میں کوئی اعتراض نہیں مگر تمہیں گھر کے بڑوں کے ذریعے اس مسئلے کو حل کروانا پڑے گا۔ ورنہ یونہی پریشان رہوگی۔ اللہ سے مدد مانگو تاکہ وہ تمہیں درست سمت میں چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بہت زیادہ نرمی اور بہت زیادہ سختی دونوں سے مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ البقرۃ آیت 57' 9 تسبیح پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 25 دن ہے۔

□ شازیہ جاوید۔ رحیم یار خان۔

○ باباجی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ میری بڑی باجی بہت عرصے سے آپ سے رابطے میں ہیں' انہی کے کہنے پر میں آپ کو اپنا مسئلہ لکھ رہی ہوں۔ باباجی! میری عمر 28 سال ہے اور میں نے بی اے کیا ہوا ہے۔ پچھلے 2 سال سے لگاتار نوکری کی تلاش میں ہوں مگر ہر جگہ سے مایوس لوٹی ہوں۔ مجھے نوکری کی اشد ضرورت ہے۔ پلیز'

آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں۔

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تمہاری مدد فرمائے۔ تم پڑھی لکھی ہو وقت ضائع کرنے کی بجائے بچوں کو اگر گھر ہی میں بلا کر پڑھا لیا کرو تو سہولت ہوگی اور اس طرح آمدنی کا ذریعہ بھی بنے گا اور تمہیں باہر بھی نہیں نکلنا ہوگا۔ رزق میں کشادگی کے لیے پورا رمضان المبارک بعد نمازِ عشاء سورۃ واقعہ پڑھو اور دُعا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد 3 تسبیح سورۃ الکوثر پڑھو اور دُعا کرو۔

□ حمزہ۔ نوشہرہ۔

o بابا جی! میں نے اپنا وزن کم کرنے کے لیے دوا منگوائی تھی۔ 15 دن بعد مجھے اپنے جسم میں فرق محسوس ہوا یعنی جو سوجن تھی' وہ ختم ہوگئی۔ وزن تو ابھی بہت کم نہیں ہوا لیکن سوجن کی وجہ سے جو میرا نقشہ بگڑا ہوا تھا' وہ اب ٹھیک ہے۔ میں دوا کا استعمال جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ہدیہ ارسال کر رہا ہوں۔ پورے ماہ کی دوا ارسال کر دیں تاکہ رمضان میں مشکل نہ ہو۔

☆ بیٹے حمزہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دوا میں تیار کر کے روانہ کر دوں گا۔ طریقہ استعمال وہی ہے۔ بیٹے! اللہ کا شکر اَدا کرو کہ سوجن اتری' اب وزن بھی گھٹے گا' بس تم احتیاط پوری رکھنا۔ مجھے دوا ملنے پر ضرور مطلع کرو۔

□ یاسمین بانو۔ اٹک۔

o بابا جی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ میں نے آپ سے اپنے بیٹے کی بری عادات چھڑوانے کے لیے تعویذ لیا تھا۔ شروع میں تو وہ کسی طرح نہیں مانا اور تعویذ پہننے سے صاف انکار کر دیا مگر پھر ایک دن خود ہی پہن لیا۔ اس کے بعد میں نے اس میں بہت اچھی تبدیلی دیکھی' نماز تو اب بھی پابندی سے ادا نہیں کرتا مگر رات کو جلدی گھر آ جاتا ہے۔ بہنوں سے نرمی سے بات کرتا ہے۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ بس بابا جی! میں چاہتی' وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے۔ اب پہلے جیسا نہ ہو جائے۔

☆ بیٹی یاسمین! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور اللہ کا شکر اَدا کرو۔ تم نے سب کچھ محسوس کر لیا مگر یہ محسوس نہیں کیا کہ بیٹے میں یہ

تبدیلی ایک اور تبدیلی کی وجہ سے آئی ہے اور وہ تبدیلی ہے' تمہارا رویہ۔ تمہیں میں نے کہا تھا کہ خاموشی اختیار کرو' بہت زیادہ سوال و جواب مت کرو' ہر بات میں طنز مت کرو' یقیناً تم نے اپنا رویہ بدلا تو بیٹے میں بھی فرق پڑا۔ اصل میں بچے بہت اچھے ہیں' بس آج کل والدین اپنی پریشانیوں کی وجہ سے چڑچڑے رہنے لگے ہیں اور ستم کا نشانہ اولاد ہی بنتی ہے۔ جب وہ وہی لہجہ اور انداز اپنا لیتے ہیں تو پھر ہمیں دکھ ہوتا ہے لہٰذا آئندہ بہت احتیاط رکھنا' وہ اچھا بچہ ہے اور اُس کو اچھا ہی رہنے دو۔ خوب صدقہ' خیرات نکالو اور بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔

☐ دستگیر اقبال۔ منڈی بہاؤالدین

o بیٹے دستگیر! صرف اللہ پر بھروسا رکھو اور اپنے قوتِ بازو پر۔ لوگوں سے امیدیں لگانے والے صرف دکھ اٹھاتے ہیں۔ جب تک طاقت ہوتی ہے' دکھ اٹھاتے ہیں اور پھر اسی درد کو لیے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ نماز پڑھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح یَاعزیزُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔

☐ ارمان علی۔ فیصل آباد۔

o بابا جان! میں بہت پریشان ہوں' عرصہ دس سال سے جس دفتر میں کام کر رہا تھا' ان لوگوں نے عملہ کم کیا اور دوسرے کئی لوگوں کے ساتھ مجھے بھی فارغ کر دیا۔ آج کے دور میں بنا نوکری کے ایک لمحہ گزارنا بھی ناممکن ہے۔ گھر ہے' بچے ہیں' ذمہ داریاں ہیں' پہلے بھی نوکری ایسی نہ تھی کہ بچت ہو سکتی' بس عزت سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔ اب تو حالات بہت دگرگوں ہیں۔ بہت پریشانی ہے۔ بابا جان! خدا کے واسطے' ایسا وظیفہ دیں کہ حالات بہتر ہو جائیں۔ میں اس پریشانی کی وجہ سے ذہنی مریض بنتا جا رہا ہوں۔

☆ بیٹے ارمان! بے شک تمہارا مسئلہ شدید نوعیت کا ہے۔ فی زمانہ روزگار کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ بہر حال اللہ پر بھروسہ رکھو' وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ واقعہ پڑھو اور دعا کرو۔ چلتے پھرتے یارزاق کا ورد ضرور کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے آگاہ کرو۔

☐ نیلم۔ راولپنڈی۔

o بابا جی! السلام علیکم! میرا نام زیب ہے۔ عمر 62 سال' غیر شادی شدہ ہوں' بھائیوں کے ساتھ رہتی ہوں' سب بھائی ساتھ رہتے ہیں' بہنیں اپنے گھروں میں رہتی ہیں۔ بہت عرصے سے ''سچی کہانیاں'' پڑھتی ہوں' پہلی دفعہ مسئلہ لے کر حاضر ہو رہی ہوں۔ میرے گھر میں بھتیجے' بھانجے سب سگریٹ پیتے ہیں عرصہ تین چار سال سے' بہت دفعہ ڈانٹ بھی پڑ چکی ہے لیکن وہ یہ عادت چھوڑتے نہیں' اب تو ان میں اور شدت آ گئی ہے کیونکہ گھر کی لڑکیاں دو تین ہیں' وہ بھی ان کے ساتھ مل گئی ہیں۔ وہ بھی سارا دن سگریٹ پیتی ہیں۔ لڑکے تو شاید اب چرس بھی پینے لگے ہیں۔ بھتیجے اور بھانجے جو بھی آتے ہیں' اب ان کی دیکھا دیکھی جو چھوٹے بھتیجے ہیں' 16,17 سال کے' وہ بھی چھپ چھپ کے سگریٹ پینے لگے ہیں۔ بابا جی! میں نماز پڑھتی ہوں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جو یہ سگریٹ پینا چھوڑ دیں۔ نماز تو سب پڑھتے ہیں۔ بڑے بھتیجے کی عمر 27 سال ہے' باقی سب اس سے چھوٹے ہیں۔

☆ بٹی زیب النساء! یہ مسئلہ تو خود حل کرنے والا ہے۔ گھر کے افراد بچے نہیں کہ اپنا برا بھلا ہی سمجھ نہ سکیں؟ ان کے حق میں دعا کیا کرو کہ اللہ انہیں عقل عطا فرمائے۔

☐ آفرین۔ کراچی۔

o بابا جی! السلام علیکم! والدہ کے کہنے پر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے والد بہت اچھی جاب پر ہیں مگر ہاتھ ہمیشہ تنگ رہتا ہے۔ ہم 4 بہن بھائی ہیں اور ایک بیوہ پھوپو بھی ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ہمیشہ گھر میں چیزوں کی تنگی کا رونا رہتا ہے۔ ابو بہت محنتی ہیں اور ان سے کم کمانے والے بہت اچھی طرح رہتے ہیں مگر ہمارے حالات اچھے نہیں، اسی لیے امی بہت چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ ابھی تو ہم بہن بھائیوں کی پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ امی چاہتی ہیں کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے حالات بہتر ہو جائیں۔

☆ بٹی آفرین! اپنی والدہ سے کہو' ہاتھ کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو' شور نہ کیا کریں۔ سنبھال کر اور احتیاط سے خرچ کریں۔ اللہ اسی روزی میں برکت ڈال دے گا۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ مزمل پڑھیں اور دعا کریں۔ مدت 41 دن ہے۔

☆☆......☆☆

# ہائیڈ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے
گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

## حقیقت

انسان کی خواہش سے اللہ کو دلچسپی نہیں وہ اس کی اپنی تقدیر اپنی مرضی سے بناتا ہے۔ اُسے کیا ملنا ہے اور کیا نہیں ملنا اس کا فیصلہ وہ خود کرتا ہے۔ جو چیز آپ کو ملنی ہے آپ اس کی خواہش کریں یا نہ کریں وہ آپ ہی کی ہے۔ وہ کسی دوسرے کے پاس نہیں جائے گی مگر جو چیز آپ کو نہیں ملنی وہ کسی کے پاس بھی چلی جائے مگر آپ کے پاس نہیں آئے گی۔

ہم ہمیشہ غلط فیصلے اور غلط کام کرتے ہیں اور پھر الزام قسمت کو دیتے ہیں۔ اگر انسان اپنی قسمت بدلنے پر قادر نہ ہوتا تو اللہ کبھی دعا کے راستے نہ کھولتا۔ یہ راستہ طویل اور تھکا دینے والا ضرور ہے مگر اس پر چلنے والا کبھی راستوں میں نہیں بھٹکتا۔

کاوش: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ، لاہور

## بکھرے موتی

1) جس پر حضور نبی کریم ﷺ مہربان ہوں اُسے اللہ کا قرب ملتا ہے اور جس پر اللہ مہربان ہو اُسے حضور نبی کریم ﷺ کا قرب ملتا ہے۔

2) لوگوں کے لیے رحمت بن جاؤ رحمتہ اللعالمین حضرت محمد ﷺ کی رحمت کا سایہ ملے گا۔

3) صرف بزرگوں کی یاد منانے سے بزرگوں کا فیض نہیں ملتا، بزرگوں کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے سے بات بنتی ہے۔

(واصف علی واصف کی کتاب 'بات سے بات'
سے ممتاز احمد۔ سرگودھا کا انتخاب

## شفقت بھری پناہ

اجنبیوں کی طرح رہتی ہوں
میں اپنے ہی گھر میں
کہ مجھے تم بن ڈر لگتا ہے بابا
مجھ کو بتلاؤ
مجھے کب تک ڈرتے رہنا ہے
مجھے کب تک یہ دکھ سہنا ہے
شاید عمر بھر، تیری جدائی میں
مجھے رونا ہے
کوئی تدبیر کرواور پلٹ آؤ،
اپنے سائے تلے
مجھے شفقت بھری پناہ دو،
یقین کرو بابا
مجھے تم بن ڈر لگتا ہے
بہت ڈر لگتا ہے

شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ گجرات

## قیلولہ سے حافظہ تیز ہوتا ہے

سائنسدانوں سے پتا چلا ہے کہ تین سے پانچ سال کی عمر کے بچوں میں لنچ کے بعد ایک گھنٹے کی نیند ان کی ذہنی قوت کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ تحقیق دانوں نے اپنی مختصر رپورٹ میں کہا ہے کہ بچوں کے قیلولہ کے فوائد اگلے دن تک جاری رہتے ہیں۔ دن کو ایک گھنٹے کی نیند ابتدائی تعلیم اور یادداشت کو مستحکم کرنے میں انتہائی اہم ہے۔ تحقیق دانوں کے مطابق قیلولہ کرنے والے بچوں نے شکل و جسم کو پرکھنے کے ٹیسٹ میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

مرسلہ: راشد لطیف۔ صبرے والا

## مشورہ

لڑکی ڈاکٹر سے: ''میری اسکن بہت نرم و ملائم اور چمکدار ہے اور میرا رنگ بھی بہت گورا ہے۔ میں رات کو کیا لگا کر سویا کروں؟؟؟''

ڈاکٹر: ''صرف کنڈی۔''

مرسلہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ

## چار قدم آگے

ایک لڑکی کی شادی ہوگئی، شادی کے پانچ دن بعد اس نے اپنی ماں کو فون کر کے کہا۔ ''امی آج میری اُن سے لڑائی ہوگئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا! شادی کے بعد میاں بیوی کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔'' امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے امی لیکن لاش کا کیا کروں؟'' لڑکی نے لاپروائی سے جواب دیا۔

مرسلہ: شاہانہ احمد خان۔ کراچی

## عجیب لگتا ہے

وہ میرا تھا بتانا عجیب لگتا ہے
جو زندگی میں ہمارا کبھی نہ ہو سکا
اب اس کا خواب میں آنا عجیب لگتا ہے
بڑے خلوص سے اس نے دعوت تو بھیجی ہے
پر اس کی بزم میں جانا عجیب لگتا ہے
تھا جس کا ہاتھ کبھی ہمارے ہاتھوں میں
اب اس سے ہاتھ ملانا عجیب لگتا ہے

شاعر: ایم منظور اکبر تبسم۔ جھنگ

## افسانچہ

میں نے اس کی آنکھوں میں تنہائیوں کے عذاب پڑھے تھے۔ وہ بھی تو مجھ جیسا تنہا ہی تھا۔ اس کا دکھ میں سمجھ سکتی تھی۔ اس کی تنہائیوں کو میں دور کرنا چاہتی تھی۔

آج بھی سورج اسی معمول کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی۔ اب مجھے جانا تھا۔ میں نے اپنا عبایا اور اسکارف اوڑھا اور کندھے پر ہینڈ بیگ لٹکائے تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی کہ اچانک...... ایک تیز رفتار گاڑی میرے بالکل سامنے آ کر رکی۔ بریک چرچرانے پر میں سہم گئی تھی۔ میں ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی مگر مجھے جانا تھا آج بس...... اور آخر میں نے پرندہ مارکیٹ میں جا کر سانس لیا۔ مجھے اپنے تنہا چوزے کے لیے ایک چوزہ خریدنا تھا آج۔ اور میں کامیاب ہو چکی تھی۔

زود قلم: عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

## سوا سیر

چار طالب علموں نے پیپر کی تیاری نہیں کی تھی۔ انہوں نے منصوبہ بنایا۔ وہ پرنسپل کے پاس گئے اور کہنے لگے۔ ''سر ہم شادی میں گئے تھے کہ راستے میں کار کا ٹائر پھٹ گیا۔ ہم ساری رات دھکا لگاتے رہے، اس لیے پڑھ نہیں سکے۔''

پرنسپل نے ان کی بات مان لی اور ٹیسٹ کی تیاری کے لیے انہیں چار دن کا ٹائم دیا۔

چار دن کے بعد انہیں چار مختلف کمروں میں بٹھایا اور صرف ایک سوال دیا۔

سوال: ''کون سا ٹائر پھٹا تھا؟''

1۔ سامنے دائیں والا۔
2۔ سامنے بائیں والا۔
3۔ پچھلا دائیں والا۔
4۔ پچھلا بائیں والا۔

(اگر ایک جیسا جواب دیا تو سب پاس ہو جاؤ گے)

مرسلہ: شازیہ رضوی۔ کراچی

## ہوشیاری

پاگل خانے میں ایک پاگل اکیلا تاش کھیل رہا تھا، جبکہ قریب بیٹھا دوسرا پاگل اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ بعد دوسرا پاگل بول اٹھا۔ ''ارے یہ کیا کر رہے ہو...... تم تو خود اپنے ساتھ بے ایمانی کر رہے ہو۔''

''شش......'' پہلے پاگل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''مجھے مت بتانا...... میں تو برسوں سے اپنے ساتھ بے ایمانی کر رہا ہوں لیکن مجھے آج تک پتا نہیں چلا۔''

''کمال ہے......!'' دوسرے پاگل نے حیرت سے کہا۔

''تمہیں پتا کیوں نہیں چلا؟''

''میں بہت ہوشیار ہوں نا...... میں خود کو پتا ہی نہیں چلنے دیتا۔'' پہلے پاگل نے فخر سے جواب دیا۔

مرسلہ: شائستہ جبیں۔ کوہاٹ

## معیار

جگو بدمعاش نے جنگل میں خفیہ بھٹی لگائی اور ٹھرا تیار کرنا شروع کر دیا۔ پہلی بار آزمائش کے طور پر اس نے ایک بوتل اپنے جاننے والے کو بھیجی اور دوسرے روز اس کی رپورٹ مانگی۔

''کیسا تھا ہمارا ٹھرا؟''

''ٹھرا تو اچھا تھا۔'' دیہاتی نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس اُسے پیتے ہوئے مجھے ذرا سی کھانسی آئی تو میری مونچھوں میں آگ لگ گئی۔''

مرسلہ: روبینہ شاہین۔ کراچی

## غزل

بچپن کے سبھی خواب سہانے لگتے ہیں
اپنوں کے وہ درد پرانے لگتے ہیں
تم بن میری ذات ادھوری لگتی ہے
گزری باتیں سب افسانے لگتے ہیں
خواب کی مانند یاد تمہیں تری جو باتیں
گزرے ہوئے سب سال، زمانے لگتے ہیں
تم بن ہے سنسان یہ نگری مدت سے
تنہائیوں میں زخم جلانے لگتے ہیں
اب بھی دل میں زندہ چاہت ہے تیری
حسن تمہیں کیوں اب بیگانے لگتے ہیں

شاعر: ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

## تعریف

ایک امیر اور غریب آدمی آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ امیر آدمی نے کہا۔ ''میرے پاس سو اونس سونا ہے تیس اونس تمہیں دے دوں تو کیا تم میری تعریف کرو گے۔؟''

غریب آدمی نے جواب دیا۔ ''اتنے کم سونے کے لیے میں تمہاری تعریف نہیں کر سکتا۔''

''آدھا سونا دے دوں تو......؟'' امیر آدمی نے جواب پوچھا۔

''تب ہماری حیثیت برابر ہو جائے گی، اس لیے میں تمہاری تعریف نہیں کروں گا۔'' غریب آدمی نے کہا۔

''اور اگر سارا سونا دے دوں تو......؟'' امیر آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سارا سونا میرے پاس آ گیا تو مجھے تمہاری تعریف کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' غریب آدمی نے شاہانہ انداز سے کہا۔

(چینی ادیب 'تو پین چون' کی تحریر سے اقتباس)

حسن انتخاب: حاسم وقاص۔ لاہور

## بیوی کے نام ڈرائیور کا پیغام

(شادی کی سالگرہ پر)

میری زندگی کی گاڑی دنیا کی سڑک پر دھکے کھاتے پھر رہی ہے۔ غم اور تنہائی کے کھڈوں سے اس کے ٹائر بیکار اور انجر پنجر ہل چکے ہیں۔ جب تم اس گاڑی میں لمبے روٹ کی سواری کی طرح سوار ہو گئیں تو تم نے اپنی محبت کے فواروں سے اس 'گاڑی' کی ایسی سروس کی کہ اسے 'ورکشاپ' لے جانے کی ضرورت نہ رہی اور یہ دنیا کی سڑک پر چوتھے گیئر میں دوڑنے لگی۔

اب اس کی ٹنکی خوشیوں سے فل ہے۔ روٹ پرمٹ ہمارے پاس ہے اس لیے کسی چالان کا کوئی ڈر نہیں۔ اللہ کرے ہمارے راستے میں غموں کی کوئی چیک پوسٹ نہ آئے، نہ کسی مصیبت سے ایکسیڈنٹ ہو اور نہ ہی محبت اور پیار کا پٹرول ختم ہو۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو صبر کا ریزرو اس گاڑی کو رکنے نہ دے۔ آمین۔

(خادم حسین مجاہد کی کتاب 'قلم آرائیاں' سے تحسین جونیجو۔ خیرپور ناتھن شاہ۔ کا انتخاب)

## گریبان

میں کون سی سرزمین پہ کھڑی ہوں؟ کہ جس سرزمین کی خاطر سر کٹے تھے، گھر لٹے تھے۔ میں ابھی تک ان ظالموں کے جنگل میں کھڑی ہوں، کہ جس زمین کی خاطر

ننھے بچے بن پانی بلک رہے تھے۔ میں ابھی تک ان ظالمو کے ظلم سہہ رہی ہوں۔ کہ جس زمین کی خاطر ننھے پھول، سمیت بوٹوں کے لحد میں پڑے اپنی ماں کے ہاتھوں بے نشان کیے گئے تھے۔

میں کس زمین پر کھڑی ہوں۔

کہ اس سے پہلے پھر کوئی بت خانہ آبسائے۔ تم اپنے اپنے بچوں، بہنوں، بیٹیوں کو بچالو۔ اپنے وطن کے ناموس کو پناہ دو۔ کہ ان کی خاطر اپنی اپنی جانیں قربان کر دو۔ کہ ان ہی کی خاطر قاسم نے داہر کو شکست دی تھی۔ تم اپنے بچوں، بہنوں اور بیٹیوں کو تو نہ لوٹو۔ تم اپنی رگوں سے نچڑے ہوئے لہو کی سرخی سے نا کھیلو کہ سرخ شعلے تم ہی کو اپنی لپیٹ میں نا لے لیں۔

قبل اس سے اپنی اپنی جانیں بچالو۔

گڈی آپا۔ لاہور کے زورِ قلم کا نتیجہ

## قطعہ

ہمارا ہے منشور لوگوں کی خدمت
بُرا لاکھ ہم کو کہے گو زمانہ
بجلی کا ہر وقت جاجا کے آنا
"لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ"

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

## تلاش

ایک دو سیٹوں والا جہاز قبرستان میں گر کر تباہ ہوگیا۔ انکوائری کے لیے ایک سکھ صاحب کو بھیجا گیا۔ انکوائری کے بعد سکھ صاحب کی رپورٹ کچھ یوں تھی۔ "500 سے زائد لاشیں نکال لی گئی ہیں۔ مزید لاشوں کی تلاش کے لیے کھدائی کا کام جاری ہے۔"

مرسلہ: محمد انس انور۔ اسلام آباد

## حقیقتیں

زندگی میں انسان کو کیسی کیسی حقیقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس عذاب سے گزر رہے ہوں۔ یہ حقیقتیں اتنی بھیانک اور خوفناک روپ میں بندے کے سامنے آتی ہیں اور وہ اپنی تمام فہم و فراست اور عقل و دانش کے باوجود ان کا سامنا نہیں کر پاتا اور اپنے ریزہ ریزہ وجود کی پامالی کا شکوہ سنانے کی حسرت لیے جان سے گزر جاتا ہے۔

رضوانہ کوثر۔ لاہور کی خیال آرائی

## موت کی سزا

سب سے پہلے قدیم مصریوں نے بلی کو پالتو بنایا۔ قدیم مصر میں بلی کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ زمانہ تقریباً سولہ سو سال قبل مسیح کا تھا۔ جب مصر میں بعض قسم کی بلیوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ انہیں ایک مخصوص قانون کے تحت تحفظ حاصل تھا۔ اگر ان مقدس اور عالی مرتبت بلیوں کو کوئی مار ڈالتا تھا تو اس کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم مصری بلیوں کو اپنے علاقے میں موجود گوداموں کو چوہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے سدھاتے تھے۔ اور وہ یہ کام نہایت اچھی طرح انجام دیتی تھیں۔ اس لیے قدیم مصری انہیں 'مقدس' سمجھ کر پوجتے تھے۔ اور بلیاں اُن کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔

مرسلہ: عنصر خان۔ پشاور

## محبت اِک کہانی

محبت میں ہمیں ہر پل
یہی احساس ہوتا ہے
مری سانسوں کے آنے میں
مری سانسوں کے جانے میں
کہیں کچھ بے کلی سی ہے
کہیں کچھ کچھ کمی سی ہے
بتاؤ تم مری جاناں!
کیا تم بھی سوچتی ہو یہ
محبت میں فقط جاناں
نہیں کچھ بھی یہ دل چاہتا
اِسے محبوب کی صورت
بس اپنے دل میں دِکھتی ہے
یہ دل، محبوب کا گھر ہے
یہ دل اُس کی امانت ہے
محبت میں ہمیں ہر پل
یہی احساس ہوتا ہے

شاعر: اشعر عتیق۔ کراچی




قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمائیے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں
نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ، لاہور

پیرو مرشد کوئی تعویذ تسلی دیجے
فقط اک بار ہی کہہ دیں کہ وہ لوٹ آئے گا

سلیمان شبیر۔ اکوال، تلہ گنگ، ضلع چکوال

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہے جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ جو آ ہی نہ سکوں

شاہد سلیم۔ حسن ابدال

مقدر بنانے والے میرا مقدر بھی بنا دینا
رات دن دعا ہے میرے محبوب سے ملا دینا
میرے دل میں حسرت ہے اس کے دیدار کی
اے خدا! میری یہ تمنا تُو پوری کرا دینا

ایم وکیل عامر جٹ۔ ساہیوال

تیرے ہوتے ہوئے بھی تنہائی ملی ہے
وفا کر کے بھی بے وفائی ملی ہے
جتنی دعا کی تجھے پانے کی
اس سے زیادہ تیری جدائی ملی ہے

عظمیٰ شکور۔ اسلام آباد

اگر ہم حسرتوں کی قبر میں ہی دفن ہو جائیں
تو یہ کتبوں پہ لکھ دینا محبت مر نہیں سکتی

مور شاہد حسین۔ قمبر شہداد کوٹ

تیرے نام سے روشن گلیاں ہیں میرے آنگن کی
تیرے نام سے روشن نام ہے اک بے نام کا

امجد علی۔ چیزل آباد

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

غلام رسول گل۔ جیکب آباد

پھر سے ابلیس نے شرارت کی
پھر کسی بے گناہ کا قتل ہوا
علم کے دیپ کیسے روشن ہوں
جابجا درس گاہ کا قتل ہوا

ظفر علی۔ کراچی

خود کو سمجھاؤں کہ دنیا کی خبر گیری کروں
اس محبت میں کوئی ایک مصیبت ہے مجھے

ارشاد گل پشاوری۔ بھیر کنڈ۔ مانسہرہ

یہ کیسے ممکن ہے کہ میں ہاتھ اٹھاؤں تیرا نام نہ لوں
تُو تو شامل ہے میری دعاؤں میں 'آمین' کی طرح

شازیہ گل۔ بھیر کنڈ۔ مانسہرہ

وہ مہکتی پلکوں کی اوٹ سے کوئی تارا چمکا تھا رات میں
میری بند مٹھی نہ کھولیں وہی کوہ نور ہے ہات میں
میں تمام تارے اٹھا اٹھا کے غریب لوگوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسماں کا نظام دیں میرے ہات میں

ارم خان۔ ڈی۔جی خان

کر پوری ہر سنت نبی ﷺ کی
بے پروا نہ بن اے اُمت نبی ﷺ کی

ممتاز احمد۔ سرگودھا

وفا کر کے دکھانا ہے، تمہیں اپنا بنانا ہے
ہر اک وعدہ نبھانا ہے، تمہیں اپنا بنانا ہے
یہاں کچھ لوگ ہیں جو ہم کو ملنے ہی نہیں دیتے
اب ان سے دور جانا ہے تمہیں اپنا بنانا ہے

سدرہ انور علی۔ جھنگ

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

یاسر وکی۔ دیپال پور

چل پڑا تو ہر قدم پر اک نیا ہی موڑ تھا
دیکھنے میں راستہ جو مجھ کو سیدھا سا لگا
اجنبی چہرے پہ تھی تحریر دکھ کی داستاں
اس لیے شاید مجھے وہ شخص اپنا سا لگا

نبیل جاوید۔ سرگودھا

وقت جب راستہ بنائے گا
سنگ کو آئینہ بنائے گا
ڈھلتا سورج ہی میرے سائے کو
میرے قد سے بڑا بنائے گا

اشعر عتیق، شاعر عتیق۔ کراچی

وقت چاہے برے سے برا کیوں نہ ہو
میں نے دیکھے ہیں کچھ لوگ ہنستے ہوئے

خوبصورت ہی لگتے ہیں عارف مجھے
چہرے خوشیوں سے جب ہوں دمکتے ہوئے

اُمِ مناہل۔ ایبٹ آباد

میرے پھول سے بچے جا کر پھر باغوں میں کھیلیں
کاش کراچی کی وہ رونق پھر واپس آجائے

محمد عزیز جتوئی۔ کراچی

دنیا نے نرخ اب تو وفا کے بڑھا دیے
صد حیف ہم کو کوئی خزانہ نہ مل سکا
ملنا تو چاہتا تھا ہمیں روز ہی مگر
لیکن عدو کے ڈر سے روزانہ نہ مل سکا

شاہین شہزاد۔ عارف والا

کیسے تیری چاہت کو جدا دل سے کروں میں
ساقی! لا صراحی کہ اک جام بھروں میں
آؤں گی نا ہرگز اب دھوکے میں تمہارے
ممکن ہی نہیں ریت کے ٹیلے پہ چڑھوں میں

منیبہ منیر۔ اوکاڑہ

وطن ہو شہر ہو یا گھر ہو تیرا
وہاں مت جا جہاں عزت نہیں ہے
ہمیشہ کے لیے حق کو مٹا دے
کسی ظالم میں بھی طاقت نہیں ہے

شمائلہ اختر۔ لاہور

بہت کٹھن سہی سچائی کا سفر لیکن
جو چل پڑو تو کہیں بھی قیام مت کرنا

☆☆......☆☆

میرا یہ پسندیدہ شعر "سچی کہانیاں" کی نذر ہے

نام:

پتا:

